خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2020

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

کہنی سنی — مدیر — 10
کرن کرن روشنی — ادارہ — 11
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 30

آپ سے کیا پردہ

اندیشۂ شہر کے بغیر — انشاجی — 16

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 238

مجھ سے ملئے

باتیں لیلیٰ واسطی سے — شاہین رشید — 18

انٹرویو

اعتصام الحق سے ملاقات — شاہین رشید — 24
خامشی کو زباں ملے — ادارہ — 242

ناول

تتلی جیسا پیار — راحت جبیں — 205
رنگ رنگیلے — عفت سحر — 36
حرام — نمرہ احمد — 171

مکمل ناول

محبت غیر مشروط — نازیہ زاہی — 104
منتظر — ام طیفور — 136

ناولٹ

اے دلِ بے خبر — شازیہ جمال طارق — 72
کنگن — حمیرا شفیع — 219

افسانے

منزلوں کے سائے — قرۃ العین سکندر — 56
لڑکے کی ماں — ہاجرہ ریحان — 64
راہِ راست — فائزہ مرتضیٰ — 95
سزا — شمیم اراکی — 128

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فورم ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

رنگا رنگ پھول

رنگا رنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 235
خبریں وبریں — واصفہ سہیل — 240

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 244

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — گل مردان — 250
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 252

نظمیں غزلیں

نظم — اسد محمد خان — 234
غزل — فیضان سروری — 234
غزل — احمد فراز — 233
غزل — جگر رادآبادی — 233

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 254

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 257

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی ہے کہ ہر شخص ہی ایک مستقل یاس کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یادِ ماضی سے معمور، حال سے سرگرداں اور مستقبل سے مایوس۔

یوں تو ہمارے مفکر اور شاعر زندگی کا زیادہ تر ایک ہی پہلو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک جبرِ مسلسل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کے خیال میں غم ایک دائمی حقیقت اور خوشی ایک ناپائیدار عارضی کیفیت کا نام ہے۔

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ دنیا میں دائمی خوشی کا حصول ناممکن ہے۔ ایام گردش میں رہتے ہیں اور تقدیریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ زندگی میں ٹھہراؤ کہاں۔ جو آج ہو رہا ہے۔ وہ کل نہیں تھا۔ اور آنے والے کل میں بھی نہیں ہوگا۔ زندگی رکتی نہیں۔ آگے بڑھتی جاتی ہے اور ہم اس بہاؤ میں تنکے کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے جس طرح دائمی خوشی کا حصول ناممکن ہے اسی طرح غم کی کیفیت بھی دائمی نہیں ہوتی۔ انسان مستقل ایک ہی کیفیت میں نہیں رہ سکتا۔ وہ مسلسل ایک ہی کیفیت کے تسلسل سے اکتا جاتا ہے۔ وہ اس کیفیت سے باہر نکلنا چاہتا ہے، خواہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی، وہ حالات سے فرار چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ خوابوں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ اپنی من پسند دنیا تخلیق کر لیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں افلاس اور جہالت کا راج نہ ہو۔

خواب وقتی سہارا ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی اور سچی خوشی کا ایک ہی راز ہے۔ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر دوسروں کے لیے کچھ کرنا۔ ان کی زندگیوں کو آسان بنانے کی کوشش کرنا۔ اگرچہ کہ یہ قدرے مشکل راستہ ہے۔

آپ جہاں ہیں، جس مقام پر ہیں، جس حیثیت میں ہیں، یہ نہ سوچیں کہ آپ کو کیا ملا، کیا نہیں ملا۔ آپ صرف یہ سوچیں کہ آپ دوسروں کو کیا دے سکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تو ایک مسکراہٹ ہی سہی۔ یقین کیجیے آپ کو ایسا سکونِ قلب نصیب ہوگا جو آپ کی روح کو سرشار کر دے گا۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین) کی برسی،

مسافرانِ عدم لوٹ کر نہیں آتے۔ زندہ دل، خوش مزاج محمود بابر فیصل ایک سیماب صفت شخصیت تھے۔ ان کے کام میں ایک عجلت تھی۔ اخبار نکالنے کا خیال آیا۔ ایک ہفتے بعد اخبار تیار میز پر ہے۔ کرن شام منعقد کرنے کا۔ سوچا، جلدی جلدی مصنفین کو فون کیے اور شام کو ہم شان دار محفل میں شرکت کر رہے تھے۔ وہ ہم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ بڑے ہونے کے ناتے ہمارے دلوں میں ان کے لیے احترام تو تھا لیکن وہ روایتی عمر تھا جو گھر میں بڑوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی خوش طبعی اور باغ و بہار طبیعت تھی۔ محفل میں ہوتے وہاں مسکراہٹ خود اپنی جگہ بنا لیتی تھی۔ کبھی ہو یادِ فسردہ ان کے دم سے رونق تھی۔ خوشیاں بانٹنے والے بھلائے نہیں جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی یادیں آج بھی تازہ ہیں۔

25 اکتوبر کو ان کی برسی ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- نائلہ رفاق کا مکمل ناول۔ محبت غیر مشروط،
- اُمِ لبنیٰ کا مکمل ناول۔ منھ زور،
- شازیہ جمال طارق اور حمیرا شفیع کے ناولٹ،
- راحت جبیں، نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کے ناول،
- قرۃ العین سکندر، ہاجرہ ریحان، شازیہ مرتضیٰ اور شمیم رانی کے افسانے،
- ارطغرل کے صداکار اعتصام الحق سے ملاقات،
- معروف فنکارہ لیلیٰ واسطی سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، نفسیاتی اور دلچسپ الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

امید اور اجل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ ابن آدم ہے اور یہ اس کی اجل ہے، گدی کے قریب۔'' پھر آگے کو ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔'' اور وہاں تک اس کی امیدیں ہیں۔'' (ترمذی)

فائدہ: انسان کی امیدوں کے مقابلے میں اس کی اجل بہت قریب ہے، لہٰذا اس کے استقبال کی تیاری ضروری ہے۔ دنیا میں مشغول ہو کر آخرت سے غفلت انتہائی نادانی ہے۔

معمولی گناہ

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

''اے عائشہ! معمولی سمجھے جانے والے گناہوں سے بچنا، اللہ کے ہاں ان کا بھی مواخذہ ہوگا۔'' (احمد)

فوائد و مسائل:

1 بعض گناہ عام لوگوں کی نظر میں معمولی ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے ہوتے ہیں مثلاً گالی گلوچ ہنسی مذاق میں جھوٹ بولنا، مرد کا اپنی شلوار، تہ بند اور پاجامہ، وغیرہ سے ٹخنوں کو چھپا لینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اپنا تہ بند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھنا، اگر یہ نہ ہو سکے تو ٹخنوں تک ضرور اونچا رکھنا اور تہ بند کو (ٹخنوں سے نیچے تک) لٹکانے سے بچنا کیوں کہ یہ تکبر ہے۔'' (سنن ابی داؤد..... حدیث ۴۰۸۴)

2۔ جو گناہ معاشرے میں عام ہو جائے، عوام کی نظر میں وہ گناہ نہیں رہتا، خواہ کبیرہ ہی ہو۔ علماء کو چاہیے کہ ایسے گناہوں سے خاص طور پر منع کریں اور ان کے بارے میں اسلامی احکام کی وضاحت کریں۔

3۔ جو گناہ واقعتاً صغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی احتیاط ضروری ہے کیونکہ صغیرہ گناہ بکثرت کرنے

سے مجموعی طور پر گناہوں کی مقدار بہت زیادہ ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے انسان سزا کا مستحق ہوجاتا ہے۔اس کے علاوہ صغیرہ گناہوں کی پروا نہ کرنے سے کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کی جرات پیدا ہوجاتی ہے،اس لیے ان سے بھی اجتناب ہی بہتر ہے۔

توبہ میں جلدی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب مومن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔اگر وہ توبہ کرلے، باز آجائے اور (اللہ سے) بخشش کی درخواست کرے تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے۔اگر مزید گناہ کرے تو سیاہی کا نقطہ زیادہ ہوجاتا ہے (حتی کہ ہوتے ہوتے دل بالکل سیاہ ہوجاتا ہے۔) یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (اس فرمان میں) کیا ہے۔

ترجمہ: ''یوں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ پڑ گیا ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔گناہ ہوجائے تو جلد سے جلد توبہ کرنی چاہیے تاکہ دل پاک صاف ہوجائے۔

2۔گناہوں کی وجہ سے دل سیاہ ہوجانے کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت ختم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

3۔روحانی بیماریوں کا علاج اللہ کی یاد، قرآن کی تلاوت، توبہ و استغفار اور موت کی یاد ہے۔

نیکیاں غبار میں تبدیل

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عزوجل ان (نیکیوں) کو بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کردے گا۔'' (طبرانی)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''اللہ کے رسول ان کی صفات بیان فرمادیجیے۔ان (کی خرابیوں) کو ہمارے لیے واضح کردیجیے۔ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہوجائیں اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔'' آپ نے فرمایا۔

''وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہاری جنس سے ہیں اور رات کی عبادت کا حصہ حاصل کرتے ہیں جس طرح تم کرتے ہو۔لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں جب تنہائی میں اللہ کے حرام کردہ گناہوں کا موقع ملتا ہے تو ان کا ارتکاب کرلیتے ہیں۔''

فوائد و مسائل:

1 بہت سے گناہ نیکیوں کو ضائع کردیتے ہیں۔

2 لوگوں کے سامنے نیک بنے رہنا اور تنہائی میں گناہ کا ارتکاب بے تکلف کرلینا، یہ بھی ایک قسم کی منافقت ہے جس کی وجہ سے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں۔

3 تہجد پڑھنا بڑی نیکی ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری تنہائی میں تقویٰ پر قائم رہنا ہے۔

4 اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی گناہ سے باز رہے جب اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔

5 نیکیوں کو غبار میں تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول نہیں فرمائے گا، اس لیے وہ بے وزن ہوجائیں گی اگرچہ دیکھنے میں وہ پہاڑوں جیسی عظیم اور سفید ہوں۔

تقویٰ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

''کون سا عمل سب سے زیادہ (لوگوں کو) جنت میں داخل کرے گا؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تقویٰ اور خوش اخلاقی۔''

سوال کیا گیا ''کون سی چیز سب سے زیادہ (لوگوں کو) جہنم میں لے جائے گی؟''
فرمایا ''دو کھوکھلی چیزیں منہ اور شرم گاہ۔''

فوائد و مسائل:

1۔ تقویٰ اللہ سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کا نام ہے اور خوش اخلاقی انسانوں پر ظلم و زیادتی کرنے سے اور برا سلوک کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اس طرح تقویٰ سے حقوق اللہ صحیح ادا ہوتے ہیں اور خوش اخلاقی سے حقوق العباد۔ ان دونوں کی ادائیگی یقیناً جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

2۔ منہ کے گناہوں میں حرام رزق کھانا بھی ہے جس کی وجہ سے نیکیاں قبول نہیں ہوتیں اور زبان کے گناہ بھی مثلاً جھوٹ، غیبت، گالی گلوچ وغیرہ جن سے لوگوں میں فساد پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے گناہ بڑے گناہ ہیں۔

3۔ شرم گاہ کا گناہ زنا ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور معاشرے میں بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ زبان کے گناہ (غیر محرم سے ناجائز بات چیت وغیرہ) آنکھ کے گناہ (نامحرم کو دیکھنا) ہاتھ کے گناہ (نامحرم کو چھونا، یا خط وغیرہ لکھنا اور فون کرنا) پاؤں کے گناہ (بدکاری کے لیے چل کے جانا) وغیرہ سب اسی بڑے گناہ کے لیے کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

4۔ منہ اور شرم گاہ کے گناہوں سے بچنے والے کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسرے گناہوں سے بھی بچ جائے گا اور جنت میں چلا جائے گا۔

توبہ کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی اپنی گم شدہ سواری پا کر خوش ہوتا ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ گناہ سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ بندے کو جب احساس ہو جائے کہ اس نے گناہ کیا ہے، خواہ وہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، براہ راست اللہ کے آگے توبہ کرے، یعنی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے آئندہ کے لیے یہ عزم اور وعدہ کرے کہ وہ اس گناہ سے بچ کر رہے گا۔

3۔ توبہ اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اس میں کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہیں، البتہ کسی نیک عالم آدمی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے نیکی کا عزم کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پہلے انسان اس عالم کی شرم سے گناہ سے بچتا ہے، پھر براہ راست اللہ کی شرم سے گناہ سے بچنے کی توفیق مل جاتی ہے، تاہم یہ ضروری نہیں۔ تنہائی میں توبہ کر کے اللہ سے استقامت کی دعا کرے تو کافی ہے۔

4۔ جس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس کے ارتکاب کی صورت میں وہ حق ادا کرنا یا صاحب حق سے معاف کروانا ضروری ہے ورنہ توبہ مکمل نہیں ہوگی۔

توبہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں، پھر توبہ کرو تو (پھر بھی اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔)''

فوائد و مسائل:

1۔ یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کر لے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں، وہ معاف نہیں ہوں گے، البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

ندامت

حضرت عبداللہ بن معقل رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں اپنے والد (حضرت معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے انہیں سنا، وہ کہہ رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ندامت توبہ ہے۔''

میرے والد صاحب نے ان سے کہا ''کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ''ندامت توبہ ہے؟''

انہوں نے کہا ''ہاں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ ندامت توبہ کا اہم جزو ہے۔

2۔ عالی سند کی طلب مستحسن ہے۔

3۔ اگر کسی چیز میں شک ہو تو استاد سے دریافت کر لینا احترام کے منافی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بے شک اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا رہتا ہے جب تک نزع کا عالم طاری نہ ہو۔'' (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ نزع سے مراد روح قبض کرنے کا عمل شروع ہونا ہے۔

2۔ جب موت کے فرشتے ظاہر ہو جاتے ہیں تو عالم آخرت سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس لیے توبہ کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

3۔ بندے کو چاہیے کہ جلد از جلد توبہ کر لے، معلوم نہیں کب آخری وقت آ جائے۔

گناہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ اس نے ایک (اجنبی) عورت کا بوسہ لے لیا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس گناہ کا کفارہ دریافت کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔

ترجمہ: ''دن کے کناروں میں اور رات کی گھڑیوں میں نماز قائم کیجیے۔ بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے۔''

اس آدمی نے کہا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ (رعایت) میرے (ہی) لیے ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''یہ میری امت کے ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ بعض گناہ دوسرے گناہوں سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا گناہ ہوگا اس کی معافی کے لیے اتنی بڑی نیکی کی ضرورت ہے۔

2۔ وہ شخص اپنے گناہ پر نادم تھا اور اس کی معافی کے لیے ہر کفارہ ادا کرنے کو تیار تھا، اس وجہ سے وہ گناہ نماز کی برکت سے معاف ہو گیا۔ جو شخص نادم نہ ہو، گناہ کو معمولی سمجھے، اس کا چھوٹا گناہ بھی بڑا ہو جاتا ہے۔

3۔ آیت کی شان نزول سے اس کا مطلب اور مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت میں مذکورہ حکم امت کے سب افراد کے لیے ہوتا ہے۔

4 گناہ ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی کرنی چاہیے، مثلاً نفل نماز پڑھ کر گناہ کی معافی کی دعا کرے، یا صدقہ خیرات کرے یا کوئی اور نیکی کرے جو اس گناہ کی معافی سے مناسبت رکھتی ہو، مثلاً ذکر اذکار، تلاوت اور نفلی روزہ وغیرہ۔

اللہ کا خوف

امام زہری رحمتہ اللہ نے (اپنے شاگرد معمر

سے) فرمایا ''کیا میں تجھے دو عجیب حدیثیں نہ سناؤں؟''

(پہلی حدیث یہ ہے جو) حمید بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک آدمی نے اپنی جان پر زیادتی کی (اور زندگی میں بہت گناہ کیے) جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا۔ جب میں مرجاؤں تو مجھے جلا دینا، پھر مجھے (میری لاش کو) پیس کر مجھے (میری راکھ کو) ہوا میں اڑا دینا اور سمندر میں بہا دینا۔ قسم ہے اللہ کی! اگر اللہ نے مجھے پکڑ لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو کسی کو نہیں دیا ہوگا۔''

ان بیٹوں نے ایسے ہی کیا۔

اللہ نے زمین سے کہا۔ ''جو تو نے لے لیا ہے حاضر کردے (ایسے ہی سمندر سے بھی اس کی راکھ کے ذرات جمع کر کے اسے زندہ کر دیا) اچانک وہ (زندہ سلامت) کھڑا تھا۔

اللہ نے اس سے فرمایا ''تو نے جو کام کیا ہے، اس پر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا۔''

اس نے کہا۔ ''میرے رب! تیرے خوف نے۔''

''اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے اسے معاف کر دیا۔''

جانوروں سے سلوک

امام زہری رحمتہ اللہ نے (دوسری حدیث بین کرتے ہوئے) فرمایا اور مجھے حمید بن عبدالرحمٰن نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں چلی گئی۔ اس نے اسے باندھ دیا تھا، نہ اسے کچھ کھانے کو دیا، نہ اسے چھوڑا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی حتیٰ کہ وہ (بھوک سے) مرگئی۔''

امام زہری رحمتہ اللہ نے فرمایا (میں نے یہ دو حدیثیں اس لیے سنائی ہیں) تاکہ کوئی (اپنی نیکیوں پر) بھروسا نہ کرے اور کوئی (اللہ کی رحمت سے) مایوس نہ ہو۔

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کو اللہ کی رحمت کی امید کے ساتھ ساتھ اللہ کے عذاب سے خوف بھی رکھنا چاہیے۔

2۔ محدثین کی فقاہت صرف اختلافی فروعی مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ ایمان، اخلاق اور عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

3۔ اپنی لاش جلانے اور اس کی راکھ اڑانے کی وصیت کرنے کی وجہ موت کے قریب خشیت کی کیفیت کا غلبہ تھی، اس لیے اس کی یہ غلطی بھی معاف ہوگئی کہ اس نے نامناسب وصیت کی۔

4۔ اللہ تعالیٰ اس کے جسم کو زندہ کیے بغیر روح سے بھی سوال کر سکتا تھا لیکن اس کو اللہ نے اپنی قدرت اور سطوت کا مشاہدہ کروا دیا۔

5۔ قبر کے عذاب اور نعمت سے مراد وہ تمام حالات ہیں جو موت کے بعد قیامت تک پیش آئیں گے۔ یہ حالات ہر شخص کو پیش آتے ہیں، خواہ اسے دفن کیا جائے یا اسے جنگلی جانور یا مچھلیاں کھا جائیں یا اس کو خاک سیاہ کر کے اس کے ذرے بکھیر دیے جائیں یا اس کی راکھ کو کسی برتن میں محفوظ کر لیا جائے یا اس کی لاش محفوظ ہو جسے لوگ دیکھ رہے ہوں۔

6۔ عذاب قبر کا تعلق عالم غیب سے ہے، اس لیے زندہ انسان اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

7۔ کسی بھی جان دار چیز پر ظلم کرنا بہت بڑا گناہ ہے، خاص طور پر ایسا ظلم جس سے جان دار ایک ہی بار مر جانے کے بجائے تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مرے۔

8۔ پالتو جانوروں کی ضروریات کا خیال رکھنا فرض ہے بلکہ ایسے جانور جو کسی کے پالتو نہیں، ان پر رحم کرنے سے بھی اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے، جیسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے گناہ گار انسان کی مغفرت ہوگئی تھی۔

☆☆

ارتدیشہ شہر کے بغیر دلا ہونے کا

انشا جی

''روکھی پھیکی کھا کے ٹھنڈا پانی پی۔'' بھگت کبیر کے اس اپدیش پر ہمارا عمل کچھ تو عادتاً ہے، کچھ ضرورتاً۔'' لیکن کل ہم نے رئیس گھرانے کی ایک خاتون کو سوکھے ٹکڑے چباتے، آہ سرد بھرتے اور ٹھنڈا پانی پیتے دیکھا تو بہت متاثر ہوئے۔

''ہم آپ کی خاکساری سے بہت متاثر ہوئے۔ مانگیے کیا انعام مانگتی ہیں۔''

بولیں۔ ''اس معاملے میں کچھ دخل انکسار کو نہیں ہے۔ مجھے کبیر الدین اسپیشلسٹ نے یہ بتایا ہے کہ آپ بالکل ہی بارہ من کی دھوبن نہیں بننا چاہتیں اور غبارے کی طرح پھٹنا بھی پسند نہیں کرتیں تو ڈائٹنگ کیجیے۔ ہاتھ روک کر کھائیے۔ کم کھائیے، سادہ کھائیے۔ بلکہ ہو سکے تو کچھ نہ کھائیے۔ ہاں ہوا کی ممانعت نہیں۔ وہ جتنی جی چاہے کھائیے۔''

ہم نے کہا۔ ''اور کھانوں کے بارے میں تو ڈاکٹر صاحب کا مشورہ صائب ہے لیکن ہوا کی بھی احتیاط رکھیے۔ زیادہ ہوا کھانے سے ریاح کا اندیشہ ہے۔

کھاتے پیتے گھرانے کی جس خاتون کو بھی دیکھیے، اس غم میں دبلی ہوئی جا رہی ہے کہ اس پر مٹاپا دن بہ دن چڑھ رہا ہے۔ اصل میں دبلا پا بھی فیشن ہو گیا ہے حالانکہ کسی خاتون کا ایسا دبلا ہونا بھی کیا کہ یہ معلوم ہو، قدرت نے فرش زمین پر عمود گرا رکھا ہے یا بانس ہے جس پر کپڑے ٹنگے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں کہ آدمی کھا کر گول دائرہ ہی ہو جائے یا مثلث دکھائی دے جس کے نیچے دو پائے لگے ہوں۔ بس کھڑی مستطیل کی سی صورت ہونی چاہیے کہ جیومیٹری کی ساری شکلوں میں ہمیں یہی پسند ہے۔ رقبہ نکالنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

کچھ قصور اس دبلاپے کی تحریک میں حکومت کا بھی ہے جس نے بچت کرو، بچت کرو کی مہم چلا رکھی ہے۔

خواتین حبّ الوطنی کے جذبے سے مجبور نہ صرف تھوڑا کھاتی ہیں بلکہ تھوڑا پہنتی بھی ہیں تاکہ فالتو کپڑا بیرون ملک بھیج کر زرمبادلہ کمایا جا سکے۔

ابھی کل ہی ایک محترمہ سے ہم نے کہا کہ ''یہ نیا فیشن کب سے نکلا۔ شلوار کے ساتھ بلاؤز پہننے کا، یہ تو ساڑھی کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔''

ناخوش ہو کر بولیں۔ ''یہ بلاؤز نہیں ہے صاحب! قمیص ہے۔''

شلوار کا بھی بقول ہمارے ایک دوست کے ایسا پتلا حال ہوا ہے کہ پہلے چار گز میں ایک شلوار بنتی تھی، اب ایک گز میں چار شلواریں بنتی ہیں۔ کچھ کپڑا پھر بھی بچ جاتا ہے، اس کا ازار بندی لیجیے یا دوپٹہ بنا کر اوڑھ لیجیے۔

تھوڑا کھانے اور تھوڑا پہننے کے علاوہ بھی خواتین کئی طرح کی بچتیں کرتی ہیں جس سے اس الزام کی تردید ہو جاتی ہے کہ عورتیں کفایت شعار نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر اپنی عمر تک گھٹا کر بتاتی ہیں۔ آج کل کے زمانے میں جب کہ ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بتانے کا رواج ہے۔ عورتوں میں اتنا انکسار قابل تعریف ہے۔ البتہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے حتیٰ کہ انکسار اور عمر گھٹانے کی بھی، ایک صاحبہ کو ہم جانتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت اٹھارہ بیس برس کی تھیں۔ پچھلے دنوں پھر ان کی ایک تحریر چھپی جو خود نوشت حالات پر مشتمل تھی، اس میں بھی اٹھارہ بیس برس ہی لکھا پایا۔ ہم نے ایک محفل میں ان سے کہا کہ.....

''ہمیں تو آپ کی ان تحریروں میں زیادہ مزا آتا ہے جو آپ نے اپنی پیدائش سے پہلے لکھی تھیں۔''

بولیں۔ ''کیا مطلب؟''

ہم نے کہا۔ ''یہی ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء کی بات کر رہے ہیں۔''

اس پر بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی عمر میں دس سال بڑھائے۔ دس پھر بھی اپنے پاس رکھ لیے۔

ہماری فلمی ایکٹرسیں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ ان کی عمر ناروا طور پر بڑھنے نہ پائے۔ ایک

صاحبہ ہمارے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہیں۔ بیس برس کی عمر تک تو وہ اور ہم، ہم عمر رہے۔ اس کے بعد ہم اکیس سال کے ہوگئے تو وہ انیس سال کی ہوگئیں۔ ہم بائیس کے ہوئے وہ اٹھارہ کی ہوگئیں۔ بعد میں کیا ہوا ہمیں معلوم نہیں کیونکہ اب ایک مدت سے انہیں نہیں دیکھا۔ ہاں فلم میں ضرور دیکھا تھا۔ جس میں وہ ایک بے بی کا کردار کرتی، لولی پاپ چاٹتی، کدکڑے لگاتی دکھائی دی تھیں۔

پچھلی بار ایران کے سفر میں ہمارے ہمراہ فیروز سنز کے ڈاکٹر وحید بھی تھے۔ سوا ناباتھ ہم نے وہاں پہلی بار دیکھا جس میں پہلے آپ کو گرم کمرے میں بٹھا کر ابالتے ہیں۔ درجہ حرارت، درجہ جوش سے بھی زیادہ کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو فوراً بھاگ کر برفانی پانی میں چھلانگ لگانی ہوتی ہے۔ ہم نے تو ایک بار کیا اور اس کے بعد درازی عمر کے لیے دعا کی۔ ڈاکٹر وحید دو تین بار نہائے اور کہنے لگے۔

"ہر غوطے کے بعد میں خود کو بقدر دس سال جوان تر محسوس کرتا ہوں۔"

وہ پھر تیار ہو رہے تھے کہ ہم نے روک لیا اور کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! دو غوطے آپ نے اور لگائے تو غوں غاں کرتے نکلیں گے۔ ہمارے پاس تو آپ کے لائق نہ ب ہے، نہ چڈی ہے، نہ گراپ واٹر کا ذخیرہ ہے۔" بڑی مشکل سے مانے۔

☆☆☆

پاکستان ٹیلی وژن والوں نے اشتہارات کے لیے بعض قاعدے بڑے سخت رکھے ہیں۔ اگر آپ سگریٹ کے اشتہار میں کسی خاتون کو سگریٹ پیتے اور دھواں اڑاتے دکھانا چاہتے ہیں تو اس خاتون کی عمر اکیس برس سے کسی صورت کم نہ ہونی چاہیے۔

سگریٹ کی ایک اشتہاری فلم کے لیے انٹرویو لینے والوں میں ہم بھی تھے، امیدواریں تو بہت آئیں، لیکن جب اعلان ہوا کہ جو خاتون اکیس برس سے زیادہ کی ہیں، وہ آگے آجائیں۔ تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں، بعض تو پھٹ ہی پڑیں کہ "نوج ہم کیوں ہوں اکیس برس کی، اکیس برس کے ہوں ہمارے دشمن"، بعض تو کڑیاں اور کھجنے نکال کر ان سے کھیلنے لگیں۔ ایک صاحبہ نے تو ہمیں ساطانی گواہ بھی بنالیا اور کہا۔

"آپ تو خود جانتے ہیں کہ میں پاکستان بننے سے پہلے دہلی میں آل انڈیا ریڈیو میں ہمیشہ بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ یہ تو پاکستان کے حالات اور نزلے نے چنڈا سفید کردیا ہے۔" غرض کہ فلم والوں کو کوئی صاحبہ اکیس برس سے کم کی نہ ملیں۔ ہم فارغ ہوکر باہر نکلے تو ان ہی میں سے ایک صاحبہ کو فٹ پاتھ پر کھڑے پایا۔ ہم نے کہا۔ "خیریت؟" بولیں۔

"میری لڑکی نے کہا تھا کہ واپسی میں مجھے اپنی کار میں لے لیں گی۔ کالج میں تو بارہ بجے ہی چھٹی ہوجاتی ہے، جانے کہاں رہ گئی ہوں گی۔"

ایک زمانہ تھا کہ اولاد اور والدین کی عمر میں اچھا خاصا فرق ہوا کرتا تھا۔ بالعموم زیادہ، ورنہ پندرہ سولہ برس کا تو ضرور۔ اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کوئی شے اپنے حال پر نہیں رہی۔ ایک محفل میں ایک والدہ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ اب کے ستمبر میں میری عمر بیس سال کی ہوجائے گی۔ اتنے میں ان کی صاحبزادی پہنچ گئیں۔ چھوٹوں کو بڑوں کی گفتگو میں بولنا نہیں چاہیے لیکن آج کل کی اولاد کا آپ حال جانتے ہیں، چلا کر بولیں۔ "امی! خدا کے لیے اپنی اور میری عمر میں نو ماہ کا فرق تو رکھ لیا کیجیے۔"

لیکن ذکر تو کھانے پینے بلکہ نہ کھانے پینے کا تھا، اس سے وزن ضرور گھٹ جاتا ہے لیکن تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اسی خیال سے ہم نے بلا درد وزن گھٹانے کی گولیاں ایجاد کی ہیں کہ ایک گولی کھائیے، پانچ پونڈ وزن گھٹائیے۔ دو کھائیے دس پونڈ وزن کم ہوجائے۔ تین گولیاں اکٹھی کھانے والے کے ساتھ خاص رعایت، یعنی آپ پندرہ پونڈ کے بجائے سترہ پونڈ گھٹا سکتے ہیں جن صاحب یا صاحبہ کو ضرورت ہو، بیس روپے اشتہارات و پیکنگ کے لیے بھیج کر ہم سے مفت طلب کریں بلکہ محصول ڈاک ہم اپنے پاس سے دیں گے۔ کفن دفن کا خرچ البتہ بذمہ خریدار رہے گا۔ ہمارے پاس ایک انگریز کا سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے۔ وہ سابقہ مشرقی پاکستان سے ایک ہاتھی اپنے ساتھ ولایت لے جانا چاہتا تھا۔ ترکیب سمجھ میں نہ آئی تھی۔ آخر چند روز ہماری گولیاں اسے مسلسل استعمال کرائیں حتیٰ کہ وہ ہاتھی کا خلاصہ بلکہ کیس پیپر رہ گیا۔ اب کیا تھا۔ سوٹ کیس میں بند کیا اور لے گیا۔ مر ضرور گیا تھا لیکن آپ نے سنا ہوگا، زندہ ہاتھی ایک لاکھ کا، مرا ہوا سوا لاکھ کا۔

☆☆

باصلاحیت فنکارائی

باتیں لیلیٰ واسطی سے

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''

''سیدہ سائرہ واسطی۔''

2۔ ''پیار کا نام؟''

''ابو ''بے بی'' کہا کرتے تھے اور امی ''لیلیٰ'' کہتی تھیں۔''

3۔ ''تاریخ پیدائش؟''

''10 اپریل''

4۔ ''قد؟ ستارہ؟''

''5 فٹ ساڑھے سات انچ، اور ستارہ Aries (حمل) ہے۔''

5۔ ''مادری زبان؟''

''اردو ہے اور ویسے گھر میں اردو انگریزی دونوں بولی جاتی ہیں۔''

6۔ ''فیملی ممبر/ آپ کا نمبر؟''

''میرا ایک بھائی ہے جو مجھ سے بڑا ہے ریحان نام ہے اور پھر میں ہوں۔''

7۔ ''شادی/ بچے؟''

''شادی ہوئی ہے/ بچے نہیں ہیں۔''

8۔ ''تعلیم؟''

''میٹرک سینٹ جوزف گورنمنٹ ہائی اسکول سے کیا، اور بی اے سینٹ جوزف کالج سے، فلم میکنگ UELA اور USA سے کیا۔''

9۔ ''شوبز میں آمد/ گھر والوں کا ردعمل؟''

''والدین تھے اس فیلڈ میں۔ اس لیے مشکل نہیں ہوئی اور والدین بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔''

10۔ ''پہلا ڈرامہ؟ پہچان کس نے دی؟''

''بیگم حویلی'' ٹیلی فلم تھی جو پی ٹی وی سے آن ایر ہوئی اور شہرت ڈرامہ سیریل ''اعتراف'' نے دی۔''

11۔ ''پہلی کمائی کتنی تھی اور کس کے ہاتھ میں رکھی تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ 2000 تھی اور میں نے اپنی امی کو دے دیے تھے۔ لیکن انہوں نے واپس کر دیے اور میرے لیے بچت کر دیے۔''

12۔ ''شوبز کے علاوہ آپ کی مصروفیات؟''

''اپنے کتوں کا خیال رکھتی ہوں۔ اپنے گھر کا، نماز پڑھتی ہوں۔ مطالعہ کرتی ہوں۔ میوزک سنتی ہوں۔ موویز دیکھتی ہوں کھانا بھی پکاتی ہوں۔''

13۔ ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''

''میں صبح سویرے اٹھنے کی عادی ہوں۔ فجر کی نماز پڑھتی ہوں اور پھر سو جاتی ہوں اور پھر ساڑھے سات بجے

یا اٹھ بجے اٹھ جاتی ہوں۔"

14۔ "صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟"

"مجھے صبح اٹھنا اچھا لگتا ہے اور چائے نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی۔"

15۔ "کیا برداشت نہیں۔ غصہ یا بھوک؟"

"بھوک۔ اگر مجھے کھانا نہ ملے تو غصہ آجاتا ہے۔"

16۔ "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"صرف دعائیں کرتی ہوں پاکستان کے لیے۔"

17۔ "سیاست میں کون پسند ہے؟"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کسی بھی سیاست دان سے۔"

18۔ "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"میں امریکا کی شہری ہوں۔"

19۔ "کیا آپ کورونا کا شکار ہوئیں اور لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟"

"شکر الحمدللہ کورونا کا شکار نہیں ہوئی۔ اور میں نے بہت زیادہ ایس او پیز کا خیال رکھا کیونکہ میں کینسر کی مریضہ رہ چکی ہوں۔ لاک ڈاؤن میں زیادہ وقت مطالعہ میں گزارا۔"

20۔ "شوبز میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟"

"شوبز ہو یا دیگر پروفیشن، اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے صرف شوبز کی بات نہیں کی جاسکتی۔"

21۔ "اسپورٹس سے آپ کا لگاؤ؟ کون سا گیم پسند ہے؟"

"ابو کے ساتھ بیٹھ کر کرکٹ دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا جبکہ میں تھروبال کھیلتی تھی اسکول کے زمانے میں۔"

22۔ "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"اس دنیا میں ہمیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے اچھا رویہ رکھیں۔ برے وقت میں کام آئیں۔ ان کی مشکلات کا احساس کریں۔"

23۔ "اب نصیحت جو نوانوں کو کرنا چاہتی ہیں؟"

"بچپن سے ہمارے والدین نے ہمیں یہ سکھایا کہ

کچرا باہر نہیں پھینکنا تو گاڑی میں ہمارے پاس ایک بیگ ہوتا تھا جس میں ہم کچرا رکھتے تھے۔ تو بس یہی نصیحت کروں گی کہ اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف رکھیں، اپنی زمین سے اپنے وطن سے پیار کریں۔

24۔ "گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ بہت پسند آیا؟"

"مجھے ڈرامہ سیریل "بلا" بہت اچھا لگا تھا اس میں میرے پسندیدہ آرٹسٹ "بلال عباسی" بھی تھے۔ عشقیہ، رانجھا رانجھا کردی۔"

25۔ "پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟"

"مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میں اداکاری کرسکتی ہوں۔ میرا پہلا سین "زینت یاسمین" صاحبہ کے ساتھ تھا۔ سین او کے ہوا۔ سب نے تالیاں بجائیں تو اندازہ ہوا کہ میں اداکاری کرسکتی ہوں۔"

26۔ "تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے"

"تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ میرے ساتھ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ویسے بھی کتابیں

بہت پڑھتی ہوں۔"

27۔ "دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟"

"جب کسی سین میں بہت تیز بولنا ہوتا ہے یا غصے کا سین ہوتا ہے تب۔ اتنی عادت نہیں مجھے تیز بولنے کی۔"

28۔ "کیا مارننگ شوز ہونے چاہئیں؟"

"جی بالکل ہونے چاہئیں۔ ساری دنیا میں ہوتے ہیں ہر طرح کے شوز ہوتے ہیں۔"

29۔ "گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ اور پیار کس سے ملا؟"

"امی سے بہت زیادہ ڈانٹ پڑی وہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھیں۔ اور والد صاحب سے بہت پیار ملا۔ اور بھائی ریحان سے بہت پیار ملا اور اب اپنے شوہر سے بہت زیادہ پیار مل رہا ہے۔"

30۔ "بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟"

"میں بہت بیمار رہی ہوں مگر میں نے سارا وقت دعاؤں اور شکر گزاری میں گزارا کہ جس نے بیماری دی ہے وہ ہی صحت بھی دے گا۔"

31۔ "آپ کے اب تک کے ڈراموں کی اور کمرشلز کی تعداد؟"

"میں نے 2015/2016 میں ایک کمرشل کیا تھا۔ اور اب 2020 میں ایک کمرشل کیا ہے اور دس پندرہ سیریلز، چھ یا آٹھ ٹیلی فلمز کی ہیں اور پانچ چھ ہی سنگل ڈرامے کیے ہیں۔"

32۔ "رومنٹک رول آسانی سے کر لیتی ہیں یا نگیٹو؟"

"ہر طرح کے، مجھے مزہ آتا ہے مختلف قسم کے رولز کر کے۔"

33۔ "ادب سے لگاؤ..... کس کو پڑھا؟"

"ہمارے گھر میں امی کی طرف سے سارا اردو لٹریچر ہوتا تھا اور ابو کی طرف سے انگریزی، تو زمین سے لے کر چھت تک کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں تو سب کو پڑھا ہے میں نے۔"

34۔ "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔"

35۔ "کچن سے لگاؤ؟"

"بچپن سے تو نہیں تھا لیکن جب باہر پڑھنے گئی تو آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھا۔ اور چکن اور دال بہت اچھی بنا لیتی ہوں۔"

36۔ "سُریلا گانا یا لذیذ کھانا، کیا پسند ہے؟"

"لذیذ کھانے کے ساتھ سریلا گانا پسند ہے۔"

37۔ "ایک خواہش جو حسرت بن گئی؟"

"کہ میں اپنے والدین کی بڑھاپے میں خدمت نہیں کر سکی۔"

38۔ "کس کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہیں؟"

"اپنے شوہر فہد صاحب کے لیے۔"

39۔ "ایک فلم جو بار بار دیکھی؟"

"میں بار بار فلمیں نہیں دیکھتی البتہ دو تین فلمیں جو بہت انجوائے کیں۔ ان میں 'thelma and louise' دوسری 'Panic Room' چائنا ٹاؤن جب وی میٹ اور رانگ نمبر۔"

40۔ "آپ کو نفرت ہے؟"

"نفرت کا لفظ میں اپنی زندگی میں استعمال بھی نہیں کرنا چاہتی دکھ ہوتا ہے اس بات پر کہ لوگ اپنے ملک کی عزت نہیں کرتے اور اپنی گاڑی سے باہر کچرا پھینک رہے ہوتے ہیں۔"

41۔ "ڈنر پر گئیں، والٹ گھر پر رہ گیا بل دیکھ کر کیا کریں گی؟"

"میرا خیال ہے میں اپنی دوست کو فون کروں گی کہ فوراً پہنچو۔"

42۔ "ڈرائیونگ کے وقت کون سا گانا زیادہ سنتی ہیں؟"

"مجھے میوزک سے لگاؤ ہے اور میں سوفٹ میوزک والے گانے زیادہ سنتی ہوں، ہلہ گلہ اور ڈانس میوزک مجھے پسند نہیں۔"

43۔ "ڈاکٹر، حکیم اور ہومیو پیتھک کس پر زیادہ یقین ہے؟"

''ڈاکٹرز پر زیادہ یقین ہے۔''

44۔''پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟''

''صاف ستھرا ماحول تاکہ ہمیں صاف ستھری آکسیجن ملے اور پروٹیکشن، جان کی حفاظت کی ضمانت۔''

45۔''کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کرسکتا ہے؟''

''نہیں کبھی نہیں۔''

46۔''محفل میں بیٹھ کر موبائل استعمال کرنے والوں کے لیے کیا کہیں گی؟''

''میں زیادہ سوشل نہیں۔ محفلوں میں جاتی نہیں۔ ہاں لیکن اگر ریسٹورنٹ میں کوئی تیز آواز میں بات کررہا ہو تو وہ مجھے غیر مہذب لگتا ہے۔''

47۔''موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟''

''یا اللہ اس ملک کے مسائل حل کردے۔ 73 سالوں میں مطمئن ہونے کا پوائنٹ تو کبھی نہیں آیا۔''

48۔''ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟''

''مختصر ہے کہ کس طرح کی جاب ہے کتنے ٹائم کی ہے میں نے اپنی آدھی زندگی ملک سے باہر گزاری ہے۔''

49۔''غصے میں آپ کا ردعمل؟''

''مجھے بہت کم غصہ آتا ہے۔ میں زیادہ تر خاموش ہوجاتی ہوں، بہت غصہ آئے تو پھر اظہار بھی کردیتی ہوں۔''

50۔''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر پرسن؟''

''انور مقصود صاحب ہیں۔ اور معین اختر تھے۔''

51۔''نصیحت جو بری لگتی ہے؟''

''یہ کہ تمہیں یہ کرنا چاہیے۔ وہ کرنا چاہیے جبکہ وہ کام ہم پہلے سے ہی کررہے ہوتے ہیں۔''

52۔''جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل اکاؤنٹ؟''

''شوہر کے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ اور ایک سنگل اکاؤنٹ بھی ہو تو کیا ہی بات ہے۔''

53۔''ایک ڈیٹ جو آج تک یاد ہے؟''

''مجھے ساری تاریخیں یاد رہتی ہیں اور جو ڈیٹ بتانا چاہوں گی وہ 27 دسمبر 2008 میرے نکاح کی تاریخ ہے۔''

54۔''ایک کھانا جو ہر وقت کھایا جاسکتا ہے؟''

''میرا پسندیدہ کھانا ''بریڈ اینڈ بٹر'' ہے وہ کسی وقت بھی کھایا جاسکتا ہے۔''

55۔''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟''

''جب میں اپنے بڑے سینئرز آرٹسٹوں کی پرفارمنس دیکھتی ہوں جیسے خالدہ ریاست، عظمیٰ گیلانی، روحی بانو اور دیگر تو مجھے اپنی پرفارمنس میں بہت کمی نظر آتی ہے۔''

56۔''اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتی ہیں؟''

''مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی اور کو دیکھ رہی ہوں میں بہ حیثیت ایک ناظر کے اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں اور تنقیدی نگاہ سے۔

57۔''کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟''

''اسی چینل پر رک جاتا ہے جہاں کوئی اچھی چیز آرہی ہوتی ہے اور یہی اس چینل کی کامیابی کی نشانی ہے۔''

58۔''پہلی فلم جو سنیما میں دیکھی؟''

''یہ تو مجھے یاد نہیں بہت بچپن میں ابو کے ساتھ دیکھی ہوگی۔''

59۔''کوکنگ یا کھانا، کیا پسند ہے؟''

''میرے ابو بہت اچھا کھانا بناتے تھے مگر میں ان کے جیسا نہیں بنا سکتی۔ کووڈ 19 کے وقت تو میں ہر چیز پکاتی تھی۔''

60۔''کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟''

''میرا دل چاہتا ہے کہ جو بھی رول کروں اپنا سو فیصد دوں۔''

61۔''آپ کا ناقابل فراموش کردار؟''

''یہ تو میرے دیکھنے والے ناظرین ہی بتاسکتے ہیں۔ مگر پھر بھی۔ ''اعتراف'' میں میرا رول بہت اچھا تھا۔''

62۔''کس رول کو کرنے سے انکار کیا؟''

''بہت سارے رولز ہیں۔ مختلف وجوہات کی بنا پر۔''

63۔ ''کس سیاست دان کا رول کرنا چاہتی ہیں؟''

''سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔ اور ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔''

64۔ ''چاند پر پہنچ کر دنیا میں پہلا پتھر کس کو ماریں گی؟''

''نہیں ایسی حرکت نہیں کروں گی بلکہ شکر الحمدللہ کہوں گی۔''

65۔ ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''

''اس وقت تو میں نے صرف ناشتہ کرنا ہے۔ (ہنستے ہوئے) جو آج ہے بس اسی کی پلاننگ ہے۔ چھوٹی موٹی تو ہوتی ہے مگر بڑی نہیں۔''

66۔ ''بچوں کے ہاتھ میں موبائل، لمحہ فکریہ یا وقت کا تقاضا؟''

''ہر چیز میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ مگر یہ بچے تیس سال آگے کے لیے اور نئی ٹیکنالوجی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔''

67۔ ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''

''وہ فوڈ اسٹریٹ جہاں پر آپ کی پسند کا کھانا موجود ہو اور صاف ستھرا ہو۔''

68۔ ''آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟''

''ہمارا تو کام ہی آئینے سے شروع ہوتا ہے۔ کام کے وقت بہت زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔ گھر میں بالکل بھی نہیں۔''

69۔ ''کیا شادی کرنا ضروری ہے؟''

''اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ نئے بندے کو برداشت کرلے گا تو پھر ضرور کرلے۔''

70۔ ''اپنا کل (ماضی) سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟''

''کہ اللہ نے مجھے بہت خوشحال اور خوب صورت زندگی دی ہے اور یہ کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ امی ابو جیسے ماں باپ مجھے دیے تھے۔ بہت ہی پڑھے لکھے خاندان سے میرا تعلق ہے۔ میرے پردادا بھی پروفیسر تھے، دادا آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے۔

71۔ ''سگنل پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟''

''کسی چیز کا نہیں، سگنل پہ فوکس رکھتی ہوں۔''

72۔ ''بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟ فلم اور ٹی وی کے؟''

''بہت سارے تھے۔ کوئی ایک نہیں۔''

73۔ ''خواتین رائیٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائیٹر؟''

''بانو قدسیہ۔''

74۔ ''بچپن میں کون کون سے گیمز کھیلے؟''

''تھروبال، مگر کم کم۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لیا۔''

75۔ ''شاپنگ کے لیے پہلی ترجیح؟''

''مجھے شاپنگ کا شوق نہیں ہے مگر اپنے شوہر کے لیے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔''

76۔ ''کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی ہیں؟''

''عرصہ ہوا ایسا فیل کیے ہوئے۔ لیکن جب میرا نکاح ہوا تھا فہد کے ساتھ تو اس دن لگا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔''

77۔ ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''

''نہیں نہیں بالکل بھی نہیں، میری عادت ہی نہیں ہے۔''

78۔ ''کبھی تنہائی میں کسی کو یاد کر کے روئیں؟''

''بہت مرتبہ اپنے والدین کو یاد کر کے، اپنی دادی جان کو یاد کر کے۔''

79۔ ''کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''

''نہیں مجھے ان چیزوں کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔ پتا چل بھی جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بس اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔''

80۔ ''اگر آپ کو کسی سیلیبریٹی کا انٹرویو کرنے

لو نہیں تو آپ کا انتخاب؟''
''علی یوسف زئی۔''
81۔''نیند کتنی پیاری ہے؟''
''بہت زیادہ پیاری نہیں ہے۔ کیونکہ میں رات کی نیند میں کئی بار اٹھتی ہوں۔ فجر کے لیے پھر اپنے کتے کے لیے اور پھر اپنے کام کے لیے۔''
82۔''بچت کس شکل میں کرتی ہیں، پرائز بانڈ، پراپرٹی یا گولڈ؟''
''کسی صورت میں بھی نہیں۔ ہمارے چیک بڑی دیر میں بنتے ہیں تو بچت کیا ہوگی۔''
83۔''شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟''
''بے جا اصراف اور جہیز کے خلاف ہوں۔''
84۔''ٹی وی کا کوئی ایسا پروگرام جو بند ہو جانا چاہیے؟''
''اگر ناظرین دیکھ رہے ہیں۔ پسند کر رہے ہیں تو چلتے رہنے چاہئیں۔''
85۔''آج کی فکر زیادہ ہے یا کل کی؟''
''میں آج میں جیتی ہوں۔ کل کی فکر نہیں کرتی، بس اللہ پر بھروسا کرتی ہوں۔''
86۔''زندگی کب تقسیم ہو جاتی ہے؟''
''جب انسان کی قوت ارادی مضبوط نہیں رہتی اور وہ فیصلہ نہیں کر پاتا۔''
87۔''فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟''
''میرے شوہر مزاج کے گرم ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ گھر میں غصہ نہیں دکھاتے، شادی کے بعد آج تک ہماری لڑائی نہیں ہوئی۔''
88۔''کس عمر میں موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت ملی؟''
''مجھے تو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ جب موبائل فون آئے تو میں بڑی ہو چکی ہوں۔''
89۔''گھر میں آپ کے علاوہ کون اس فیلڈ میں ہے؟''
''میرے والدین تھے طاہرہ واسطی اور رضوان علی۔''
90۔''غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟''
''قہقہہ..... جو نکلتا ہے وہ میں بتانا نہیں چاہتی۔''
91۔''پسندیدہ تہوار؟''
''مجھے ہمیشہ سے میٹھی عید (عیدالفطر) بہت پسند ہے کلرفل کپڑے، مہندی چوڑیاں، شیر خورمہ، رنگ برنگی دنیا تھی، میرے شوہر کو مہندی کی خوشبو پسند نہیں مگر عید کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے مہندی لگاتے ہیں۔''
92۔''مرنے کے سین کرنا کیسا لگتا ہے؟''
''شاید میں نے ایک آدھ بار ہی کیا ہوگا۔''
93۔''اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟''
''دونوں سے میں کسی کی کوئی بھی بات ہو اس میں اچھی بات اخذ کر لیتی ہوں اور اپنے تجربے سے تو انسان سیکھتا ہی ہے۔''
94۔''کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''مجھے چائے پسند ہے مگر نشے کی حد تک نہیں۔''
95۔''دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟''
''پہلی بات دل سے سنتی ہوں اور دوسری بات دماغ سے اور پھر پریکٹیکل ہو کے سوچتی ہوں۔''
96۔''کیا چیز لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟''
''بیگ موبائل اور تھوڑا سا کیش۔''
97۔''کھانا کھانا کہاں پسند ہے، بیڈ، ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟''
''ڈائننگ ٹیبل پہ..... بیڈ پہ کھانا کھانے کی تو اجازت ہی نہیں ہوتی تھی۔''
98۔''اچھی بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟''
''اپنے میاں صاحب کو۔''
99۔''آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟''
''اتار چڑھاؤ تو زندگی میں آتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اللہ جو بھی دے شکر کے ساتھ لے لیں۔''

☆☆

اعتصام الحق سے ملاقات

شاہین رشید

آج کل ترکش ڈراموں کی بہت مانگ ہے عوام کے ساتھ ساتھ وزیراعظم کو بھی ترکش ڈرامے پسند ہیں۔اسی لیے ارطغرل غازی کی نئے سرے سے ڈبنگ کروا کے سرکاری میڈیا پہ چلا رہے ہیں۔ بڑی دھوم ہے آج کل اس سیریل کی۔تو سوچا کہ کیوں نا ارطغرل غازی کی آواز پر ڈبنگ کرنے والے آرٹسٹ سے آپ کی ملاقات کروائیں۔ان کا نام اعتصام الحق ہے۔اور آج کل یہ ارطغرل کی وجہ سے جانے جا رہے ہیں۔

''کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آپ کا نام اعتصام الحق ہے اور اس نام کے اعصام الحق ایک کھلاڑی بھی ہیں۔کبھی لوگوں کو غلط فہمی ہوئی؟''

''نام کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔میرا نام محمد اعتصام الحق ثاقب ہے اور اعتصام نام میں نے اپنی زندگی میں بہت کم سنا ہے اور عصام ہمارے ٹینس اسٹار ہیں اور چونکہ وہ ایک مشہور شخصیت ہیں تو لوگوں کو ان کا نام یاد ہو گیا ہے جبکہ میرے ساتھ قصہ کچھ یوں ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک، اسکول سے لے کر ریڈیو پاکستان تک جہاں میں جاب کرتا ہوں اور دیگر کام بھی کرتا ہوں۔ہر شخص میرا نام یا تو احتشام لیتا ہے یا احتصام لیتا ہے۔اعصام کوئی نہیں لیتا اور نہ ہی اعتصام لیتا ہے تو دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنا نام ساری زندگی ٹھیک کرواتے رہتے ہیں خیر.....''

''آپ آواز کی دنیا کی نامور شخصیت ہیں مگر جو شہرت آپ کو ''ارطغرل'' کے کردار سے ملی، وہ پہلے نہیں ملی تھی۔اتفاق کرتے ہیں؟''

''جی! بالکل یہ حقیقت ہے اور اس سے بالکل بھی انکار نہیں ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے اتنی عزت دی ورنہ تو 2008ء سے وائس اوور اور 2009ء سے جب ڈبنگ انڈسٹری باقاعدہ لانچ نہیں ہوئی تب بھی میں نے فلمز کی ڈبنگ کرنا شروع کی تھی اور اس وقت سے لے کر آج تک ڈبنگ کرتا رہا ہوں۔خواہ وہ بڑا پروجیکٹ ہو یا چھوٹا.....اور ایرانی فلم ''یوسف پیامبر'' بہت مشہور ہوئی تھی، اس کی ڈبنگ کی.....دیگر چینلز کے لیے میں کام کرتا رہا۔2012' 2013 سے ''ایکسپریس'' میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروڈیوسر اینڈ ڈبنگ ڈیپارٹمنٹ میں اور پھر اس کا ہیڈ بھی رہا۔اردو ون پر بھی کام کرتا رہا۔2014 سے 2015 تک بہ حیثیت ڈبنگ پروڈیوسر۔اور میں نے خود بھی ڈبنگ میں حصہ لیا اور آرٹسٹوں سے بھی کام کروایا۔مگر جتنی پہچان اس کریکٹر کو کرنے کے بعد ملی ہے کبھی نہیں ملی تھی۔

خوشی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ایک ایسے کریکٹر کے لیے کام لیا ہے جو لوگوں کے دلوں میں ہے اور نہ صرف اس فنکار کو جس نے ارطغرل کا رول کیا ہے بلکہ مجھے بھی بہت داد مل رہی ہے۔میری بھی بہت تعریف ہو رہی ہے کہ جتنا اچھا فنکار نے پرفارم کیا ہے اس سے کہیں زیادہ آپ نے اس رول پہ صداکاری کی ہے۔

اور آپ یقین کریں کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ ''ارطغرل غازی'' کی آواز میری ہے تو سامنے

والے کی ایکسائٹمنٹ دیکھنے والی ہوتی ہے اور میں اس وقت بہت حیران بھی ہوتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں۔''

''2014ء میں بھی یہ سیریل ''ہم ستارے'' سے آن ایر ہوا تھا جو کہ زیادہ مقبول نہیں ہوا تھا۔ کیا اس وقت بھی آپ کی آواز تھی؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ''ہم ستارے'' نے اسے شروع کیا تھا 2014ء میں اور انہوں نے اس کا صرف ایک سیزن ڈب کیا تھا جبکہ یہ پورا ڈرامہ پانچ سیزن پر مشتمل ہے۔ اس وقت کے سیزن میں میری آواز شامل نہیں تھی اور اس وقت اس کو بالکل بھی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اب جو ٹیم کام کر رہی ہے وہ بالکل نئی ٹیم ہے۔ ڈبنگ ڈائریکٹر خرم جمشید ہیں۔ کے جے پروڈکشن کے ذمہ یہ کام آیا اور کئی پروڈکشن ہاؤسز کے ''ڈیمو'' دیکھنے کے بعد کے جے پروڈکشن کا انتخاب کیا گیا۔ یہ بالکل نئی ٹیم ہے ہر لحاظ سے۔ تو پی ٹی وی اور کے جے پروڈکشن مل کر اس پر کام کر رہے ہیں۔''

''اس کردار کے لیے آپ کا انتخاب کیسے ہوا؟''

''ارطغرل کے ڈبنگ ڈائریکٹر خرم جمشید اس سیریل سے پہلے ''عشق ممنوع'' جیسا میگا ہٹ ڈرامہ دے چکے ہیں۔ اس انڈسٹری کو اور ہمارے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹ کامران نقوی بھی بڑے ڈراموں کی ڈبنگ کروا چکے ہیں تو ان دونوں صاحبان کے ساتھ میں نے کچھ عرصہ قبل کافی کام کیا تھا۔ تو جب انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ کردار آپ نے کرنا ہے۔ پھر دونوں نے اس کردار کو بہت اچھے طریقے سے بریف کیا اور پھر میں نے اس پر صداکاری کی۔

چونکہ پورا ڈرامہ اس کردار پر بیس کرتا ہے تو ٹیکنیکل پوائنٹ سے اور ہر لحاظ سے تسلی کر کے میرا انتخاب ہوا۔ خرم جمشید اور کامران نقوی نے اور ہر لحاظ سے تسلی سے مراد یہ ہے کہ کہیں رومینس ہے تو کہیں غصہ ہے، کہیں کوئی ذمہ داری ہے، والدین سے گفتگو..... یعنی کس سے کس لہجے میں بات کرنی ہے، یہ سب دیکھا گیا اور ایسا نہیں ہے کہ چونکہ میں نے ان دو حضرات کے ساتھ کام کیا تھا تو میرا انتخاب ہوا بلکہ کافی لوگوں کا آڈیشن ہوا اور پی ٹی وی نے بہت ساری آوازیں سننے کے بعد اس کردار کے لیے میرا انتخاب کیا اور اس کردار کے لیے محنت بہت ہوئی، صرف میری نہیں دونوں ڈائریکٹرز کی۔ میرے آڈیو انجینئر شہزاد اسلام کی اور دیگر لوگوں کی..... تو یہ سب ٹیم ورک ہے۔''

''آپ نے کہا کہ محنت بہت کرنا پڑی تو مشکلات کہاں سے کہاں پیش آئیں؟ کوئی ٹریننگ بھی ہوئی تھی؟''

''مشکلات کی جہاں تک بات ہے تو مشکل ہر اس دن ہوتی ہے جس دن ہم نے اس کو ڈب کرنا ہوتا ہے کیونکہ یہ ڈرامہ مستقل تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مختلف کرداروں کے ساتھ مکالمے ہوتے ہیں، سچویشن

مختلف ہوتی رہتی ہیں اور آپ نے اسے فوراً اڈاپٹ کرنا ہوتا ہے..... اور ٹریننگ تو نہیں ہوئی کیونکہ 2008-9ء سے میں وائس اوور بھی کر رہا ہوں، ڈبنگ بھی کر رہا ہوں تو ٹریننگ کی ضرورت تو نہیں پڑی، ہاں بریفنگ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ ہمیں دی بھی جاتی ہے۔ پھر ہم کام کر بھی لیتے ہیں تب بھی جب وہ چیک ہوتا ہے دوبارہ سے۔ ہمیں بتاتے ہیں کہ آپ نے کہاں کہاں غلطیاں کی ہیں اور اسے دوبارہ سے کریں..... تو یہ سلسلہ ہے جو چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا، جب تک ہم ڈب کرتے رہیں گے ''اس سیزن یا سیریل کی کامیابی کا کریڈٹ پوری ٹیم کو جاتا ہے مگر پھر بھی آپ کس کو یہ کریڈٹ دینا چاہیں گے؟''

''عموماً لوگ انفرادی طور پر اپنا کریڈٹ سمجھتے ہیں جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے اس کردار کو جو میں نے کیا بہترین طریقے سے ادا کروانے میں پوری ٹیم کا دخل ہے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے ہمارے ساتھ کام کیا اور ہم سے کام کروایا..... اور ہاں پی ٹی وی کو بھی کریڈٹ جاتا ہے کہ جس توجہ کے ساتھ انہوں نے کام کیا ہے۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی اس سیریل کے چرچے ہیں۔''

''آپ کہیں بیٹھے ہیں، بول رہے ہیں تو لوگ پہچان لیتے ہیں؟''

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے اور جو لوگ اسکرین پہ ہوتے ہیں انہیں لوگ فوراً پہچان لیتے ہیں۔ لیکن آواز کی دنیا کے جو لوگ ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ آواز سننے کے بعد پوچھتے ہیں کہ آپ کی آواز سنی ہوئی ہے۔ پھر کسی کمرشل کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس ڈرامے کے حوالے سے بھی ایک دو لوگوں نے کہا کہ آپ کی آواز سنی سنی سی لگتی ہے کیونکہ ڈرامے میں صدا کاری کرنا اور عام زندگی میں بولنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ہم پہچان میں نہیں آتے۔''

''اس سیریل کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس میں ایسا کیا ہے کہ اسے حکومت کی سرپرستی مل گئی؟''

''جی وزیراعظم کی خواہش تھی اور ان کی خواہش کو پورا کرنے کا بیڑا پی ٹی وی نے اٹھایا اور میں سمجھتا ہوں کہ کچھ غلط نہیں ہو رہا..... کیونکہ میں اگر پاکستانی ڈراموں کی بات کروں تو مجھے شدید اختلاف ہے۔ جس طرح کی اسٹوریز لکھی جاتی ہیں، جس طرح کا ماحول دکھایا جاتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمیں تو صرف انٹرٹینمنٹ سے مطلب ہے۔ ہمارا اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کہ معاشرے میں کیا ہو رہا ہے تو یہ بہت خطرناک صورت حال ہے۔

''ارطغرل'' زندگی کے بہت قریب ہے۔ آپ اس میں دکھا رہے ہیں کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آپ اس میں کردار سازی بھی کر رہے ہیں، فیملی سسٹم بھی دکھا رہے ہیں۔ آپ دکھا رہے ہیں کہ عورت کو کتنا بااختیار اور کتنا مضبوط ہونا چاہیے۔ کسی مقصد کے حصول میں یا اپنے شوہر، اپنے بھائی، اپنے والد کے ساتھ مل کر کس انداز میں کام کرنا چاہیے۔ معیشت کے حوالے سے، حکمرانی کے حوالے سے..... تو یہ زیادہ اسٹرونگ میسج ہے بہ نسبت پاکستانی ڈراموں کے جہاں لڑائی جھگڑے اور عشق و محبت اور دوسروں کے حق پہ ڈاکہ ڈالنے کے کچھ نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی تو ایسے ڈرامے اچھے لگتے ہیں مگر ہمیشہ نہیں۔ ہمارے ڈرامے ہماری نئی نسل پہ بہت غلط اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ اور اس کے خلاف بہت زیادہ آواز اٹھنی چاہیے ورنہ ہم جو چیزیں اپنے نوجوانوں کو دکھا رہے ہیں اس سے کسی اچھے رزلٹ کی امید نہ رکھیں۔ دولت، پیسہ، عشق، محبت یہی سب کچھ نہیں ہے دنیا میں۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''ارطغرل غازی'' جیسے ڈرامے ہی دکھانے چاہئیں؟''

''میں تو یہی کہتا ہوں کہ اس طرح کے

(ارطغرل غازی) دیگر ڈرامے بھی پاکستان میں دکھائے جائیں۔ ڈبنگ انڈسٹری کو فروغ ملنا چاہیے اور اس کا مضبوط ہونا تمام فنکاروں کے لیے ضروری ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ کسی بھی انڈسٹری کے اوپر آنے سے یا پروان چڑھنے سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں اور اس کو مزید بہتر کرنے کی کوشش کریں اور ہماری تاریخ کے کردار جیسے ٹیپو سلطان ہیں، حیدر علی ہیں اور محمد بن قاسم ان پر دوبارہ ڈرامے بننے چاہئیں۔ لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ عورت صرف روتی ہوئی ہی نظر آنی چاہیے تو پھر ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہ ڈرامہ (ارطغرل غازی) دکھایا جانا ہم سب کے لیے ایک آئینہ ہے کہ آپ کس طرح ایک اچھے اور پوزیٹو کام کے ساتھ اپنا بزنس چلا سکتے ہیں۔''

''اس سیریل سے کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں؟''

''اس میں بہت سے پوزیٹو میسجز ہیں، مثلاً غیرت کیا ہے اور اس کو کس انداز میں ایک مثبت انداز میں سوسائٹی میں لے کر آسکتے ہیں۔ حیا، راست گوئی، شرم کیا ہے۔ سچ بولنا اور سچ پر ڈٹے رہنا کیا ہے۔ عزت کیا ہے۔ دور اندیشی کیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کیا ہیں۔ ادب و آداب کیا ہیں..... اور خاص طور پر یہ جو کردار ہے۔ ارطغرل غازی کا بہت اسٹرونگ ہے اور میں ڈبنگ کرتے ہوئے اس کردار سے بہت کچھ سیکھتا ہوں اور عمل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔

میں نے اس کردار سے ''توکل'' سیکھا ہے کہ اللہ پر آپ کا کس حد تک یقین ہے۔ اللہ کی مدد کا آپ کو کس حد تک یقین ہے اور یہ وہ میسجز ہیں جو اس ڈرامے کے ذریعے ناظرین تک پہنچائے جارہے ہیں۔ جو پوزیٹو میسجز اسلام کے ہیں، ہمارے دین کے ہیں وہ اگر ہمیں کہانیوں میں، کرداروں میں سمجھائے جائیں تو یہ ایک اچھی علامت ہوگی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''عموماً ڈبنگ والے ڈراموں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہیے جبکہ ہم خود اچھے ڈرامے بنا سکتے ہیں اور بناتے ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟''

''ڈبنگ پوری دنیا میں ایک انڈسٹری ہے۔ پاکستان میں جب بھی ڈبنگ کے حوالے سے کوئی کام مشہور ہوتا ہے تو لوگ اس پر تنقید کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی خطرہ ہوتا تو پوری دنیا کو ہوتا..... ہم نے تاریخی سیریلز پہلے بھی بنائے ہیں اور اب بھی بنا سکتے ہیں کیونکہ ہماری تاریخ تو بہادری اور فتوحات سے بھری پڑی ہے مگر آپ اسے نہ دکھانا چاہیں اور صرف عشق و محبت میں پڑے رہیں تو پھر کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں رائٹرز کو بھی کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ بھی ڈیمانڈ پر چلتے ہیں۔ اصل ذمہ داری تو پروڈکشن ہاؤسز اور اسپانسرز کی ہے، انہیں سپورٹ کرنا چاہیے جو کہ وہ نہیں کرتے۔''

''چلیں جی ڈرامے پر تو بہت باتیں ہوگئیں۔ اب آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟''

''ہمارا تعلق ''کے پی کے'' سے ہے اور ہزارہ ڈویژن سے ہمارا فیملی بیک گراؤنڈ ہے۔ ہم بہن بھائی کراچی میں پیدا ہوئے کیونکہ والدین کراچی شفٹ ہوگئے تھے۔ والد صاحب پاکستان کسٹم میں جاب کرتے تھے۔ ان کا 2011ء میں انتقال ہوگیا۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ ہم ماشاء اللہ نو بہن بھائی ہیں۔ چار بہنیں اور پانچ بھائی ہیں۔ بھائیوں میں میرا نمبر آخری ہے جبکہ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ 2017ء میں میری شادی ہوئی اور میرا ماشاء اللہ سے ایک بیٹا ہے اور میں نے وفاقی اردو یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے اور میں گولڈ میڈلسٹ ہوں اور میری فرسٹ پوزیشن تھی اور ویسے تو کراچی میں رہائش اور پرورش کی وجہ سے اردو ہی بولی مگر ہماری مادری زبان ہندکو اور پشتو ہے جو گھر میں بولی بھی جاتی ہے اور سمجھی بھی جاتی ہے اور ہاں پچیس جولائی کو پیدا ہوا۔''

''اس فیلڈ میں یعنی ریڈیو کی دنیا میں کیسے آئے؟''

''اس فیلڈ میں کسی شوق کے تحت نہیں آیا۔ میرے ایک دوست ہیں احمر عباس۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کو ریڈیو پہ صداکاری کرنی چاہیے اور بات ہے 2007ء کی۔ مگر اس سے قبل میں ریڈیو پہ انٹری دے چکا تھا۔

اصل میں ہمارا گھرانا کافی مذہبی ٹائپ کا ہے۔ میرے سارے بھائی قاری اور نعت خواں ہیں تو میں بھی نعت ریکارڈ کروانے گیا تھا تو مجھے پروڈیوسر نے کہا کہ آپ کو ڈرامہ میں صداکاری کرنی چاہیے تو میں وہاں سے بھاگ کر گھر آ گیا اور دوبارہ نہیں گیا کہ والد صاحب برا مانیں گے..... پھر 2007ء میں دوست کے کہنے پر ریڈیو گیا اور اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 2007ء سے 2008ء کی جولائی تک بزم طلبہ کیا اور اسسٹنٹ پروڈیوسر کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ 2008ء سے 2014ء تک ریڈیو پاکستان کے کرنٹ افیئرز کا میں میزبان رہا۔ اس دوران ایف ایم 93 میں بھی کام کیا۔ 2015ء میں، میں نے ایف ایم 101 جوائن کیا اور اس دوران 2009ء میں ایف ایم 103 کا ایک سگمنٹ ٹیلی ورلڈ کے نام سے ہوتا تھا وہ شو بھی کیا کرتا تھا (وہ اب بھی ہوتا ہے مگر اب اسے میں نہیں کرتا) پھر ایک دوست جو بہت اچھے شاعر بھی ہیں، ہدایت ساحر۔ وہ مجھے ایکسپریس ٹی وی لے کر گئے جہاں سے ایک ڈاکومنٹری پروگرام ہوتا تھا۔ اس میں میری آواز جانے لگی اور یہ 2008ء کی بات ہے تو واس اوور میں 2008ء سے کر رہا ہوں۔ 2015ء میں، میں نے بہ حیثیت پروڈیوسر کے اپلائی کیا اور اپائنمنٹ ہوا۔ تو اب آواز کی دنیا ہی میرا شعبہ بھی ہے، میرا روزگار بھی ہے اور میرا شوق بھی ہے۔''

''اور کیا کیا کرتے ہیں فارغ اوقات میں؟ یا کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے؟''

''میں بہت زیادہ فیملی اور نیٹ بندہ ہوں۔ دوستوں کا سرکل کافی وسیع ہے مگر ملنا ملانا مخصوص دوستوں سے ہی ہے۔ لوگوں سے رابطہ انسٹاگرام، فیس بک اور یوٹیوب پر زیادہ رہتا ہے اور کوشش کرتا ہوں کہ سب کو خود جواب دوں۔ میرا اعتصام الحق کے نام سے آفیشل پیج بھی ہے۔ کھانے پینے میں اگر دن کے ٹائم یعنی دوپہ کو کوئی دال چاول آفر کرے تو انکار نہیں کرتا۔ مجھے بہت پسند ہیں۔ میری والدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا فرائی گوشت اور بھنا ہوا گوشت مجھے بہت پسند ہے۔ سبزی ڈال کر پالک گوشت والدہ بہت اچھا بناتی ہیں۔

بیگم بھی اچھا پکاتی ہیں مگر میری والدہ کی طرح ماہر نہیں ہیں۔ وہ چائنیز اور کانٹی نینٹل کھانے زیادہ بہتر بناتی ہیں۔ کھانے کے معاملے میں پہلے بہت زیادہ چوزی تھا مگر اب اتنا نہیں ہوں۔ ہاں ہیلتھ کانشس زیادہ ہو گیا ہوں اور آئلی چیزوں سے پرہیز کرنے لگا ہوں۔''

''گھومنے پھرنے کا شوق ہے؟ کھیلوں سے لگاؤ؟''

''گھومنے پھرنے کے حوالے سے اگر بات کروں تو پہلے پڑھائی میں مصروف رہے پھر پریکٹیکل لائف میں آ گئے اور مصروفیات کی وجہ سے کہیں جانے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ ٹریولنگ کم ہے مگر جب بھی جہاں بھی جاتا ہوں، انجوائے کرتا ہوں۔ 2015ء میں جب ریڈیو پاکستان کی طرف سے ٹریننگ کر رہا تھا تو گھومنے پھرنے کا موقع ملا تو وہ میری زندگی کے یادگار دن ہیں۔ فٹ بال کا سیزن ہو تو ضرور دیکھتا ہوں، پسندیدہ کھیل کرکٹ ہے اور ہاں جی..... جب پی ایس ایل کا وقت آتا ہے تو ریڈیو کی طرف سے میں ہی اسے کور کرتا ہوں۔ کمنٹری بھی کرتا ہوں اور بہ حیثیت پروڈیوسر کے بھی اپنے فرائض انجام دیتا ہوں اور بہت انجوائے کرتا ہوں۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اعتصام الحق صاحب سے اجازت چاہی، اس شکریے کے ساتھ کہ ہمیں ٹائم دیا۔

☆☆

شعاع کا اپنا ماہنامہ

اکتوبر 2020
کے شمارے کی ایک جھلک

اکتوبر 2020
کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- ''سفر'' ماریہ نواز کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- ''زرتاشہ'' گلِ ارباب کا مکمل ناول،
- ''شہرِ تمنا'' نعیمہ ناز کا ناول،
- ''شام کی حویلی'' رخسانہ نگار عدنان کا ناول،
- ''وہ نازنین'' فرح بخاری کا ناولٹ،
- ''دل کا معاملہ'' عائشہ نصیر کا ناولٹ،
- حنا بشریٰ، افشین نعیم، عمارہ جہاں، فرحت جبیں اور شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے،
- ارطغرل کے صداکار ''اعتصام الحق'' سے ملاقات،
- ''دستک'' معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ''پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں'' احادیث کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع اکتوبر 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

محسوس کیا اور ان کو اکیڈمک الفاظ میں سمیٹا۔ وہ الفاظ اب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ایک کتاب کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

Storied of oil stains

(میلے ہاتھوں سے لکھی روشن کہانیاں)

کی رونمائی اس سال 18 اکتوبر کو اسلام آباد لٹریری فیسٹول میں ہوگی۔

یہ ہم سب کی مشترکہ کامیابی ہے۔ میری طرف سے سب کو گلاب جامن اور سموسوں کے ساتھ چائے کی دعوت ادارہ خواتین ڈائجسٹ، امتل اور مصنفین نے اس سلسلے میں مجھ سے جو تعاون کیا۔ اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ان کا پیار میرا قیمتی سرمایہ ہے بالخصوص سدرۃ المنتہیٰ اور ان کے گھر والے جن کی محبت میں میں نے دھنک کے تمام رنگ محسوس کیے ہیں۔

ج: کرن! ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر ہماری جانب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ آپ نے ریسرچ کے لیے بہت اچھے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں اس موضوع پر یہ پہلی ریسرچ ہے۔

صفیہ مہر.....کوٹلی مراد، خان پور

ٹائیٹل پر ایک نظر ڈال کر فہرست دیکھی۔ سب سے پہلے راحت جی کے ناول کی طرف بھاگی۔ نسیم سحر قریشی ''خواب، سراب، گلاب'' ان کو آج پہلی دفعہ پڑھا مگر بڑھیا پایا۔ کہانی روایتی تھی مگر بور نہیں ہوئی۔ گل ارباب، .....نام تو عجیب لگا مگر کہانی بڑی اصلاحی تھی۔

ناولٹ دونوں دلچسپ تھے، خاص طور پر حنا بشری کا ''انوکھا لاڈلا'' فائزہ بھٹی پہلی بار آئیں اور چھا گئیں۔ بیٹی کے نام، مظلوم باپ کے خط پڑھ کر دل بھر آیا۔

ج: پیاری صفیہ! آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

شمع اختر.....

تقریباً بتیس سال سے شعاع خواتین کی قاری ہوں یہ رسالے تو میری زندگی کا حصہ ہیں۔

ویسے تو پرانی رائٹرز بھی بہت اچھا لکھا کرتی تھیں اور لکھتی ہیں مگر نئی نسل ہمیشہ پچھلی سے بہتر ہوتی ہے یہ ثابت کیا

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ' 37۔ اردو بازار، کراچی۔

Email: Info@khawateendigest.com

ڈاکٹر کرن نذیر احمد.....اسلام آباد

میرے قلم میں وہ روانی تو نہیں جو اس محفل کا خاصا ہے لیکن پھر دل کیا کہ آج اس بزم میں اپنی آواز شامل کروں۔ اس وقت باہر دوپہر کی خاموشی ہے اور اندر بہت ساری سوچوں کی رونق۔ ڈائجسٹ سے میری دوستی کو اب تین دہائیوں سے زیادہ ٹائم گزر چکا ہے، گرمیوں کی چھٹیوں میں خالہ کے گھر رہنے گئی تو ایک لمبی دوپہر گزارنے کے لیے یونہی رسالہ اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ (امی سے چھپ کر) بس اسی دن سے ڈائجسٹ سے پکی دوستی ہوگئی امریکہ کی یونیورسٹی آف ٹیکساس ایٹ آسٹن پی ایچ ڈی کی ریسرچ بھی ڈائجسٹ کی لکھاریوں پر ہی کی .....تقریباً پانچ سال اس پر تحقیق کی اور اس ڈائجسٹ کی دنیا کے باسیوں کے پیار اور ان کے تعلقات کی گہرائی کو

لاری بچیوں اور خواتین نے۔ ایک سے بڑھ کر ایک
اول، ناولٹ افسانے آپ کے حسن انتخاب کی بھی داد دینی
ہے۔

اب یہ بھی بتا دوں کہ میں نے آٹھ سال کی عمر میں
الے پڑھنا شروع کیا تھا۔ اب تو میرا بیٹا بھی جوان ہوگیا
مگران رسائل کی محبت کم نہیں ہوئی اب میرا بیٹا مجھے ہر مہینے
الردیتا ہے خواتین اور شعاع۔

ج: پیاری شمع! آپ نے ہمیں یاد کیا بہت شکریہ۔
ہماری پرانی قارئین ہمیں خط لکھتی ہیں تو ہمیں خوشی تو ہوتی
ہے ساتھ ساتھ یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ہم خواتین
ڈائجسٹ کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔

مبشرہ خالد.....کراچی

یوں تو میں آپ کے تینوں پرچوں کی خاموش
قاری ہوں مگر اب آپ سے گفت وشنید کرنے کو دل
چاہتا ہے میں نے شعبہ ابلاغ عامہ میں ماسٹرز کیا ہے
دوران تعلیم اس بات کا احساس ہوا کہ اس شعبہ میں
موجود اساتذہ ڈائجسٹ رائٹرز کو ماننے کے روادار نہیں
اور اسی بات کی تلقین وہ اپنے طالب علموں کو بھی کرتے
ہیں، اس معاملہ میں میرا اپنے ساتھیوں سے کہنا تھا کہ
ہمارا تعلق جس شعبہ سے ہے وہاں فلسفہ،
دب، سیاست کو جاننا، پرکھنا، جانچنا ہمارے لیے جنون
کی حیثیت رکھتا ہے، ہماری زندگی رنگوں سے بھرپور
ہے مگر اس معاشرہ میں وہ خواتین بھی ہیں جن کی زندگی
گھر کی چاردیواری، سسرال کے جھمیلوں میں گھری
ہوئی ہے ایسے میں یہ ڈائجسٹ ان کے لیے تازہ ہوا کا
جھونکا ثابت ہوتا ہے، وہ زندگی کی تلخیوں سے لڑنے کا
اپنے اندر حوصلہ پیدا کر پاتی ہیں، ان کے اندر زندہ
رہنے کی امید جاگتی ہے۔

اس لیے وہ خواتین جو ڈائجسٹ کے مواد کی تبدیلی
کی بات کرتی ہیں ان سے میں اتنا کہوں گی اگر آپ
کو مواد کی تبدیلی درکار ہے تو لائبریری کا رخ کیجئے، آپ کو
تبدیلی مل جائے گی مگر ڈائجسٹ کے مواد کو تبدیل کرنے کی
بات نہ کیجیے کیونکہ زندگی کو محسوس کرنا اور خوش رہنا سب کا
حق ہے اور ڈائجسٹ کے قاری اسی مواد میں خوش ہیں۔

ج: پیاری مبشرہ! آپ نے بہت پیاری بات لکھی
ہے۔ یہ خوشیاں، امید کی ننھی ننھی کرنیں ہم ان لوگوں تک
پہنچاتے ہیں جن کی زندگی میں آس امید کی ایک بھی کرن
نہیں جو زندگی سے مایوس ہوکر کچھ کرنے کا حوصلہ بھی
کھو بیٹھے ہیں۔ بلاشبہ یہ ہمارے اردگرد کی ہی کہانیاں
ہیں۔ بس تھوڑا سا دھیان سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

آپ باقاعدگی سے ہماری محفل میں شرکت کرتی
رہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔

ریحانہ چوہدری.....مدوکے، رندھیر

کچھ خوشیاں ایسی ہیں کہ دل چاہتا ہے آپ کے
ساتھ شیئر کروں۔ ارجمند اور ارسلان کی ڈگریز کمپلیٹ
ہوگئی ہیں۔ ماشاء اللہ ارسلان پریکٹس کے لیے کورٹ
جانے لگا ہے سیالکوٹ اور ارجمند نے 14 اگست کے سلسلے
میں ہونے والے رائٹنگ کمپیٹیشن میں جو کراچی یونیورسٹی
کے زیراہتمام ہوا تھا۔ آل پاکستان اس میں پارٹی سپیٹ
کیا اور الحمدللہ تیسری پوزیشن لی۔ سارہ چوہدری آن لائن
کلاسز لینے کے بعد گھر میں کوکنگ اور ڈول ہاؤس کی تیاری
میں لگی رہتی ہے تو نورئی نئی کوکنگ ریسپیز ٹرائی کرتی ہے کہ
اسے روایتی کوکنگ سے کوئی خاص شغف نہیں۔ اب
پرچے کی باتیں۔

سرورق پہ سجی دلہن پیاری بہت ہی پیاری لگ رہی
تھی۔ سب سے پہلے ہمارے نام، ہر خط ہی اتنا دلچسپ
ہوتا ہے کہ دل چاہتا ہے بار بار پڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ
یہ خطوط لکھنے والی بہت سی بہنیں عنقریب بہت اچھی افسانہ
نگار کے طور پہ پہچانی جائیں گی۔ خاتون کی ڈائری کے
صفحات کمال کے تھے۔ شاعری لاجواب دل کو چھونے
والی۔ بہت خوب صورت انتخاب۔ شگفتہ جاہ آپ کی جلی
ہوئی روٹی نے بہت متاثر کیا۔ ہمارے حسب حال معاملہ
تھا۔ میری بیاض کے اشعار بہت سے دلوں کی داستان سنا
رہے تھے۔ کوثر خالد نے بہت مدت کے بعد شرکت کی
بہت اچھا لگا۔

شازیہ الطاف ہاشمی ماشاء اللہ باقاعدگی سے لکھ رہی
ہیں۔ ان کی تحاریر میں نکھار آرہا ہے۔ حمیرا عروش کاش
دل توڑنے والے بھی یہ سوچ لیا کریں کہ تلافی ممکن نہیں

ہوتی۔

یاد آیا پہلے اسماء رضوان بھٹی، نویلہ کی بیٹی اور نویلہ کون؟ بھئی میری دیورانی اس کا شکوہ آپ تک پہنچانا ہے کہ اس نے بڑے مان سے کہا تھا۔ پلیز ناولز کی اقساط مت مس کیا کریں۔ تو آپ کی خدمت میں اسما کا شکوہ پیش کیا جاتا ہے۔

فائزہ بھٹی کا افسانہ بیٹی کے نام انتہائی پراثر تحریر تھی۔ گل ارباب کا مکمل ناول ایثار و وفا۔ محبت کے گداز صبر و قناعت برداشت و حوصلہ اور قربانی کے جذبات سے مزین بہت ہی پیاری تحریر تھا۔

پرانے سلسلے ختم کرنے کا سوچیے گا بھی مت کہ یہ سلسلے تو رونق ڈائجسٹ ہیں۔ عمار مسعود کا مضمون خواتین رائٹرز کی کہانی۔ بہت اچھا مضمون تھا۔

ج: پیاری ریحانہ! ہماری طرف سے ارجمند، ارسلان، سارہ اور نور کو ان کی شاندار کامیابیوں پر مبارک باد۔ ماشاء اللہ آپ کے بچے ذہین اور ٹیلنٹڈ ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ان کی کامیابیوں کا سفر اسی طرح جاری رہے آمین۔

نویلہ کی بیٹی اسماء رضوان کو پورا مہینہ انتظار کے بعد 'رنگ ریز میرے' کی قسط نہ پا کر کوفت ہوئی۔ قسط شامل نہ ہو تو ہمیں بھی بہت کوفت ہوتی ہے یقین کریں کہ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ ناول کی قسطیں ضرور شامل ہوں۔ مصنفین کو بار بار فون کرتے ہیں۔ پرچے کی آخری کاپی پریس جانے تک انتظار کرتے ہیں، بسا اوقات تو ناول کی قسط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر چا بھی لیٹ ہو جاتا ہے۔ ہم ان سطور کے ذریعے آپ کا پیغام مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

افسانہ ''تلافی'' حمیرا عروش نے نہیں حمیرا اشفیع نے لکھا تھا۔ سہو! حمیرا عروش کا نام شائع ہو گیا۔

حمیرا اشفیع..... صادق آباد سے لکھا ہے

سرورق کی من موہنی سی دلہنیا نے دل موہ لیا۔ دو صفحے پلٹ کر فہرست پر نظر دوڑائی تو چونک گئی۔ ہیں یہ کیا؟ ''تلافی'' کے عنوان سے افسانہ تو میں نے بھی بھجوایا تھا جھٹ صفحہ نمبر 62 کھول کر پڑھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ تحریر تو بلاشبہ میری ہی تھی مگر نام حمیرا عروش صاحبہ کا لکھا ہوا تھا۔

یقین کریں، جونہی آپ کے سلسلے ''ہمارے نام'' یا پھر ''خط آپ کے'' تک پہنچتی ہوں تو طبیعت ہشاش بشاش سی ہو جاتی ہے۔ خطوط پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔

سب سے پہلے تو میں ریحانہ آپی کی بہت ممنون ہوں۔ افسانے کی تعریف اور پراٹھوں کی ترکیب دونوں کے لیے بہت بہت شکریہ۔ ماشاء اللہ سے غذا و خوراک کے بارے میں ان کی معلومات قابل رشک ہیں۔ اپنے خطوط میں چھوٹے چھوٹے آزمودہ ٹوٹکوں سے نوازتی رہا کریں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے مگر فاخرہ جبین اور فائزہ بھٹی کا پڑھتے ہوئے آنکھیں بھیگ گئیں۔

شازیہ جمال نے بھی بہت اچھا لکھا۔ گل ارباب کا ناول مزاح کا عنصر لیے ہوئے اچھی تحریر تھی۔

شاہین باجی نے خرم سہیل سے خوب ملاقات کروائی۔

''آپ کا باورچی خانہ'' میں عطیہ بتول صاحبہ کی کھانا پکانے میں سادگی دل کو بہت بھائی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ماشاء اللہ سے کافی خوش خوراک بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔

''نفسیاتی الجھنوں'' میں بہن نوشین کے مسئلے نے حیران و پریشان کر دیا۔ کیا مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں.....؟ لیکن آپ تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور ایک ماں بھی انسان ہی ہوتی ہے۔ اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ خدا کے ہاں بھی ہر گناہ کی معافی ہے سوائے شرک کے۔

ہمارے معاشرے کا ایک دوغلا پن یہ بھی ہے کہ مرد کی بے وفائی کو تو دنیا والے حتیٰ کہ اس کے اپنے بچے تک با آسانی فراموش کر دیتے ہیں۔ مگر ایک عورت کی بے وفائی اس کی قبر تک ساتھ جاتی ہے۔

عدنان بھائی نے بہت اچھا مشورہ دیا کہ وہ اپنی ماں کے ماضی کا حساب کتاب خدا پر چھوڑ دیں اور حسب استطاعت ان کی خدمت کریں۔ اگر ان کے والد صاحب خرچا دینا نہیں چاہتے تو وہ اپنے جیب خرچ سے

ا ی مدد کرسکتی ہیں۔

ج: ! ۔پیاری حمیرا! آپ کو اپنے افسانے پر حمیرا ، ش کا نام دیکھ کر جو تکلیف پہنچی اس کے لیے معذرت واہ ہیں۔

آپ کا باورچی خانہ کا سلسلہ عطیہ بتول نے نہیں کوثر نالد نے لکھا تھا۔

غلطی کسی کی بھی معاف نہیں ہوتی۔انسان معاف بھی کردے تو وقت سزا دیتا ہے۔ان خاتون کو سزا ان کے شوہر نے نہیں دی۔وقت نے دی وہ واپس لوٹیں تو وقت آگے نکل چکا تھا۔شوہر گھر بسا چکے تھے۔اگر شوہر بے وفائی کرتا اور خاتون دوسری شادی کر کے گھر بسا چکی ہوتیں تو شوہر کو بھی یہ سزا بھگتنا ہوتی۔

ہاجرہ عمران.....لاہور

سب سے پہلے کہنی سنی پڑھ کر دل درد سے بھر گیا۔ یہاں بارشوں سے ہونے والی تباہی نے ہر حساس دل پاکستانی کو درد میں مبتلا کیا ہے۔میری ایک رائٹر دوست کی پانچ سالہ تحریروں کا ریکارڈ ضائع ہوگیا،جس کی وجہ سے وہ صدمے کا شکار ہیں۔گوشی جمال کی بے ساختگی دل کو بھا گئی۔

اس بار بیوٹی بکس کے لیے ضرور کچھ کہنا چاہوں گی وہ یہ کہ دنیا کے سارے ٹوٹکے اور بیوٹی چینلز ایک طرف اور بیوٹی بکس دوسری طرف،آج تک جتنے بھی ٹوٹکے،میک اپ اور ایکسرسائز اس کالم میں بتائی جاتی ہیں اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔اکثر و بیشتر ٹوٹکے میں نے خود آزمائے ہیں اور فیملی میں بھی بتائے ہیں۔سب کے سب کارآمد اور آزمودہ۔آزمائش شرط ہے۔

نفسیاتی الجھنیں میں بہن نوشین رضا کی طویل کہانی پڑھی،جسے پڑھ کر بے ساختہ زبان پر یہ مصرعہ آ گیا۔ ''اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا'' انجام پر نوشین کی حالت کے بارے میں پڑھ کر دل دکھی ہوگیا۔

عطیہ بتول کا باورچی خانہ سادگی کا منہ بولتا ثبوت مگر یہ کیا کہ اگست اور ستمبر دونوں مہینوں کے باورچی خانہ پر عطیہ بتول کا نام جبکہ دونوں کچن کے احوال الگ الگ ہیں۔

گل ارباب کا مکمل ناول ''من کا پپیہا'' زبردست رہا۔گل کی تحریر کا آغاز ہنسانے والا اور ہلکا پھلکا تاثر لیے ہوتا ہے جو بعد ازاں اس قدر سنجیدہ رخ اختیار کرلیتا ہے کہ بے ساختہ آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔

''قصہ ایک ساون کا'' فاخرہ جبیں نے شمو کے دل پر اترتی برسات کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ج: پیاری ہاجرہ! آپ تو پہلے افسانہ نگار کے درجے پہ فائز ہوئیں پھر ہماری محفل میں شرکت کی۔آپ کے افسانے زیرغور ہیں۔

مفصل اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔آپ کا باورچی خانہ یہ سلسلہ کوثر خالد نے لکھا تھا۔سہواً عطیہ بتول کا نام لگ گیا۔

صدف ناصر.....گوجرانوالہ

ٹائیٹل ماشاءاللہ سے بہت بہت پیارا ہے۔کمال کی جیولری پہنی ماڈل گرل نے ''کہنی سنی'' میں شامل ہوئے۔ کراچی کی گرمی،ساون،بارشیں،سیاست!یاالٰہی سب پر نظرکرم فرمادے۔(آمین)

پسندیدہ ترین سلسلے ''ہمارے نام'' کی طرف بڑھے۔واہ جناب اس ماہ میں کافی بڑے بڑے نام شریک محفل ہیں۔ہاجرہ عمران،کوثر خالد،ریحانہ چوہدری،ویلکم بیک۔دلی خوشی ہے آپ کی حاضری کی۔ گوشی جمال ہماری پیاری بہن۔اللہ آپ کو خوشیاں نصیب کرے۔''بیٹی کے نام'' انتہائی پرسوز سچی کہانی بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔فاخرہ جبیں ساون کا قصہ لے کر تشریف لائیں۔مگر افسوس یہ ساون ہمیں سیراب نہ کرسکا۔فاخرہ اور راحت کے پچھلے تمام ساون شدت سے یاد آتے رہے۔

مگر جو قصہ دادی جان نے سنایا،پڑھ کر دیر تک ہنستے رہے۔ویل ڈن جویریہ ادارہ خواتین سے گزارش ہے ہر ماہ اسی طرح زیادہ افسانے ہمیں گفٹ کیا کریں۔

افسانوں کی دنیا کو خیرباد کہتے ہوئے مکمل ناولز کے ایریا میں گئے۔گل ارباب ''من کا پپیہا'' سناتی ہوئی دکھائی دیں۔متاثر نہیں کر پائی یہ اسٹوری۔بہت معذرت۔

آسیہ رزاقی یاد آتی رہیں۔ آسیہ رزاقی کے جانے سے بہترین فیملی اسٹوریز سے ہم محروم ہوگئے۔ اللہ پاک تمام مرحوم مصنفین کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

ناولٹ میں شازیہ جمال بازی لے گئیں۔ سچ ہے جی! ایسی ہٹ دھرم عورتیں ہوں تو گھروں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

خاتون کی ڈائری میں ثوبیہ قطب، حمدہ خان، وکٹری اسٹینڈ پر تھیں۔ ''خامشی کو زباں ملے'' کے سوالات تبدیل کردیں پلیز۔

عدنان بھائی کو سالوں سے الجھنیں سلجھاتے دیکھ رہے ہیں۔ بہنوں کے مسائل پڑھ کر دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔

ج: پیاری صدف! تفصیلی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔ معذرت کہ آپ ہر ماہ اتنا اچھا اور مفصل تبصرہ کرتی ہیں اور صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہم شائع نہیں کر پاتے ہیں۔ بہرحال ایک بات کا یقین دلا دیں کہ ہم آپ کے تبصرے کا ایک ایک لفظ پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

رانی سونیا.....لوئر دیر

خواتین اور شعاع کا ساتھ 2004ء سے ہے میرا دل بہت چاہتا ہے کہ میں بھی ہر ماہ شریک محفل رہوں لیکن ایک تو ڈائجسٹ بہت دیر سے ملتا ہے اور پھر خط پوسٹ کرنے کا مسئلہ۔ ایک دن میاں جانی سے دلار سے کہا ایک بات مانو گے کیا۔

''کیوں نہیں، تم کہو تو'' میں نے کہا۔ ''میرا خط پوسٹ کردیں۔''

انہوں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا کہ ہم بے چارے ویسے ہی سہم گئے، اس پر فرمایا کہ خط کے ساتھ اپنی تصویر بھی بھجوادو۔ سوچپ سادھ لی۔

''کہنی سنی'' اور ''کرن کرن روشنی'' سے جی بھر کر مستفید ہوئے۔ انشاء جی کی تو بات ہی کیا ہے۔ خطوط میں فرزانہ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر فریال کا خط بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ ''تتلی جیسا پیار'' راحت جبیں پلیز زیبی کے ساتھ کچھ اور برا مت کرنا۔ (میں ابھی یہی سطر لکھ رہی تھی کہ میرے قریب ایک موٹا تازہ چوہا آ گیا۔ میں نے سب کچھ پھینک کر جو چیخ ماری تو پورا گھر جمع ہوگیا۔ ساس، جٹھانی، دیورانی، نندیں اور چاروں بچے ''کیا ہوا؟'' کا نعرہ لگا کر حاضر ہوگئے۔ ارے بھئی چوہا تھا یہیں تھا میں بیڈ پر چڑھ گئی تھی۔ ساس نے جھاڑو اور جٹھانی نے ڈنڈا اٹھالیا۔ چوہا بھاری فرنیچر کے نیچے۔ کبھی الماری کھسکاؤ۔ کبھی بیڈ۔ خوب دوڑیں لگوائیں۔ میاں جانی کو فون کیا ارے جلدی آؤ۔ وہ بچارہ گھبرا گیا، لیکن صورت حال سمجھ کر اطمینان سے فون کاٹ دیا۔ اور میری تو پیرون سے ذرا نرم چیز چھوتی اور میں چیخ مارتی۔ سب ہنسی سے لوٹ پوٹ، بھئی چوہے سے اتنا ڈرنا۔ سارا کمرہ الٹا لیا اسی کشمکش میں دو گھنٹے ضائع کیے۔)

شازیہ جمال کا ''یہ راستہ کوئی اور ہے'' بہت اچھی تحریر تھی۔ نعیمہ ناز نے ہنستے ہنستے میں بہت ہنسا دیا۔ اور جب میں ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنستی ہوں تو بچے گھٹنے ہلا ہلا کر پوچھتے ہیں آپ کیوں ہمیں بھی بتاؤ۔ اب دس اور آٹھ سالہ بچوں کو کیا بتاؤں کہ کیوں ہنسی۔ فرزانہ کھرل کی اجنبی کون ہو تم لاجواب تحریر تھی۔ خواتین ڈائجسٹ کی سب رائٹرز نے خواتین ریڈرز کو آیت کی طرح بنانا چاہا ہے اور بلاشک وشبہ آپ اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب رہی ہیں۔ حالم کو میں بھی ناہید اسماعیل کی طرح ایک ایک سطر سانس روک کر پڑھتی ہوں۔ خاتون کی ڈائری میں حبیبہ خان اور ثوبیہ قطب کی غزلیں پسند آئیں۔ نفسیاتی الجھنیں میں ناصرہ جہاں صاحبہ آپ کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں بس کسی نیک آدمی کا ہاتھ بسم اللہ کر کے تھام لیجیے۔ یقین مانو خوش رہو گی۔

ج: پیاری سونیا! چوہے کو دیکھ کر آپ نے خوب اچھل کود مچائی۔ اور بھئی یہ کون کہتا ہے کہ چوہے سے کیا ڈرنا.....؟ بے شک چوہے بزدل ہوں۔ ہم سے ڈرتے ہوں لیکن چوہے کو دیکھ کر ہماری تو جان نکل جاتی ہے۔

ہماری محفل میں شرکت کے لیے آپ نے میاں صاحب کی گھوری برداشت کی۔ اس محبت کے لیے ہماری طرف سے بھی بہت سارا پیار۔

بقیہ صفحہ نمبر 245 پر

جنون
پاکستان
جمعہ سے اتوار
رات 8:00 بجے
گستاخ
جمعرات
رات 8:00 بجے
KASOOR
ONLINE
Hosted By Ahmed Ali Butt
ہفتہ
رات 9:00 بجے
express

عفت سحر طاہر

رنگ دے تیرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

نرمین کی سہیلی سجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا نے جانے کی اجازت

دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔

نرمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ سجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں سجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے نرمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں نرمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں سجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ نرمین بے یقین ہوتی ہے۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ولیمے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔

سجل نرمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے نرمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ نرمین کو برا لگتا ہے۔

نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ نرمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔

نرمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ نرمین، سجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔

عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر نرمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ نرمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

نرمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے نرمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر سجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔

نرمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، نرمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔

عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو نرمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔

مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔

نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔

حریم عباد وسیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ نرمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

مارک ڈینیئل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکی سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ نرمین گھر میں نہیں ہوتی۔

حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔

عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد نرمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد نرمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔

عباد نرمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے فریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر نرمین شادی کی ہامی بھر لیتی

ہے۔نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔سجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پرو پوز کرتا ہے۔زمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔

رات میں حریم نریم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کرلو۔وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کرلوں۔پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پرو پوز کیا ہے۔دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

گیارہویں قسط

زیاد کے واپس جانے کے دن قریب تھے،اس کے لیے نزہت اور عباد کے بیچ کی دوریاں ناقابل قبول تھیں سو اس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ جانے سے پہلے ان دونوں کے مابین موجود فاصلے ختم کروا کے ہی جائے گا لیکن اسے پتا تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا آسان کام نہیں ہے۔

''ڈیڈ! آپ کیوں نہیں سمجھاتے مما کو۔سب کچھ کتنا ابنارمل چل رہا ہے۔گھر کا بیٹا بے گھر ہوا بیٹھا ہے۔کئی لوگ پسند کی شادیاں کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بچوں کو ساری عمر کے لیے خود سے جدا کر دیا جائے۔''

اس نے پہلے وسیم صاحب کے آفس میں کافی پینے کے دوران انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی تھی۔

''بچے غلط کام کریں تو انہیں سزا دینا ضروری ہوتا ہے برخوردار!''

''لیکن اب تو پتا چل چکا کہ عباد نے ایسا بھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔لڑکی باوفا ہے۔اچھے طریقے سے اس کا گھر سنبھالے ہوئے ہے۔ایک پیاری سی بیٹی کے ساتھ وہ بہت ہیپی لائف گزار رہا ہے۔''زیاد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے کہ من مرضی کرنے والے تو اکثر ہی ہیپی لائف گزارتے پائے جاتے ہیں۔مسئلے تو ان کے پیچھلوں کے لیے بنتے ہیں۔جو رشتہ داروں کو جواب دہ ہوتے ہیں۔''

''ڈیڈ پلیز! اب تو اس ''خاندان فوبیا'' سے نکل آئیں آپ لوگ۔معاملے کو غیر جانب داری سے دیکھیے۔گیا وقت واپس نہیں لوٹ کر آسکتا۔عباد نے جو کرنا تھا وہ کرلیا،وہ خوش بھی ہے۔گھر ملنے آرہا ہے آپ سے باقاعدگی کے ساتھ،تو آپ لوگوں نے کیوں اپنی اچھی بھلی چلتی زندگی کو اسی ایک پوائنٹ پہ روک رکھا ہے۔کچھ عرصے میں مائرہ بھی سیٹل ہو جائے گی۔بھول بھال جائے گی یہ سب۔آپ لوگ تب بھی بیٹے بہو اور پوتی کو خود سے دور کیے رکھیں گے؟''

''یہ سب تم اپنی ماں کو سمجھاؤ۔اسی کو بھائی اور بھتیجی کا غم کھا رہا ہے۔یہ عورتوں کے معاملات ہوتے ہیں۔گھر کا ماحول انہوں نے مل کر بنانا ہوتا ہے۔ہم تو شام کو گھر جاتے ہیں۔ہمیں تو بس پرسکون ماحول سے غرض ہے۔''

ان کا اپنا ہی نظریہ تھا،زیاد نے سر تھام لیا۔

''پرسکون ماحول بنانے کے لیے اگر مرد کو بھی اپنا حصہ ڈالنا پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔والد محترم! اگر مما کو اپنی بھتیجی کا غم ہے تو کیا مجھے اپنی بھتیجی کو اپنے گھر سے دور پلتے دیکھ کر دکھ نہیں ہوا؟''اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

''چلو،دیکھتے ہیں۔تم ڈال رہے ہو نا حصہ۔لگ پتا جائے گا،کتنا پرسکون ماحول بنتا ہے تمہاری کوشش سے۔''وہ اس کے انداز پر مسکرائے تھے،زیاد خفا سا اپنی کافی ختم کرنے لگا۔

''تم اپنی بات کرو۔تم کب تک شادی کا ارادہ رکھتے ہو؟''انہوں نے دلچسپی سے پوچھا،زیاد کے ساتھ ان سب کا تعلق الگ ہی تھا بوجوہ کہ وہ اپنی دادی کی گود میں پلا بڑھا تھا۔

''پہلے ایک کا مسئلہ تو حل ہو لینے دیں، ورنہ سوچا تو یہی تھا کہ اسی سال میں بھی اس بحر بیکراں میں کود پڑوں گا'' وہ کافی کا خالی مگ رکھتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''اسے چھوڑو۔ تم گھر میں رونق شونق لگاؤ کچھ۔ باقی مسئلے مسائل تو ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔''

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ عباد اور اس کی بیوی کو گھر بلا لیں۔ ختم کریں اس خود ساختہ ناراضی کو۔ پھر دیکھیے آپ کی پوتی کتنی رونق لگاتی ہے آپ کے گھر میں۔ لیکن آپ لوگ تو بس..... دنیا کو راضی اور خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔'' وہ کلسا۔ وسیم صاحب مسکرا دیے۔

''چلو۔ دیکھتے ہیں اس مسئلے کو بھی۔ ظاہر ہے مستقل حل تو نکالنا ہی ہوگا۔''

''شکریہ۔ مہربانی۔'' وہ میز پر سے گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھاتے ہوئے جانے کو تیار ہوا تھا۔

☆☆☆

''ہے..... کیتھ..... لسن.....'' وہ اسلامک سینٹر سے نکل کر عائشہ کو خدا حافظ کہتی تیز قدموں سے چل کر فٹ پاتھ پر آئی ہی تھی کہ جانی پہچانی تیز آواز نے اس کا وجود سنسنا دیا۔ اس نے قصداً اس پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے سر جھکا کر اپنے قدموں کی رفتار اور تیز کی لیکن مارک دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا، ناچار کیتھی کو رکنا پڑا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔ ہٹو میرے سامنے سے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم اسلامک سینٹر کیوں گئی تھیں؟'' مارک نے سختی سے پوچھا، وہ یقیناً اسے عائشہ کے ساتھ اسے دیکھ چکا تھا۔

''اٹس نن آف یور بزنس (یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے) ہٹو سامنے سے۔'' کیتھی بھڑکی۔

''میرا نہیں لیکن یہ تمہارے باپ اور بھائی کا مسئلہ ضرور ہو سکتا ہے۔ خاصی دلچسپ لگے، یہ بات ان کو۔'' مارک خباثت سے اسے دھمکاتے ہوئے بولا۔

''تم چاہو تو ہیون میں جا کر میرے باپ کے باپ کو بھی یہ بات بتا سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' کیتھی نے دانت پیس کر کہا اور سائیڈ سے ہو کر آگے نکل گئی۔

''لیکن ہماری کمیونٹی کے لوگوں کو ضرور ہی اس سے فرق پڑے گا، کیتھ! تم کو معافی نہیں ملے گی۔ کیا تم اسلام سے متاثر ہو رہی ہو؟''

وہ اسے پوری طرح سے ہراساں کرنا چاہتا تھا اور کیتھی ہراساں تو نہیں لیکن اس کی بات سے خائف ضرور ہو گئی۔

''بکواس بند کرو..... اور جاؤ، جس کو جو بتانا ہے، بتا دو..... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب جانتے ہیں، تم مجھ سے کتنا بغض رکھتے ہو۔''

کیتھی نے حقارت سے کہا، وہ کمزوری دکھا کر مارک کو خود پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہتی تھی، اس کے انداز نے مارک کو نروس کر دیا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا وہیں کھڑا تھا۔ کیتھی موقع غنیمت جان کر دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتی فوراً ہی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گئی۔

مارک نے پرسوچ نظروں سے ٹیکسی کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دل میں یقیناً شک جڑ پکڑ چکا تھا۔

☆☆☆

کالج سے نکلتے ہی وہ تیز قدموں سے دوسرے گیٹ کی طرف بڑھی جہاں سے گلی میں نکل کر آگے روڈ پہ اس کی وین کھڑی ہوتی تھی جب کسی نے بڑے بے ڈھنگے انداز میں اپنی بائیک اس کے سامنے روکی حریم نا صرف

ایک جھٹکے سے رکی بلکہ اس کے منہ سے چیخ بھی نکل گئی۔

''ڈر گئی.....؟ میں ہوں پگلی!'' زلفی نے دانت نکوستے ہوئے ڈارک سن گلاسز ماتھے پہ چڑھائے۔

''یہ کیا بدتہذیبی ہے؟ بیچ سڑک پہ ایسے روکتے ہیں کسی کو۔'' حریم کو سخت غصہ آیا۔

''ہا.....ہا.....'' وہ بے ڈھب انداز میں ہنسا۔

''کسی کو یا اپنی منگیتر کو؟'' اس نے اپنے ہی لفظوں کا گویا مزہ لیا تھا۔ حریم غصے سے لال چہرہ لیے سائڈ سے ہو کر گزرنے لگی تو زلفی نے پیروں کے زور سے بائیک دھکیل کر اس کے آگے کی۔

''ڈیڑھ گھنٹے سے تمہارے کالج کے باہر کھڑا انتظار کر رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ اپنی منگیتر کو کہیں گھمانے لے جاسکوں اور تم یوں نخرے دکھا رہی ہو۔''

''ایک تو یہ فضول میں منگیتر منگیتر کا راگ الاپنا بند کرو۔ دوسرے یہ کہ میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا رہی۔'' حریم سرتاپا چیختی اور بھنچے ہوئے لہجے میں اسے گھر کا۔

''ارے واہ..... بڑی جلدی بھول گئیں سونے کی انگوٹھی پہنا کر منگیتر ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے.....تو اب انسان فائدہ بھی نہ اٹھائے۔ بکواس بند کرو اور چپ چاپ بائک پہ بیٹھو۔'' زلفی بھی تنک کر بولا تھا۔ حریم کا دل چاہا سونے کا وہ چھلکا سا چھلا اتار کے زلفی کے منہ پہ دے مارے تاکہ وہ بھی دیکھ سکے کہ ایسے کون سے ڈائمنڈ لگے ہوئے ہیں اس میں۔

''میری وین دوسرے گیٹ پہ کھڑی ہوتی ہے زلفی! تم خوامخواہ مجھے دیر کروا رہے ہو۔ ڈرائیور انتظار کر رہا ہوگا۔''

''کرنے دو انتظار.....آج تم میرے ساتھ ہی جاؤ گی۔ پہلے سیر اور پھر گھر۔'' وہ ہٹیلے انداز میں بولا۔

''شٹ اپ۔'' حریم برہمی سے اسے جھڑک کر آگے بڑھی تو زلفی نے غصے سے اس کا بازو کھینچا نا صرف وہ اپنی جھونک میں لہرا کر رہ گئی بلکہ اس کے ہاتھ میں موجود فائل بھی زمین پہ جا پڑی۔ زلفی آس پاس موجود رش کی پروا کیے بنا بائیک سے اتر آیا تھا۔ حریم کی رنگت سب کے بیچ بے عزتی کے خوف سے زرد پڑی۔

''اوئے۔ کب سے دیکھ رہا ہوں میں..... کیوں بچی کو تنگ کر رہے ہو؟'' ایک باریش لیکن تگڑے سے آدمی نے زلفی کا گریبان پکڑا اور غصے سے بولا۔ وہ بھی اپنی بہن بیٹی کو، کالج سے پک کرنے آیا ہوگا۔ ایسے لوگ تو ان واقعات کے بارے میں اور بھی جذباتی ہوتے ہیں۔ حریم جلدی سے پیپر سمیٹ کر فائل میں لگانے لگی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ ایک ہی پل میں یہاں سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔

''کیوں.....تمہاری کیا لگتی ہے جو تمہیں مروڑا اٹھ رہے ہیں؟'' زلفی نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا لیکن غلط موقع پر۔ یہ اس کا محلہ نہیں تھا جہاں اس کی یہ زبان سن کر لوگ عزت بچا کر نکل لیتے تھے۔ یہاں تو فوراً ہی اسے کان کے نیچے ایک ہاتھ بجا۔

''بکواس کرتا ہے.....تیری تو.....''

''کیا ہوا؟ لڑکی کو چھیڑا؟ مارو اسے۔'' آس پاس بہنوں کو لینے آئے لڑکے گویا ثواب سمجھ کر اس کارِ خیر میں شامل ہوئے۔ حریم مارے خوف اور دہشت کے سر جھکائے تیز قدموں سے گیٹ پار کر کے گلی میں نکل گئی۔ اب زلفی نے کس طرح ہاتھ پیر جوڑ کے اپنی جان بچائی۔ یہ وہی جانتا تھا۔ پھٹروں سے لال چہرہ، پھٹا ہونٹ لیے وہ بائیک پہ نکل بھاگا۔

''ہائے..... یہ کہاں سے اتنی چوٹیں لگوا کے آ گیا میرا بچہ! ایکسیڈنٹ ہوا ہے کیا؟'' زاہد نے دیکھتے ہی کہا۔

''ایکسیڈنٹ نہیں ہوا اماں! وہ سالی..... تمہاری بہو کو کالج سے اٹھانے گیا تھا۔ اس نے مار پڑوائی ہے اپنے ہوتے سوتوں سے۔'' زلفی نے دانت کچکچائے اور صحن میں لگے بیسن پہ جھک کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

''ہائیں..... کیا بکواس کر رہا ہے؟'' زاہدہ ششدر ہوئیں۔ ''کسے اٹھانے گیا تھا کالج سے؟'' زلفی تولیے سے اپنا چہرہ تھپتھپا کر خشک کرتا ماں کی طرف آیا۔

''وہی۔ تمہارے بھائی کی بیٹی۔ تمہاری ہونے والی بہو۔ بڑی غیرت والی بن رہی تھی۔ مجال ہے جو بچایا ہو مجھے۔ الٹا بھاگ لی وہاں سے۔'' زاہدہ منہ کھولے متحیر سی سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''حریم کے کالج گئے تھے تم؟''

''ہاں۔ ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا، اسے گھر چھوڑ دوں گا۔ یہ صلہ دیا اس نے میری نیکی کا۔'' زلفی نے مظلوم بن کر اپنے لیرو لیر حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں ضرورت ہی کیا تھی یہ نیکی کرنے کی۔ الٹا مار کھا کے آ گیا۔'' زاہدہ نے اسے گھرکا۔

''تمہاری بھتیجیاں نا اماں! بہت چھوئی موئی بنتی ہیں۔ دوسروں کے ساتھ چاہے گل چھرے اڑاتی پھریں گی۔ زلفی کے ساتھ پھرنے پر اپنا دین ایمان پیارا ہو جاتا ہے ان کو۔'' وہ تلملا رہا تھا۔

''آئے ہائے..... تو تم ہی صبر کر لو۔ دن ہی کتنے باقی ہیں شادی میں'' ٹکور کے لیے استری گرم کرتی زاہدہ چڑی۔

''یہ..... یہ ساری صورت حال جا کر بتاؤ ذرا ماموں ممانی کو۔ انہیں بھی تو پتا چلے ان کی یہ بیٹی بھی کن ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔'' زلفی نے اپنی حالت کی طرف اشارہ کیا تو زاہدہ بڑبڑاتے ہوئے کپڑا استری کے ساتھ گرم کر کے زلفی کی چوٹوں پہ ٹکور کرنے لگیں۔

☆☆☆

''تیرا بیڑہ ہی تر جائے حرمی!'' اماں نے حریم کی اڑی رنگت دیکھ کر استفسار کیا تو اس نے ساری بات کہہ سنائی۔ اماں نے کلیجہ تھام لیا۔

''تو کیا کرتی، نکل جاتی اس کی موٹر سائیکل پہ بیٹھ کے۔'' حریم تپی۔

''یہ کب کہہ رہی ہوں میں۔ لیکن وہاں رک کر بات تو سنبھال سکتی تھیں تم۔'' اماں کو تو ہول اٹھنے لگے، خدا جانے زلفی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اب نند جانے کیسے اس معاملے کو اٹھائے گی۔

''اماں! وہ میرے کالج کے باہر آ کر مجھے زبردستی اپنی بائیک پہ بٹھا رہا تھا۔ میں وہاں پڑھاتی ہوں۔ کتنی ہی اسٹوڈنٹس اور لوگ وہاں موجود تھے۔ زلفی کو خود شرم نہیں، آئی ایسی حرکت کرتے ہوئے۔'' حریم کا خوف اب بے بس سے غصے میں بدل چکا تھا۔

''اپنے ابا کا سوچ حریم! وہ تو طوفان مچا دیں گے۔ ان کے بھتیجے کو لوگوں سے مار لگوائی ہے تو نے۔'' اماں کی سوچ روایتی تھی۔ خاندان اور رشتے داروں کی سوچ سے بندھی۔

''اسے اس کی بدفطرتی نے مار لگوائی ہے اماں! اور کیا وہ ابا کی اجازت سے آیا تھا مجھے پک کرنے؟'' حریم نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ وہ کیوں دینے لگے اجازت۔'' اماں ناراض ہوئیں۔

''تو پھر.....؟ میں کیوں چلی جاتی اس کے ساتھ؟'' حریم تپی۔

''ساتھ جانے کا نہیں کہہ رہی ہوں۔ لیکن تم بات سنبھال بھی تو سکتی تھیں۔ کہہ دیتیں کہ میرا کزن ہے۔''

''اماں! وہ مجھے بازو سے کھینچ کر بائیک پہ بٹھا رہا تھا زبردستی۔ مار اسے اپنے کرتوت کی وجہ سے پڑی ہے۔

اب میں سب کو کہتی کہ آپ لوگ براہ مہربانی اپنا کام کریں۔ اسے زبردستی کرنے دیں میرے ساتھ کیونکہ یہ میرا کزن ہے۔'' اس کی آنکھیں ضبط، برداشت سے گلابی ہونے لگیں۔

''اوفوہ'' اماں دھیمی پڑیں۔ ''یہ کب کہا میں نے۔ لیکن اب بھی تو مسئلہ ہی بنا۔ جانے تمہارے ابا تک کیا رپورٹ پہنچے گی۔''

''پہنچنے دیں۔ آپ کو ساری بات بتا دی ہے میں نے۔ بتا دیجیے گا ان کو، ان کے بھتیجے کے کرتوت۔'' وہ ناراضی سے کہتی واش روم میں گھس گئی۔ اماں پریشان سی سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

ابا شام کو گھر آئے تو دل ہی دل میں ان سے خفا حریم پہلے ہی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گھس چکی تھی۔ ابا کے کھانا کھا کر چائے پینے تک اماں لفظوں کے جوڑ توڑ کر کی بات شروع کرنے کا طریقہ سوچتی رہیں۔

''اب کہہ دو جو اندر مچل رہا ہے۔'' ابا نے خالی کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چونکیں، پھر ذرا ہمت بندھی۔ کپ تھام کر سائڈ پہ پڑے میں رکھا۔

''زلفی آج حریم کے کالج پہنچ گیا تھا۔''

اماں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بات شروع کی تو وہ چونکے، حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''وہ کیا کرنے گیا تھا؟''

''حریم کو کالج سے لینے چلا گیا..... زبردستی۔'' اماں نے اپنی طرف سے لہجہ عام ہی رکھا لیکن مصطفیٰ صاحب کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

''حریم نے انکار کیا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی موٹر سائیکل پہ بٹھانے لگا، پاس موجود لوگوں نے مار لگا دی اس کو۔'' اماں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوری بات بتا کر گویا سانس روک لی اور نظریں ان کے چہرے پر جما دیں جو سرخ پڑ گیا تھا۔

''دو کوڑی کی عزت جو رہ گئی ہے ہماری۔ اب تو ہر کوئی اتنا ہی ہلکا لینے لگے گا نا۔'' ان کی بات اماں کو کوڑے کی طرح لگی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ہم جیسے بھی ہیں اپنے گھر پہ ہیں۔ زلفی کو سمجھائیں۔ ہماری بچیاں ایسی نہیں۔'' وہ روانی میں کہہ گئیں پھر زبان دانتوں تلے داب کر چور نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ پھیکے پڑ گئے۔

''کاش..... دعوے سے اب یہ جملہ کہہ سکتا۔''

کمرے کے باہر کھڑی حریم کا دل چاہا، محبت کرنے والے باپ کی اس قدر بے اعتباری پر دھاڑیں مار کر رو دے۔

☆☆☆

''بس کر دو مائرہ! اب اس سوگ سے نکل آؤ۔ عباد سے آگے بھی دنیا ہے، وہ تو اپنی دنیا میں خوش ہے اور تم اس کی یاد میں جوگن بنی ہوئی ہو۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس کی مائرہ نامی ایک کزن بھی ہے۔'' رابعہ نے زچ آ کر بیٹی کو سمجھایا۔

''ٹھیک تو ہوں اب۔ بھنگڑے ڈالنے سے تو رہی۔'' مائرہ نے ناگواری سے ماں کو دیکھا تو وہ دھیمی پڑیں۔

''زندگی کسی کے جانے سے تھم نہیں جاتی ماہی! آگے بڑھنے کے ہزار راستے ہیں، ایک بند ہوا تو کیا۔ دوسرا تلاش کر لو۔ بلکہ یہاں تو راستہ سامنے ہی ہے۔ تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' ان کا لہجہ آخر میں معنی خیز ہو گیا تو مائرہ چونکی۔

''کون سا راستہ؟''

''اسی لیے کہتی ہوں کہ اب ذرا حواس کی دنیا میں لوٹ آؤ، دنیا سے اپنا حصہ وصولنے کا ڈھنگ سیکھو۔ تمہاری پھپھو نے دبے لفظوں میں تمہارے اور زیاد کے رشتے کی بات کی ہے۔''

''واٹ؟'' مائرہ کو جھٹکا لگا۔ ''دماغ تو ٹھیک ہے ان کا۔'' وہ ناراضی سے بولی۔

''دماغ تو تمہارا خراب ہے۔ پاگل لڑکی! اپنے فیوچر کے بارے میں کچھ سوچو۔ نزہت کے گھر سے زیادہ تم کہاں خوش اور سکھی رہ سکو گی۔ جان چھڑکتی ہے تم پہ..... نہ ساس نند والی کھچ کھچ ہے، نہ بڑی فیملی کا جھنجھٹ۔ عباد نہ سہی زیاد سہی۔ دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں بلکہ زیاد کی تربیت تو اس کی دادی نے بہت اچھی کی ہے۔ تم سے دوستی بھی ہے اس کی خاصی۔''

''تو کیا اب اس دوستی کو بھی خراب کر دوں؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں عباد میں انوالو تھی۔'' مائرہ کا موڈ بگڑا۔

''تو تم کون ساز بردستی اس کے سر چڑھ رہی ہو۔ بیٹا! اس کی ماں خود رشتہ مانگ رہی ہے تمہارا۔ اب ظاہر ہے پہلے بیٹے ہی سے پوچھا ہوگا نزہت نے۔'' رابعہ مطمئن تھیں کہ مائرہ کا ردعمل سخت نہ تھا۔

''مجھے نہیں پتا ماما! میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔'' وہ الجھی۔

''تو اب سوچ لو۔ اسی لیے تمہیں بتایا ہے تاکہ تم اپنی سوچ کا انداز بدلو۔'' وہ مسکرائیں۔

''یہاں زندگی بدل گئی ہے۔ آپ سوچ بدلنے کی بات کرتی ہیں۔'' وہ اداس ہوئی۔ اب تو عباد کی بیٹی بھی سال کی ہونے کو تھی شاید.....

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تم بھی اب اپنی زندگی کو بدلو۔ جو اپنی زندگیوں میں مگن ہیں، تم کیوں ان کو بتا رہی ہو کہ تم ان کے پیچھے ابھی تک اپنی زندگی برباد کیے ہوئے ہو؟''

رابعہ بڑی مہارت سے چوٹ لگا کر اس کی ذہنی کیفیت بدلنا چاہ رہی تھیں اور شاید اس میں تھوڑی کامیاب بھی رہیں۔

''بھاڑ میں جائیں سب۔ میں کسی کے لیے بھی زندگی برباد نہیں کر رہی۔'' وہ حسب توقع بھڑکی۔

''ہاں تو بس۔ پھر ٹھیک ہے۔ زیاد کے لیے ہامی بھر لو۔ عباد کو بھی تو پتا چلے کہ اس گھر میں بہو کے طور پہ اصل اہمیت کس کو ملنی تھی۔'' انہوں نے ایک بار پھر سے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس کی سوچ کو نئے ٹریک پر ڈالا تو وہ چپ چاپ ان کی شکل دیکھنے لگی۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ سوچ کے ساکت پانی میں ہلچل سی لازمی مچی تھی۔

☆☆☆

زیاد کو اس پروپوزل کے بارے میں پتا چلا تو وہ گنگ رہ گیا۔

''بس اب تم عباد کی طرح انکار مت کرنا۔ میری عزت رکھ لینا۔ رابعہ بھابی سے بات کر آئی ہوں میں۔ ان کے انداز سے نیم رضامندی جھلک رہی تھی۔''

نزہت نے پیار سے اس کا چہرہ تھپتھپایا تو وہ چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں مما! مجھ سے پوچھے بغیر آپ ممانی جان سے کیسے بات کر آئیں..... یا اللہ۔'' وہ بدحواس ہوا۔

''لو..... اب تم سے بھی پوچھنا پڑے گا مجھے۔ اس خبیث نے تو چلو کوئی رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے رسی تڑا کے بھاگ گیا۔ تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے، مائرہ دوست ہے تمہاری۔''

''فار گاڈ سیک مما! مائرہ کو میں نے ہمیشہ عباد کے ساتھ سوچا ہے یا پھر اچھی دوست کے طور پہ۔ آپ

ہمارے رشتے کو گنجلک مت بنائیں۔'' وہ بوکھلا گیا۔

''اچھی دوست اچھی بیوی بھی ثابت ہوگی ان شاءاللہ۔ تم نے حالت دیکھی ہے مائرہ کی؟ اس کے ذمہ دار ہم ہیں تو اب اسے خوشیاں بھی ہم ہی لوٹائیں گے۔''

نزہت تو کسی بھی طریقے سے بس مائرہ کی مسکراہٹ اور بھائی بھاوج کا رشتہ واپس چاہتی تھیں۔ زیاد کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اس کے دل کے آسمان پہ تو ایک ہی چہرہ جگمگا رہا تھا۔ کیتھرین کا چہرہ..... اس نے بے چینی سے ماں کو دیکھا۔

''آپ اس سلسلے کو نیا رخ مت دیں مام! مائرہ آہستہ آہستہ سنبھل رہی ہے۔ میں نے بھی سمجھایا ہے اسے۔ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے ٹھیک ہو کر اپنی پسند کا فیصلہ کرنے دیں نا کہ پہلے کی طرح پھر سے اس پر اپنا فیصلہ تھوپیں۔'' نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔ نزہت ناراضی سے بولیں۔

''نہ اس پہ پہلے ہم نے فیصلہ تھوپا تھا نہ اب اسے مجبور کریں گے۔ میں نے تو بس پروپوزل دیا ہے تمہارا بھابی کو۔ اب وہ ظاہر ہے کہ مائرہ کی رضامندی کے بعد ہی ہاں کریں گی نا۔''

''یا اللہ۔'' زیاد چکرا کر رہ گیا۔

''یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں، میں مائرہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا مما! میں نے اسے کبھی اس روپ میں سوچا ہی نہیں۔''

''تو اب سوچ لو۔ بہت وقت پڑا ہے تمہارے پاس۔ بس اب میرا مان مت توڑنا زیاد! عباد نے تو میری ساری خوشیاں سارے پلان تباہ کر دیے۔ سوچا تھا اللہ نے بیٹی نہیں دی تو بیٹیوں جیسی بہو گھر لے آؤں۔ باہر سے آئی کا کیا اعتبار۔ کل کو کیا سلوک کرے۔ یہاں اپنے ہی بیٹے نے اعتبار توڑ دیا۔''

نزہت نے ٹشو سے نم آنکھیں پونچھیں۔ زیاد کے الفاظ گم ہونے لگے اس نے تو یہی سوچا تھا کہ کیتھی کے اسلام قبول کرتے ہی وہ نزہت سے اس کا ذکر کر دے گا، عباد کی وجہ سے جو بے اعتباری نزہت کے دل میں بیٹھ چکی تھی، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے نزہت سے اپنی اور کیتھی کی انوالومنٹ چھپانا پڑی لیکن اب حالات ایک دم سے ایسا پلٹا کھا گئے کہ وہ خود چکرا کر رہ گیا تھا۔

عباد کو پتا چلا تو پہلے تو وہ خوب ہی ہنسا۔

''ہنسومت۔ یہ سارا میس (گند) تمہارا ہی پھیلایا ہوا ہے۔'' زیاد اچھا خاصا تپا ہوا تھا۔

''چائے۔'' نرمین نے ٹرے رکھتے ہوئے کہا تو وہ چونکا۔

''تھینکس۔'' اس کے انداز میں ناراضی تو تھی ہی لیکن وہ نرمی بھی تھی جو نرمین کو ذہنی طور پر عباد کی بیوی ''قبول کرنے'' پر اس کے انداز میں کچھ دنوں سے در آئی تھی۔

''میں بات کروں گا مما سے۔ کیتھی کے بارے میں بتاؤں گا تو فوراً ہی مائرہ کا خیال چھوڑ دیں گی۔ وہ مائرہ کے لیے اس بار رسک نہیں لیں گی۔''

''شٹ اپ برو۔'' وہ تپا۔ ''یہ سب اتنا آسان ہوتا تو میں بھی کر لیتا۔ ان کے تو پہلے آنسو ہی خشک نہیں ہوئے۔ دوسرا اپنی اولاد یہ موجود مان۔ میں بھی توڑ دوں کیا؟''

''تو پھر چپ چاپ کھوڑی چڑھ جاؤ۔'' عباد نے طنز کیا۔

''میں کیتھی کا نام درمیان میں لائے بغیر اس مسئلے کا حل چاہتا ہوں۔ میں کسی بھی طور مما کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''یا تو تم ماں کا دل رکھ لو یا محبوبہ کا۔ اس دنیا میں یہ دونوں کام ایک ساتھ تو ہو نہیں سکتے میں نے آزما لیا ہوا

ہے۔'' عباد نے چائے کا کپ اٹھا کر زیاد کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے چھیڑا تو کپ تھامتے وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

''زلفی کو سمجھاؤ زاہدہ! حریم کالج کی ٹیچر ہے۔ عزت اور بے عزتی کا معاملہ ہے وہاں۔'' حریم اور طوبیٰ کی غیر موجودگی میں زاہدہ حریم کی شکایت لیے آئیں تو چائے پانی اماں نے ہی پوچھا۔

''حد ہی کر دی ویسے حریم نے۔ ارے اگر بچہ چلا ہی گیا تھا شوق میں اسے لینے تو آجاتی اس کے ساتھ۔ حرج ہی کیا تھا۔ منگیتر ہے، کوئی غیر تو نہیں۔'' وہ ناراض تھیں، اماں اندر ہی اندر ان کی بات پہ کڑھیں۔

''حریم اس کالج میں پڑھاتی ہے زاہدہ! اچھے برے کی خبریں یوں بھی فوراً پھیلتی ہیں۔ زلفی کو منع کرو ایسی حرکت سے جو اس کی بدنامی کا باعث بنے۔'' اپنی طرف سے اماں نے بہت نرمی اور معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا لیکن زاہدہ پھپھولوں تپیں گی، یہ انہیں اندازہ نہیں تھا۔

''اے لو۔ یہ اچھی کہی۔ اچھی خاصی مار پڑوا دی اسے لوگوں سے۔ ارے اتنا ہی ڈر تھا بدنامی کا تو چپ چاپ بیٹھ کے آجاتی زلفی کے ساتھ۔''

''تم خود ہی سوچو۔ جب سارے لوگوں کے بیچ وہ حریم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کرے گا تو لوگوں کو تو موقع چاہیے ہوتا ہے ایسے معاملے میں۔''

''زبردستی بھی حریم کی ڈھٹائی کی وجہ سے کرنی پڑی۔ اب اس میں مضائقہ ہی کیا تھا بھابی؟ طعنہ نہیں دے رہی لیکن بنا کسی رشتے کے زمین بھی تو اڑتی پھرتی تھی اس لپاڑے کے ساتھ۔ زلفی تو پھر حریم کا کزن اور منگیتر ہے۔''

زاہدہ نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے سارا حساب پورا کر لیا۔ طعنہ نہ دیتے ہوئے بھی تیر چلا ہی دیا۔ اماں کا رنگ بدلا۔

''وہ زمین تھی۔ یہ میری حریم ہے۔ ایک ماں کے سب بچوں کی سوچ ایک جیسی نہیں ہوتی زاہدہ! حریم میرے گھر تمہاری امانت ہے تو تمہارے ہی گھر بہو بن کے اترے گی۔ زلفی کو ان حرکتوں سے منع کر دو بس۔ زمین والے واقعہ کے بعد تمہارے بھائی صاحب نے بچیوں پہ کافی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ اس سے کہنا، آئندہ اگر حریم کو کالج سے لینا ہو تو اپنے ماموں سے اجازت لے لے۔ پھر حریم کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

اماں نے رسان سے کہتے بڑی خوب صورتی سے سارا ملبہ ان ہی پر گرایا تو زاہدہ منہ بنا کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئیں جس بات کی اماں اجازت دے رہی تھیں۔ وہ ناممکنات میں سے تھی۔ مصطفیٰ صاحب ایسی فرمائش پہ بھانجے کو یقیناً جوتے مارتے۔

☆☆☆

چھوٹی سی غلط فہمی کر دے گی جدا ہم کو
حالات نہ بدلیں گے، معلوم نہ تھا ہم کو
رشتوں کی ہمیں پہلے پہچان نہ تھی اتنی
کہنے کو مراسم بھی اپنے تھے بہت گہرے
اشکوں کے سوا لیکن کچھ بھی نہ ملا ہم کو

وہ اس کی کال پہ ریسٹورنٹ آ تو گئی تھی لیکن ابھی وہ پہنچا نہیں تھا تو مائرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے واپس چلی جائے۔ بھلا وہ کیوں اس کی ایک کال... اور ذرا سے اصرار پہ اس سے ملنے کو راضی ہو گئی

تھی؟ وہ اندر ہی اندر خود سے بھی خفا تھی۔ عباد ذرا دیر میں ہی پہنچ گیا۔ وہ بے خودی سی اسے اپنی ٹیبل کی طرف آتے دیکھتی رہی۔ بلیو جینز اور وائٹ ٹی شرٹ میں وہ پہلے سے بے حد کھلا اور نکھرا ہوا سا تھا۔ جیسے کوئی غم اسے کبھی چھو کر نہ گزرا ہو۔

''ہیلو..... ہیلو..... سوری بھئی..... لیٹ ہو گیا۔ کچھ کسٹمرز ڈیل کرنے پڑ گئے تھے خود۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتا اس کے سامنے والی کرسی پہ براجمان ہو گیا۔

''کیسی ہو؟ کافی طویل عرصے کے بعد ملاقات ہو رہی ہے ہماری۔'' وہ جیسے پچھلی ساری باتیں بھلا چکا تھا مائرہ ڈبل مائنڈڈ ہونے لگی۔ اب اس سے ناراضی جتاتی یا وہ کام پوچھتی جس کے لیے عباد نے اسے یہاں بلایا تھا۔

''یہ عرصہ مزید طویل بھی ہو سکتا تھا لیکن مما کا خیال تھا چونکہ اب اس گھر سے میرا ایک نیا رشتہ جڑنے جا رہا ہے تو مجھے ہونے والے ''جیٹھ جی'' کی بات سننے ضرور جانا چاہیے۔'' وہ بڑے دل جلانے والے لہجے میں بولی تھی۔ عباد اس کے انداز پر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''واؤ..... جسٹ امیزنگ۔ تم نے تو اس عرصے میں کافی امپروومنٹ دکھائی ہے۔''

''شٹ اپ۔'' مائرہ سلگی۔

''اچھا بس۔ لڑنے کی نہیں ہو رہی۔ میں نے اتنے عرصے بعد تمہیں اس کام کے لیے یہاں نہیں بلایا۔ کیا آرڈر کروں؟'' وہ اپنی مسکراہٹ کو گویا سیز فائر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ٹیبل پر سے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کھانا میرے گھر بھی بنتا ہے الحمدللہ۔ تم وہ بات بتاؤ، جس کے لیے مجھے کال کی تھی۔'' وہ بے حد رکھائی سے بولی۔

اس کے اٹل انداز کو دیکھتے ہوئے عباد نے مینیو واپس ٹیبل پر ڈال دیا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے مائرہ کے چہرے پہ نظر جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''تم زیاد کے پروپوزل کے لیے انکار کر دو۔'' چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ بھی کیا جھٹکا لگاتا ہو گا۔ جو جھٹکا عباد کی اس بات سے مائرہ کو لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ بلکہ اس سارے معاملے سے تعلق ہی کیا ہے تمہارا؟'' وہ بھڑکی۔

''میرا تعلق کیوں نہیں۔ میرا بھائی ملوث ہے اس معاملے میں۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔ مائرہ چونکی۔

''تمہیں زیاد نے کہا ہے یہ بات کرنے کو؟''

''نہیں۔'' عباد نے سچائی سے بتا دیا۔

''تو پھر؟'' مائرہ نے اندر ابلتے تلملاہٹ کے طوفان کو دباتے ہوئے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''تو پھر یہ کہ تمہارا اس کا کوئی میچ نہیں۔ تم اس کے ساتھ زندگی میں سروائیو نہیں کر سکتیں۔ تم اور نیچر کی بندی ہو۔'' وہ آرام سے کہہ رہا تھا۔

''اتنا جانتے ہو مجھے؟'' وہ چیخی۔ ''اتنا ہی احساس ہو رہا ہے میرے سروائیول کا تو تم نے کیوں چھوڑا مجھے؟ اور اب جب میں زندگی میں آگے بڑھنے کا سوچ چکی ہوں تو پھر سے میری راہ کھوٹی کرنے آ گئے ہو..... ہمدرد بن کے۔'' وہ غصے سے لال ہو گئی۔

''ٹھنڈے دماغ سے سوچو گی تو میری شکر گزار ہو گی مائرہ! مما کے کہنے پہ تم سے جبراً شادی کر کے بھی میں تین کے ساتھ سائڈ افیئر رکھتا تو یہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوتا جو کہ میں اپنی پیاری سی کزن اور اچھی دوست ہونے

کے ناتے تمہیں دینا نہیں چاہتا تھا۔'' عباد نے اسے سمجھایا۔
''بہت خوب۔'' مائرہ نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔
''اور اب..... اب تمہیں کیا تکلیف ہے اس ہونے والے رشتے سے۔''
''مجھے کیوں تکلیف ہوگی بھلا۔ الحمدللہ ہیپی لائف گزار رہا ہوں اپنی فرسٹ لیڈی اور لٹل پرنس کے ساتھ۔'' وہ بے حد طمانیت سے کہتا مائرہ کے دل کو دکھا گیا۔
''تو وہ خود انکار کردے اگر اسے اتنا ہی اعتراض ہے اس رشتے پر تو..... وہ کون سا دودھ پیتا بچہ ہے۔'' مائرہ تلملائی۔
''وہ نہیں کرے گا۔ مما کا تمہاری طرف رجحان اور محبت تم جانتی ہی ہو۔ میں نہیں چاہتا ایک ان چاہے رشتے میں بندھ کر تمہاری زندگی خراب ہو۔''
عباد نے صاف گوئی سے کہا تو مائرہ چپ رہ گئی۔ درحقیقت اسے تکلیف ہوئی تھی۔ عباد کی بات سے صاف ظاہر تھا کہ زیاد اس رشتے پر نرجہت کے مجبور کرنے پر راضی ہوا ہے۔
''یہ تم لوگوں کے گھر کا مسئلہ ہے... تمہیں خود ہی حل کرنا ہوگا۔ میرے کندھے پہ رکھ کر بندوق مت چلاؤ۔'' وہ دفعتاً رکھائی سے بولی۔
''اپنی زندگی خراب مت کرو مائرہ! زندگی صرف ''پھپھو کا گھر'' ہی نہیں ہے۔'' عباد نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی تو وہ کرسی پیچھے دھکیلتی ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔
''ٹو ہیل وود دس..... یہ سب فرمان جا کر اپنے گھر والوں کو سناؤ۔ میں اپنا پروپوزل لے کر کسی کے گھر نہیں گئی۔'' وہ ماربل کے فرش پر ٹھک ٹھک جوتا بجاتی چلی گئی۔ عباد گہری سانس بھر کے رہ گیا۔
''زیاد وسیم! تمہاری محبت تو پڑ گئی خطرے میں۔''
بڑبڑاتے ہوئے اس نے خود کلامی کی اور پاس آتے ویٹر کو اپنے لیے فریش جوس کا آرڈر دے کر وہ اس معاملے کا حل سوچنے لگا۔

☆☆☆

وہ میرب کے لیے ڈھیر سارے کھلونے اٹھا لایا تھا وہ بھی جن کے ساتھ وہ کھیل سکتی اور وہ بھی جن کے ساتھ کھیلنے کے لیے ابھی اسے دو تین سال کا ہونا تھا۔
''مان گئے بھئی..... ہمارے بعد میرو کو دادا اور لوگ بھی بے تحاشا چاہنے والے ہیں۔'' عباد خوش دلی سے کہتا زمین کے پاس صوفے میں دھنسا جو مسکراتے ہوئے زیاد کو میرب کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ رہی تھی۔
''دو کیوں؟ مما، ڈیڈ ابھی کچھ خفا ہیں۔ ان کی تو جان بن جائے گی ہماری چھوٹی سی پرنس۔'' زیاد نے تصحیح کی۔
''چلو..... فی الحال تو دو ہی ہیں نا۔ ایک میرو کے چاچو اور دوسری اس کی خالہ۔'' عباد ہنسا۔ ''حریم بھی پاگل ہے اس کے پیچھے۔''
زیاد سر جھٹک کر میرب کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''بھئی۔ ہم سے زیادہ اپنی پرنس سے کوئی پیار نہیں کرسکتا۔'' وہ اب میرب کو اٹھا کر ہوا میں اچھال رہا تھا اور لاؤنج میں میرب کی ننھی قلقاریاں گونج رہی تھیں۔ وہ کھلے دروازے پہ دستک دیے بنا اندر آئی تو میرب کو اس طرح ہوا میں اڑتے دیکھ کر اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آنے لگا۔ ہاتھ میں موجود فائل شانے سے لٹکتا بیگ سب زمین بوس ہوا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ..... بس کریں..... گر جائے گی وہ۔'' وہ بے اختیار ہی چیخ اٹھی تھی۔ وہ تینوں بری طرح چونکے۔ زیاد نے میرب کو شانے سے لگالیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ نرمین فوراً حریم کے پاس پہنچی۔

''ارے حری! کیسی ہو؟ کھیل رہی ہے میرب اپنے چاچو کے ساتھ۔ دیکھو نا، کیسے خوش ہو رہی ہے۔'' نرمین ہنسی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ کھلا رہے ہیں یا اڑا رہے ہیں بچی کو۔'' وہ نرمین پہ الٹ پڑی اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک سنسنا رہے تھے۔ عباد کا بے اختیار قہقہہ نکلا وہ صورت حال کو پوری طرح انجوائے کر رہا تھا۔

''مائنڈ یو..... میڈم ایکس وائی زیڈ۔ ہم جیسے چاہیں کھیلیں۔ آپ سے مطلب؟ بھتیجی ہے ہماری۔'' زیاد نے لفظ چبائے۔

''بچے کے ساتھ کھیلنے اور اسے پتنگ کی طرح اڑانے میں فرق ہوتا ہے مسٹر! اور مطلب کیوں نہیں بھانجی ہے میری۔'' حریم نے اسی کے انداز میں جواب دیا تو نرمین اسے کھینچ کر بیڈ روم میں لے گئی۔

عباد صوفے کے کشن پہ اوندھا لیٹا ہنس رہا تھا۔

''کیا بکواس ہے یار۔'' زیاد جیسے جھرجھری لے کر ہوش میں آیا اور ناگواری سے بولا پھر تپ کر بولا۔

''تمہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے۔''

''میں ابھی یہی کہہ رہا تھا نا کہ میرو کی خالہ اور چاچو کو بہت محبت ہے میرو سے۔'' عباد ابھی بھی ہنس رہا تھا۔ زیاد نے خفگی سے سر جھٹکا اور میرب کو لے کر بالکنی میں نکل گیا۔

''ریلیکس۔ کیا ہو گیا ہے حری! وہ کھیل رہا تھا میرب کے ساتھ۔ دیکھا نہیں کیسے قلقاریاں مار رہی تھی میرب۔'' نرمین نے اسے ٹھنڈا کیا۔

''خدا کے لیے یار! وہ بچی ہے۔ اسے کیا پتا غلط صحیح کا۔ میرا تو دل ابھی تک قابو میں نہیں آیا۔ پنکھے کے پاس تک گئی تھی وہ..... ڈفر۔''

اس کی یہ بات سن کر نرمین کو ہنسی آ گئی جبکہ وہ کتنی ہی دیر زیاد کی اس حرکت پر کڑھتی رہی۔

''تم سناؤ۔ گھر میں اماں ابا، طوبیٰ سب کیسے ہیں؟'' نرمین نے اس کا دھیان بٹایا تھا۔

☆☆☆

''ماما نے مارا ہے۔'' میرب نے منہ بسورتے سسکتے ہوئے کہا تو وہ بھک سے اڑی۔ اگلے ہی پل اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔

''کس نے مارا ہے میرو کو۔ دادو جان نے؟'' اس نے آہستہ آواز میں میرب سے پوچھا تو اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ شاید اس راز سے پردہ اٹھنے والا تھا جو حریم کی زندگی میں ہلچل مچا رہا تھا۔

''نہیں.....'' میرب نے چھوٹی چھوٹی پونیوں والا سر معصومیت سے نفی میں ہلایا۔ ''مما نے۔''

''مما تو میں ہوں میرو کی۔ میں نے تو میرو کو نہیں مارا۔'' حریم کو جھٹکا لگا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے دوبارہ میرب سے سوال کیا۔ ''میرو کی مما کون ہے؟''

میرب نے اپنی چھوٹی سی انگلی حریم کے سینے پہ رکھی۔

''میں میرو کو مارتی ہوں؟'' حریم نے بہت پیار اور دلار سے پوچھا۔ میرب نے بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''تو کون مارتا ہے میرب کو؟'' حریم نے پریشان ہو کر پھر پوچھا۔

''مما۔'' نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

حریم نے بے اختیار میرب کو سینے سے لگالیا۔
''یا اللہ..... جانے کون سکھا رہا ہے اس معصوم کو یہ سب۔'' وہ دنگ تھی۔
رات کھانے سے فراغت کے بعد وہ میرب کو لے کر اس کے پاس آئی تو لیپ ٹاپ بیگ کھولتا وہ ٹھٹک گیا۔
''کوئی کام ہے کیا؟''
''وہ..... کیا ہم تھوڑی سی لانگ ڈرائیو پہ جاسکتے ہیں؟'' حریم جھجکتے ہوئے اٹک کر بولی تو وہ ہنس دیا۔
''تھوڑی سی لانگ ڈرائیو۔ اچھی ٹرم ہے۔ مطلب شارٹ ڈرائیو پہ جانا ہے؟'' وہ اب مزاح کے طور پر پوچھ رہا تھا۔
''یہی سمجھ لو۔'' حریم نے نظر چرائی۔
''چلو، ٹھیک ہے۔ ریڈی ہوم؟'' کہتے ہوئے حریم پہ سرتاپا نظر ڈالی، سفید اور سیاہ پرنٹ کے لباس میں سادہ سا چہرہ اور گھنی پلکوں والی آنکھیں۔ جو زیادہ تر تو اس نے خفا ہی دیکھی تھیں... شانوں سے نیچے آتے بالوں کو پونی چڑھا کر کھلا چھوڑے وہ اسے کسی کی یاد دلا گئی تو خود سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''ایسے ہی ٹھیک ہے۔ گاڑی ہی میں تو بیٹھے رہنا ہے۔'' حریم نے سستی سے کہا۔
''او کے۔ تم میرب کو لے کر چلو، میں مما کو انفارم کر کے آتا ہوں۔'' وہ گہری سانس بھر کر اندر کی کثافت کو کم کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حریم سر ہلاتی میرب کو اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی۔
وہ ماں کے کمرے میں آیا تو وسیم صاحب سونے کے لیے لیٹ چکے تھے جبکہ نزہت ابھی ٹی وی ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔
''خیریت؟'' وہ متفکر ہوئیں۔
''جی۔ خیریت ہی ہے۔ حریم اور میرب کو لانگ ڈرائیو پہ لے کر جارہا ہوں، سوچا، آپ کو انفارم کرتا جاؤں۔'' وہ مسکرایا تو جہاں بیٹے کی اچھی سوچ نے ان کا دل خوش کیا۔ وہیں حریم کے ساتھ لانگ ڈرائیو کے تذکرے نے پہلو بدلنے پر مجبور بھی کر دیا۔ وہ بھڑکیں۔
''واہ۔ یہ اچھی رہی۔ وہ میرب پہ ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے اور تم اسے عیاشیاں کروا رہے ہو۔''
''نزہت۔'' وسیم صاحب نے تنبیہی انداز میں انہیں پکارا تو وہ جھلا گئیں۔
''کوئی ظلم کے پہاڑ نہیں توڑ رہا میرو پر۔ بچوں کو بعض اوقات سختی سے بھی سمجھانا پڑ جاتا ہے۔ حریم کو وارن کر دیا ہے نا۔ اب انجوائے کرنے دو انہیں لائف کو۔'' انہوں نے تادیبی انداز میں بیوی کو سمجھایا تو وہ تلملاتے ہوئے کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ ''جاؤ۔ جو مرضی میں آئے وہ کرو۔'' وسیم صاحب نے بیٹے کو اشارہ کیا تو وہ شانے جھٹکتا واپس پلٹ گیا۔
''ایک تو آپ کا ہر بات میں بولنا ضروری ہوتا ہے۔ اچھا بھلا وہ میری بات سمجھ رہا تھا، آپ نے بیچ میں لقمہ دے کر سارا ماحول ہی بدل دیا۔'' نزہت شوہر سے الجھنے لگیں۔
''اسے اب اس کی زندگی جینے دو نزہت! زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے تو اسے لوٹنے دو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔
''میں اس لڑکی کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے اس کی بہن یاد آتی ہے۔ جس نے میرا گھر برباد کر دیا۔ میری خوشیاں..... میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا اور اب اسی کی بہن میرے گھر میں دندناتی پھر رہی ہے۔'' ان کی آواز رندھ گئی۔
''بہت نصیحت حاصل ہوگئی نزہت! اب بچوں کو ان کی پسند کی زندگی گزارنے دو۔'' وہ بھی دکھ سے بوجھل

لہجے میں بولے تو ان کی بات سمجھتے ہوئے نزہت تکیے میں منہ چھپا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگیں۔

☆☆☆

تمہارا میرا تعلق ہی کچھ عجیب سا ہے
نہ اس پہ زور میرا اور نہ کچھ تمہارا ہے
یہ سارا کھیل ہی دیکھو تو کچھ نصیب کا ہے
ہمارا ساتھ ہے دریا کے دو کناروں سا
کہ جن کے بیچ سدا فاصلے نے رہنا ہے
کریں تو کیسے کریں یہ پیچیدہ مسئلہ حل
سمے نے رکنا نہیں پانیوں نے بہنا ہے
ملے تھے ہم تو بہت دیر ہو چکی تھی تب
کچھ اتنی دیر کہ موسم گزر گئے اپنے
اور اب ہے یوں کہ کوئی راستہ نہیں ملتا
ہمارے خواب کہیں ساتھ چل نہیں سکتے
چراغ ایسی ہواؤں میں جل نہیں سکتے
کچھ ایسے ڈھب سے بنا دائرہ مقدر کا
کسی طرف سے بھی ہم تم نکل نہیں سکتے
کشش ہو کتنی بھی "باہم" مگر حقیقت ہے
مدار اپنا مگر ستارے..... بدل نہیں سکتے!

☆☆☆

"کہاں چلنا ہے؟" مین روڈ پہ گاڑی لاتے ہی اس نے گاڑی میں چھائی خاموشی کو توڑنے کے لیے حریم سے پوچھا جو گود میں بیٹھی میرب کے گرد بازو لپیٹے چپ چاپ ونڈ اسکرین کے پار مناظر دیکھ رہی تھی۔

"بس، یونہی۔ سیدھی سڑک پہ۔" حریم چونکی پھر پھیکے لہجے میں بولی۔

"میرب کو تو ابھی سے نیند آ رہی ہے۔" وہ میرب کو چپ چاپ اس کی گود میں لیٹے دیکھ کر بات برائے بات بولا لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ چند منٹ گاڑی اور خاموشی کا یہ سفر مزید جاری رہا۔

"کیا بات ہے۔ کوئی کمپلشن ہے کیا؟"

"ہوں۔" وہ کسی خیال سے چونکی۔

"کوئی پریشانی ہے تو شیئر کر سکتی ہو۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا تو حریم بولنے کے لیے الفاظ جمع کرنے لگی۔

"نہیں۔" کچھ دیر بعد گہری سانس کھینچتے اپنے اندر کی کثافت کم کرتے ہوئے وہ بوجھل انداز میں بولی تو اس نے لمحہ بھر کو چہرہ موڑ کر حریم کو دیکھا اور پھر دوبارہ سامنے متوجہ ہو گیا۔

"اعتبار کیا کرتے ہیں مسز! رشتے بنا اعتبار کے نہیں پنپتے۔" اس کے لہجے میں لطیف سا طنز تھا۔

"زبردستی کے رشتے بھی؟" حریم نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوئی۔

"زبردستی کے رشتوں میں بھی اگر بین السطور خلوص موجود ہو تو میرا جواب ہے کہ..... ہاں۔ زبردستی کے رشتوں کو بھی آگے بڑھانے کے لیے باہمی اعتبار مجبوری ہے۔" وہ بہت پرسکون تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح

کی مانند۔شانت۔حریم کو اس کے سکون نے بے چین کیا۔

''میں نے بھی تم سے محبت کی شادی نہیں کی.....مگر''کمپرومائز'' کا دامن تھام رکھا ہے۔'' وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

''تمہارا''ایڈونچر'' تو اس شادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا لیکن کبھی تم نے میرے بارے میں سوچا ہے۔ کتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے۔ ماں باپ سے جدائی ایک طرف رہی۔ یہاں تو سسرال کی نفرتیں بھی لامحدود ہیں۔روز ایک تازہ واردات اور مجرم.....صرف میں۔'' حریم کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

''اگر تو تم میرو والے واقعہ کی بات کر رہی ہو تو ایک بات ذہن نشین کر لو حریم! بس ایک میرب کے معاملے میں تمہاری کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ باقی تم اس گھر میں اپنی خوشی سے جیسے جی چاہے رہ سکتی ہو۔لیکن میرے والدین کی ریسپیکٹ کر کے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اور میری گواہی کون بنے گا؟ رشتہ ہی کون سا ہے تمہارے میرے بیچ اعتبار کا؟'' وہ تلخ ہوئی۔

''رشتے بنانے سے بنتے ہیں ڈیئر وائف! میرے نکاح میں ہو۔رشتہ تو بنا بنایا ہے تم خود ہی اپنی مرضی سے مجھ سے دور ہو۔'' وہ شانے اچکا کر آرام سے بولا تو اس کی بات سمجھ کر حریم کے سارے جسم کا خون گویا چہرے پہ سمٹ آیا۔وہ بات کو کسی اور ہی رخ پہ لے گیا تھا۔

''میں.....باہمی اعتبار کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ بمشکل بولی۔

''میاں بیوی کا باہمی رشتہ ہی نہ ہو تو باہمی اعتبار کی باتیں تمہیں کچھ عجیب نہیں لگتیں؟'' اس کی گھبراہٹ نوٹ کر کے وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔حریم سلگی۔

''زبردستی کے رشتے گلے کا طوق ہوتے ہیں مسٹر! ان میں''باہم'' ہونے کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔'' حریم کے اس قدر سلگتے جواب پہ اس کا ہلکا سا قہقہہ بے اختیار تھا۔

''باہم ہونے کے لیے صرف باہمی رضامندی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور بس۔'' وہ یقیناً اسے چھیڑ رہا تھا۔حریم آزردہ ہونے لگی۔

''کاش یہ بات تم اس زبردستی کی شادی سے پہلے سوچ لیتے۔''

''پھر وہی بے وقوفانہ بات۔'' وہ اسے ٹوک گیا۔''جو ہو چکا،اس پہ ماتم کیے جانے سے وہ بدل نہیں جاتا۔ آگے کے لائحہ عمل طے کیے جاتے ہیں۔یا سرنڈر کیا جاتا ہے یا مقابل سے بدلے لیے جاتے ہیں۔'' وہ اسے مشورہ دے رہا تھا۔

''ہاہ۔'' وہ آزردگی سے ہنسی۔''بدلہ؟ بدلہ تو وہ لے جس کے پاس واپس لوٹنے کی راہ کھلی ہو۔بدلہ لے اور واپس لوٹ جائے۔''

''بدلہ لینے کے بعد معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔'' وہ برجستہ بولا۔

''کچھ جرم ناقابل معافی ہوا کرتے ہیں.....سمجھے تم۔'' وہ اس کی بات سمجھ کر سلگ کر بولی تھی۔اور میں اس ڈرائیو پہ تمہارے ساتھ''باہمی تعلقات'' ڈسکس کرنے نہیں آئی۔ مجھے میرب کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں۔''

''کیا تحفظات ہیں تمہارے؟'' وہ فوراً سنجیدہ ہوا۔

''مجھے لگتا ہے.....میرب کو کوئی میرے خلاف کر رہا ہے۔''

''شٹ اپ۔'' ہلکے پھلکے انداز میں ٹوکتے ہوئے اس نے حریم کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔''اتنی سی

بچی کسی کے خلاف کیسے ہوسکتی ہے؟ ہر وقت تو تمہاری گود میں جانے کی ضد کررہی ہوتی ہے۔''

''تو پھر روتے ہوئے مجھ پہ مارنے کا الزام کیوں لگاتی ہے؟'' حریم بے بسی سے بولی۔

''تو مت مارا کرو۔ زبان سے پیار کے ساتھ سمجھایا کرو۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تو حریم جو اس کے آرام سے بات سننے اور سمجھنے پر مطمئن ہورہی تھی، بھک سے اڑی۔

''تمہارا خیال ابھی بھی وہی ہے کہ میں اسے..... مارتی رہتی ہوں۔''

''میرے کہتی ہے۔'' حریم کے صدمانی انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ جتا کر بولا۔ تو وہ چپ چاپ سی ونڈ اسکرین کے پار گزرتے مناظر کو گھورنے لگی۔ پھر دفعتاً خشک لہجے میں بولی۔

''واپس چلو۔ ہوگئی لانگ ڈرائیو۔ اتنی ہی کافی ہے۔''

''تم اپنا اعتبار بحال کرسکتی ہو، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' وہ شاید اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

''گاڑی واپس موڑ لو پلیز۔ میں تمہارا وعظ نہیں سننا چاہتی۔ بہت ہوگیا۔'' وہ دفعتاً اکتا گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے گاڑی واپس موڑ لی۔ واپسی پہ گاڑی میں پہلے سے زیادہ خاموشی تھی۔

☆☆☆

مصطفیٰ صاحب چپ چاپ کمرے میں لیٹے تھے اماں کاموں سے فراغت پاکر آئیں تو بیڈ پہ ان کے پائنتی بیٹھ کر نرم ہاتھوں سے پاؤں دبانے لگیں۔

کئی لمحے خاموش سرکے۔

''آپ سے ایک بات کہنی تھی۔''

''کہو۔'' وہ نیند کے جھونکوں کی زد میں تھے۔

''گزرتے وقت کے ساتھ گزری باتوں کو بھولنے کی کوشش کرنا ہی دانش مندی ہوتی ہے مصطفیٰ صاحب!'' اماں نے بڑے ہی دل گیر لہجے میں بات شروع کی، ان کی آنکھیں فوراً کھلیں۔ عام طور پر وہ انہیں بچیوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ مخاطب کیا کرتی تھیں۔ پہلے نرمین کے ابا پھر حریم کے..... پھر حالات ایسے رہے کہ انہیں طوبیٰ کے ابا کہلوانے کا موقع ہی نہ ملا اور نہ اس لقب کا شوق رہا۔ ان کا نام تو اماں کبھی ناراض ہوتیں تو تب لیا کرتی تھیں۔

''سیدھی اور صاف بات کرو۔''

''مانا کہ نرمین دھوکا دے گئی۔ لیکن حریم کو تو آپ نے خود اس گھر سے رخصت کیا ہے۔ اس کے لیے میکے کے دروازے بند مت کریں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بڑی بے بسی اور بے چارگی دیکھی ہے۔'' اماں نے بات کے اختتام پہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''واہ..... یعنی شوہر کی عزت کا جنازہ اٹھتا تمہیں دکھائی نہیں دیا۔ اور من پسند شادی کرنے والی بیٹی کی آنکھوں سے جھلکتا دکھ دکھائی دے گیا۔ واہ۔''

ان کے الفاظ سے جھلکتی آزردگی بتا رہی تھی کہ اماں کے الفاظ نے ان کے دل پہ گہری ضرب لگائی ہے ورنہ تو وہ اس موضوع پر ایک لفظ بولنے نہیں دیتے تھے۔

''سب دکھائی دیا ہے مصطفیٰ صاحب! آپ کے ساتھ جھیلا بھی ہے کھڑے ہوکر۔ لیکن یقین کریں، یہ ایک ماں کے دل کی گواہی ہے۔ حرمی کا معاملہ مینو سے بالکل الگ لگتا ہے مجھے۔''

''بتی بجھا دو..... اور جو دل چاہتا ہے کرو۔ مجھے مرا ہوا سمجھ لو بس۔'' وہ ہارے ہوئے سے انداز میں کہتے

لیٹ گئے تو اماں نے۔ بے اختیار روتے ہوئے ان کے پیر تھام لیے۔

''ایسا مت کہیں۔ اللہ پاک آپ کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ حریم اور طبیعت کی ہے۔ اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر یہ رشتہ اس کی مرضی سے آیا ہوتا تو وہ بار بار انکار کیوں کرتی۔ چپ چاپ شادی کر کے جان چھڑا لیتی۔ لیکن وہ تو پلٹ پلٹ کر واپس آرہی ہے۔ مینو کو دیکھیں۔ ایک بار بھی مڑ کے دیکھا اس نے؟ پسند کی زندگی حاصل کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ حریم جیسے نہیں۔''

اماں نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب اللہ جانے ان کی باتیں ابا کے دل کو لگیں یا نہیں۔ لیکن وہ آنکھیں موندے بالکل چپ چاپ لیٹے رہے تو اماں ان کی خاموشی کو غنیمت جان کر پھر سے ان کے پاؤں دابنے لگیں۔ آج کی خاموشی کل کی رضامندی بھی بن سکتی تھی، یہ اطمینان ان کے دل میں اترنے لگا۔

☆☆☆

وسیم صاحب اور نزہت ناشتا کر کے اٹھ چکے تھے وہ چونکہ آؤٹ لیٹ ذرا دیر سے پہنچتا تھا اس لیے حریم اور وہ ابھی ناشتا کر رہے تھے جب بڑی فریش سی مائرہ زلفوں کو لہراتی مسکراتی چلی آئی۔ حریم نے بے زاری محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ سامنے بیٹھے ناشتے میں مگن شوہر کو دیکھا جو ناشتے کے ساتھ حسب عادت و معمول اخبار کے صفحات بھی کھنگالنے میں مصروف تھا۔

''اف۔ لیٹ لطیف۔ ابھی تک ناشتے میں مصروف ہو۔'' وہ کھلکھلاتے لہجے میں کہتی حریم کو مکمل طور پہ اگنور کرتی کرسی گھسیٹ کر عین حریم کے سامنے بیٹھی۔ اس کے شوہر کے ساتھ۔ جس نے مائرہ کی آواز سنتے ہی پچھلے پندرہ منٹ سے منہ کے آگے رکھا اخبار فوراً ہی لپیٹ دیا تھا۔

''لکنگ پریٹی۔ مگر صبح صبح۔ خیریت تو ہے۔؟'' وہ بہت مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ حریم خوامخواہ ہی جز بز ہونے لگی۔

''یونہی..... گھر میں بور ہوتی رہتی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کیوں نہ تمہیں آوٹ لیٹ پہ جوائن کرلوں؟ وقت اچھا گزر جائے گا اور بوریت بھی دور ہو جائے گی۔'' مائرہ دلکش سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے اعتماد سے اپنے شانوں پہ لہراتے ڈارک براون بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے آئیڈیا دے رہی تھی تو اس نے فوراً سے پیشتر مائرہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ فارغ رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتی رہو۔'' حریم کے ناشتا کرتے ہاتھ سست پڑے۔ اتنے شوق سے بنوائے افغانی آملیٹ سے دل ہی اچاٹ ہو گیا، وہ کھنکھاری۔

''ناشتا کرو گی مائرہ! بنواؤں کچھ تمہارے لیے؟''

آج وہ پہلی بار مائرہ سے مخاطب ہوئی تھی تب ہی تو مائرہ کی آنکھوں میں اس کی ''جرأت'' پہ پہلے حیرانی اور پھر رکھائی اتر آئی۔

''نو تھینکس۔ میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ تم میری فکر مت کرو۔'' اس کی آنکھوں ہی جیسی رکھائی اس کے لہجے میں بھی تھی اور ہونٹوں پہ واجبی سی مسکراہٹ۔

''تم کتنے بجے تک نکلتے ہو آفس کے لیے؟'' وہ دوبارہ اپنے ''من پسند'' بندے کی طرف پلٹی۔

''بس۔ ابھی پانچ دس منٹ لگیں گے۔'' وہ مسکرایا یعنی مائرہ کے اس فیصلے پر اسے واقعی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

''تم دوبارہ سے یونیورسٹی جانا کیوں نہیں شروع کر دیتیں۔ وقت بھی اچھا گزرے گا اور ڈگری بھی مل

جائے گی۔''

حریم کی سرشت میں شامل نہیں تھا کسی پہ ''سوار'' ہونا۔ لیکن اللہ جانے کیا بات تھی، یہاں وہ بے اختیار ہو جاتی تھی۔ مائرہ کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر ناگواری اتر آئی۔

''تمہیں شاید کسی نے بتایا نہیں کہ جب تک کوئی مشورہ نہ مانگے تب تک نہیں دینا چاہیے۔'' نتھنے پھلاتے ہوئے بولی تو حریم شانے جھٹک کر اپنی چائے ختم کرنی اٹھ گئی۔

''میں میرب کو دیکھ لوں ذرا۔''

''کہاں سے اٹھا کر لائے ہو اس گنوار کو۔ جسے ایٹی کیٹس کے اسپیلنگز بھی نہیں آتے۔'' حریم نے ڈائننگ روم سے نکلتے ہوئے اپنے پیچھے مائرہ کی غصیلی لیکن مدھم سی آواز سنی تھی۔ آگے سے اس نے کیا جواب دیا، یہ وہ سن نہیں پائی ہاں البتہ جب وہ عجلت آمیز انداز میں کمرے میں داخل ہوا تو حریم کا غصہ دوبارہ سے عود کر آیا۔

''اب یہ آفس بھی جایا کرے گی تمہارے ساتھ؟'' میرب کو کمفرٹر اوڑھا کر وہ وارڈروب کی طرف آئی جہاں وہ اپنی میچنگ ٹائی سلیکٹ کر رہا تھا۔

''کون؟ مائرہ کی بات کر رہی ہو؟'' وہ ٹائی نکالتے ہوئے بے توجہی سے پوچھ رہا تھا۔

''ظاہر ہے۔ ایک وہی ہے جسے دوسروں کی زندگی میں دخل دیے بنا بوریت ہوتی ہے۔'' حریم چیخی۔ تو وہ وارڈروب بند کرتا پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی وہ اس کے احتساب کے موڈ میں تھی۔

''اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟'' وہ سمجھ نہیں پایا تھا یا جان بوجھ کر صرف نظر کر رہا تھا۔

''میرا مسئلہ یہ ہے کہ اس گھر میں زبردستی کی ہی سہی لیکن تم مجھے اپنی بیوی بنا کر لائے ہو۔ پھر مائرہ کس سلسلے میں دندناتی پھرتی ہے یہاں؟''

حریم اپنے لفظوں پہ زور دیتے ہوئے بولی۔ مائرہ جس طرح اسے ''تھرڈ ورلڈ کنٹری'' سمجھ کر ٹریٹ کرتی تھی۔ اس پہ شاید یہ تپ چڑھنا فطری عمل تھا۔ حریم کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''تم بیوی ہو تو وہ کزن ہے۔ یہ اس کی پھپھو کا گھر ہے۔ یہاں دندنانے پہ اس کا پورا حق ہے۔'' وہ ٹائی کی ناٹ باندھنے کے دوران اسے دیکھ رہا تھا۔

''اور آفس یقیناً اس کے پھپھو زاد کا ہے۔ سو وہاں دندناتے پھرنا بھی اس کا حق ہی تسلیم کیا جائے گا۔ سو میرا اعتراض خارج کیا جاتا ہے۔''

اس کی بات کاٹ کر مائرہ کا انداز یاد کر کے حریم خفیف سا بھڑکی تو اس نے بے اختیار ہی حریم کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

''پہلے یہ طے کر لو مسز! کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میں تمہارے پاس نہ آؤں..... یا کوئی بھی میرے پاس نہ آئے؟''

اس نے مسکرا کر حریم کو چھیڑتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔ اس کی یہ حرکت اور الفاظ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھے کہ حریم اس کی گرفت میں سن سی رہ گئی۔

☆☆

ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ

قرۃ العین سکندر

منزل کے سہرا سجائے

وہ ایک عام سا ہی دن تھا' وہ گلاس ونڈو سے باہر ہونے والی بارش کے پرلطف نظارے میں محو تھی' سرسبز درختوں کو بارش نے ہولے ہولے نم کر کے انہیں سیرابی بخشی تھی' ہر شے ہی نکھری دھلی دھلی سی لگ رہی تھی' بارش اس کی کمزوری رہی ہے' بارش میں ٹک کر بیٹھ جانا اس کے بس میں نہ تھا' اور ایسے میں وہ بی جان سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے باہر کی راہ لیتی تھی۔ کبھی قریبی پارک میں چل دیتی اور کبھی یونہی شاپنگ کے لیے چل دیتی۔ قطرہ قطرہ پانی کو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرنے کا الگ ہی مزہ تھا مگر شادی کے بعد کئی سالوں سے یہ سلسلہ موقوف تھا۔

اب ہر قدم اٹھانے سے قبل کئی بار سوچنا پڑتا تھا' کیا سجیل کے لیے وہ اب پرائی ہوگئی تھی۔ اس کی اور سجیل کی ملاقات بھی تو اس بارش میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں جی کے اصرار پر پھل سبزیاں خریدنے کے ارادے سے نکلا تھا کہ اچانک بادلوں نے آنکھ مچولی دکھانا شروع کردی اور دوسری جانب نیلم بھی بارش کی چھم چھم کانوں میں پڑتے ہی' سبزی لینے نکل پڑی تھی، وہ قدرت کی صناعی کا مکمل نمونہ تھی۔ خوب صورت غزالی آنکھیں، گھنیری پلکیں، گلابوں کی سی سرخی رخساروں پر دمکتی رہتی۔

وہ یوں ہی مبہوت سا اسے یک ٹک تکے گیا تھا۔ وہ اس کی نظروں کی فسوں خیزی سے بے خبر ہاتھوں میں پانی کے قطروں کو محویت سے اپنی پوروں میں جذب کررہی تھی۔ ایک دم نجانے کیا سوچ کر وہ کھلکھلا کر ہنسی تو موتیوں جیسے دانت جگمگاتے ہوئے ایک لڑی کی صورت میں پروئے ہوئے لگے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے' صبح صبح ہی وقت کیوں کھوٹا کررہی ہو' کام کاج کا ہوش نہیں تمہیں۔'' عقب سے آتی ثریا آپا کی آواز پر وہ بری طرح سٹپٹائی تھی۔ ثریا آپا نے اس کے چہرے پر بکھرے آس سے لے کر یاس تک کے سب ہی ——— رنگ بے حد محویت سے دیکھے تھے' اس لیے ٹھنڈی سانس بھری ورطمانیت سے بولیں۔

''تم خوابوں میں رہنا چھوڑ دو۔ اب تم سجیل کی محبوبہ نہیں اس کی بیوی ہو۔ جب محبوبہ بیوی کی مسند پر براجمان ہوتی ہے تو اس کو ہر قدم بے حد پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے اور تم تو اپنی ہی دنیا میں جیے جاتی ہو۔''

وہ ثریا آپا کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ تب ہی جلدی سے سارے کام کرنے لگ گئی تھی۔ صبح سویرے نگہت بیگم اور نصیر صاحب کو چائے کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ وہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد سب سے پہلے چائے پیتے تھے۔ اس لیے وہ پہلے چائے بنانے لگی' دوسری طرف ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔

نصیر صاحب اور نگہت بیگم کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی ثریا آپا تھیں' جن کا گھر قریب بھی تھا' وہ ہر دوسرے دن ادھر ہی پائی جاتی تھیں' وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں اپنی گھرداری میں وہ لطف نہیں ملتا جو دوسروں کی گھرداری میں دخل اندازی کر کے ملتا ہے۔

پھر سجیل تھے۔ اس کے بعد عامر اور سب سے چھوٹی فریحہ تھی۔ فریحہ نازوں پلی تھی۔ ابھی کالج میں

پڑتی تھی، اس کو ابھی تک بچہ جان کر گھر کے کاموں سے دور رکھا جاتا تھا۔

یوں ثریا آپا، ان کے تین بچے اور باقی تمام اہل خانہ کے لیے اس نے عین وقت پر ناشتہ کا اہتمام کرنا ہوتا تھا۔ ذرا سی دیر پر ثریا آپا اس کو بے نقط سناتی تھیں۔

کبھی کبھار تو اس طرح کے طنزیہ جملے بولتی تھیں کہ اس کو اپنی روح اندر تک چھلنی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ اس خوف کے سائے تلے وہ اپنے تمام کام وقت پر ہی انجام دینے کی سعی میں ہلکان ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے گھر میں دوسرے نمبر پر تھی۔ پہلے بھائی تھے پھر چھوٹی ندا تھی۔

مگر ان کے گھر میں اتنی روک ٹوک نہ تھی۔ اگرچہ بھابی بھی آ چکی تھیں مگر سارے کام خود ان کی والدہ طاہرہ بیگم سرانجام دیتی تھیں۔ ثوبان بھائی اور عالیہ بھابی بھی ماں کے آرام کا خوب خیال رکھتے تھے۔ ان کا اپنا گھرانہ بے حد مثالی تھا۔ جہاں ساس بہو کی روایتی چپقلش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہاں ایک پرسکون فضا ہوا کرتی تھی۔ جبکہ یہاں ہر کام پر، بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ سہہ سہہ کر نیلم اپنی خود اعتمادی کھوتی جا رہی تھی۔ اس کا وہ مسکراتا ہوا اٹھلیلیاں کرتا وجود اب ہر وقت ہراساں رہنے لگا تھا۔

سجیل بھی ماں اور بہن کی عینک لگا کر ہی منصف بن کر فرائض سرانجام دینے لگتا تھا۔ پھر اسے بھی ماں اور بہنوں کی طرح نیلم کے ہر کام میں مین میکھ نکالتے دیر نہیں لگتی تھی۔ نصیر صاحب سمجھاتے تھے۔

''تم لوگ کچھ تو عقل سے کام لو اور نگہت بیگم! یہ ثریا کا زیادہ آنا جانا مناسب نہیں ہے، اسے اپنے گھر گرہستی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی اپنی بچیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی ہیں۔ ماں سے یہی سیکھ رہی ہیں۔ ہر وقت نیلم کو ذلیل کرنے سے بہتر ہے، اپنے گھر کو قرینے سے سنوارے نکھارے، میاں کو راضی رکھے۔''

مگر کوئی بھی ان کی بات پر خاص کان نہ دھرتا تھا۔ اس کی اصل وجہ تو یہ تھی اس گھر پر ہمیشہ نگہت بیگم کی حکومت رہی تھی۔ ان ہی کے حکم کا سکہ چلتا تھا۔ اب اچانک نصیر صاحب کی بات پر کیسے عمل ہو سکتا تھا۔ پھر جب نصیر صاحب زیادہ زور دیتے تو ثریا میکے سے واپس سسرال کی راہ لیتی تھیں۔ مگر دو دن بعد پھر واپس آ جاتی تھیں۔ بے ثبات زندگی میں ہم نفس ہوتے ہوئے بھی نیلم خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی تھی۔ سجیل کے محبت کے وہ تمام دعوے جو شادی سے قبل اس نے کیے تھے، دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹیبل پر تمام اہل خانہ موجود تھے۔ وہ

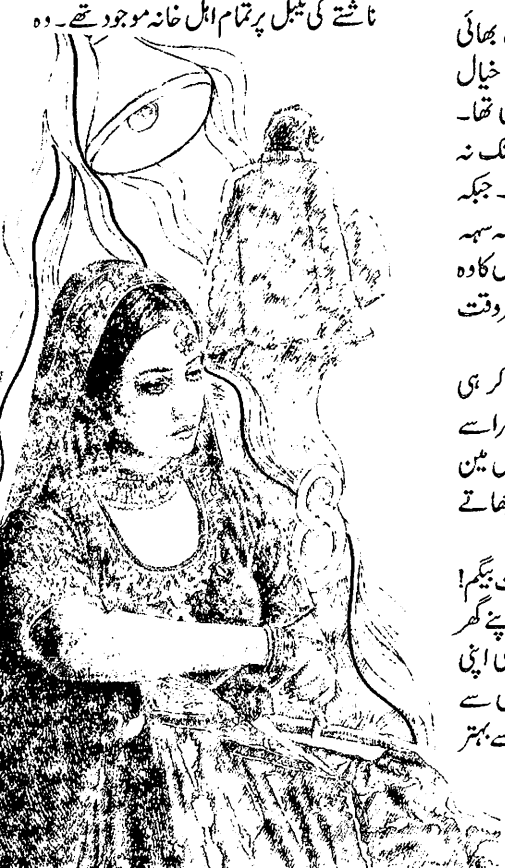

تیزی سے سب کی من پسند کھانے کی ڈشز ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

''تم نے عامر کے لیے جوس نہیں نکالا۔ بچہ سارا دن پڑھ پڑھ کر ہلکان ہوجاتا ہے۔ صبح سویرے اسے جوس دیا کرو۔''

نگہت بیگم نے اسے نیا حکم سنایا تو وہ ان ہی قدموں پر واپس پلٹنے والی تھی جب عامر کی آواز پر رک گئی تھی۔

''بھابی! رہنے دیں' میں آج انڈہ پراٹھا ہی کھالوں گا اور امی کچھ تو خیال کریں اتنے سارے افراد کا فرمائشی ناشتہ ہی کافی ہے۔ میں اس فرمائشی لسٹ میں شامل نہیں ہوسکتا۔'' عامر نے کہا۔

نگہت بیگم نے خشمگیں نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ ''اب اس لڑکی کے پیچھے تم اپنی ماں کی بات رد کرو گے؟''

نگہت بیگم کی بات پر فضا میں گہری خاموشی کی فضا تن گئی تھی۔

''نہیں امی! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں آپ کی دل شکنی نہیں کررہا، میں تو.....'' عامر نے وضاحتی لہجہ میں کہا تھا' مگر اس کی بات درمیان میں ہی ثریا نے اچک لی تھی۔

''تو کیا مقصد تھا تمہارا' میں خوب جانتی ہوں جو ہر وقت یہ تمہارے آگے پیچھے کام کرتی پھرتی ہے' تمہارا دل موم کرکے تمہیں مہرہ بنا کر ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے' اب سجیل ہاتھ سے نکلتا دکھائی دینے لگا تو عامر پر اپنے ہتھکنڈے آزمانے شروع کردیے۔''

ثریا آپا کا زہر خند لہجہ سارے ماحول کو یکبارگی آلودہ کرگیا تھا۔

''حد ہوتی ہے آپا' انسان کو سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے تاکہ بعد میں شرمندہ نہ ہونا پڑے.....اور آپ تو واقعی یہاں کے حالات زیادہ بہتر جانتی ہیں' کیونکہ وہ آپ کے ہی مرہون منت ہیں۔ رشتوں کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر دیکھیں۔ سارے کام سیدھے ہوجائیں گے۔ کب تک ولن کا رول نبھاتی رہیں گی؟'' عامر نے دوبدو جواب دیا۔

اس ساری صورت حال کے دوران اس کی اپنی حالت غیر ہورہی تھی۔ وہی سزاوار ٹھہرائی جارہی تھی۔

سجیل نے اچانک کھانے کی پلیٹ پٹخ دی۔

''یہ کیا طریقہ ہے بڑوں سے بات کرنے کا؟'' سجیل کا لہجہ بارعب اور غصیلا تھا۔

عامر اس کی سرزنش پر خاموشی سے قطع تعلقی اپناتا وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے سجیل! اتنی سی بات پر کتنا فساد کھڑا کروادیا اس عورت نے۔'' ثریا آپا نے مصنوعی آنسو آنکھوں میں لاتے ہوئے کہا تو سجیل کو اس سارے واقعے میں اس کی خاموشی بھی جرم لگنے لگی تھی۔ جیسے وہی قصوروار — ہو جبکہ خود اس کا چہرہ فق تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہاتھ برف تھے۔

اب سجیل کا موڈ ٹھیک ہونے میں کئی دن لگ جاتے اور جب تک سجیل کا موڈ اعتدال پر نہ آجاتا وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپتی رہتی تھی۔ دل تو اس کی محبت میں خوار تھا' مگر ذہن سمجھاتا تھا کہ جب اسے کوئی پروا نہیں تو وہ بھی فکر چھوڑ دے۔

مگر سجیل اسے محبت کی راہ دکھا کر خود کہیں کھو چکا تھا۔ ہر لحظہ درد اس کے دل کا مسکن ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

''آج ہم لوگ عامر کے رشتے کے لیے جارہے ہیں شام میں' تم سب کو وقت پر کھانا کھلا دینا' کیا معلوم دیر سویر کا۔''

نگہت بیگم اور ثریا آپا خاصے دنوں سے سر جوڑے راز و نیاز میں لگی رہتی تھیں۔ اب اتنے دنوں بعد عقدہ کھلا تو یہ تھا۔

''جی۔'' وہ مودب ہوکر بولی تھی۔

عامر کے رشتے کی مہم بڑے زوروں پر تھی۔ ثریا آپا اسے جتلانے کی خاطر باآواز بلند تبصرہ کرتی

تھیں۔

''اماں! اس مرتبہ ہم کسی قسم کا کوئی دھوکا نہ کھائیں گے۔ بجیل کی تو مت ماری گئی تھی جو بنا جہیز کے لڑکی بیاہ لایا۔ جس کو نہ تو بڑوں کا احترام کرنا آتا ہے نہ ہی گھر گرہستی کی الف ب معلوم ہے۔''

ثریا آپا کی باتوں پر وہ خاصی جز بز ہوتی رہتی تھی۔ جہیز میں اتنا کچھ تو اس کے والدین نے دیا تھا مگر یہاں آکر اسے علم ہوا کہ سونے کا بھاری سیٹ نہ صرف یہ کہ ہونے والی ساس کو پیش کرنا ہوتا ہے بلکہ نندوں کو بھی ۔۔۔سیٹ دینا پڑتا تھا' اب ہر بات میں یہی طعنہ اس کا مقدر بنتا تھا' وہ مارے باندھے زبردستی کی مسکان سجائے ہر طنز' ہر تضحیک آمیز جملہ سہہ رہی تھی۔

اس کی خاموشی کو بھی بسا اوقات جرم گردانا جاتا تھا۔

عامر کی مہم ابھی سر نہ ہوئی تھی کہ ایک نئی بات ہوگئی۔ جہاں یہ لوگ رشتہ کی غرض سے گئے تھے' وہاں ان لوگوں کو فریحہ بے حد پسند آگئی تھی۔ اب عامر کو بھول کر فریحہ کی بابت سوچا جانے لگا۔ یوں بھی امتحانات کے بعد فریحہ کو فراغت ہی فراغت تھی۔

''اچھا ہے ناں ہماری فری اپنے گھر بار کی ہوجائے گی۔ خوش رہے گی' کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے۔ اتنا بڑا ان کا بنگلہ ہے' اور پھر ہم اچھا خاصا دے دلا کر ہی اسے رخصت کریں گے تاکہ کوئی طعنہ نہ ملے۔''

آخری جملہ خاصا دھیمی آواز میں ادا کیا گیا تھا۔ مبادا وہ نہ سن لے۔ جبکہ اس کا ذہن تو پہلے ہی ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے میں دیکھ رہی ہوں تمہارا منہ ترا ہوا ہے۔ فری کا اتنی اچھی جگہ رشتہ ہو رہا ہے' تم برداشت نہیں کر پا رہی ہو ناں۔'' ثریا آپا کا نیا الزام سن کر چائے کا کپ جو وہ انہیں پیش کرنے کے ارادے سے ٹرے سے اٹھا رہی تھی' چھلک اٹھا تھا۔

وہ حواس باختہ ان کا منہ تک رہی تھی۔ لفظ بھی اب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''میں تمہاری رونی صورت کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں' بھابیاں تو ایسے مواقع پر بڑھ چڑھ کر کام کرتی ہیں' ایک تم ہو' تمہیں تو ایک کام کہہ دو کفن کا' موت آجاتی ہے۔''

نگہت بیگم کہاں چوکنے والی تھیں۔ دور کی کوڑی لائی تھیں۔ نیلم متعجب رہ گئی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اتنی خوش ہوں۔ بجیل سے پوچھ لیں آپ۔''

اسے فوری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو بجیل کا حوالہ دے ڈالا تھا۔

''اس کی تو رہنے ہی دو۔ تمہاری زبان ہی بولے گا وہ تو۔'' ثریا آپا تمسخرانہ ہنسی تھیں۔

نیلم کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

''یاد رکھنا میری ایک بات، میں خوب جانتی ہوں تمہارے انداز اور مجھے بات کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ بجیل سے کہہ دیا ناں ایک بار تو وہ وہی کرے گا جو میں کہوں گی۔''

وہ دبے دبے انداز میں اسے دھمکی دے رہی تھیں۔ نیلم بسا اوقات سوچتی تھی کہ ثریا آپا کی تو اپنی بیٹیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں اور اب ان کے جلد ہی رشتے طے کرنے کے مراحل درپیش تھے پھر بھی وہ خوف خدا سے مبرا تھیں۔

وہ جو منظر کشی کرتی تھیں' بجیل اسی کو دیکھتے تھے' پھر ان کا موڈ ان کی باتوں کے نتیجے میں کئی دن تک نیلم سے خراب رہتا اور وہ اسے مسلسل طنزیہ باتوں سے زچ کرتے رہتے۔

''اماں! یہ وٹے سٹے کی شادیاں ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک گھر نہیں بلکہ دو گھرانے تباہ ہوجاتے ہیں۔'' عامر نے احتجاج کیا تھا۔

''نہ تو ہم نے کوئی آنکھیں بند کر کے تو ہاں کی نہیں' زہرہ اور زاہد دونوں ہیرا ہیں' زاہد اپنی فریحہ کو خوش رکھے گا۔ اور زہرہ بھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے' اس کو دیکھ کر تو میں اسی وقت فریفتہ ہوگئی تھی۔''

ثریا آپا کا اپنا ہی نقطہ نگاہ تھا۔

''آپا! آپ محض چہروں کو اہمیت دیتی ہیں' لیکن سیرت اور کردار ہی سب سے اہم ہوا کرتے ہیں اور پھر مجھے زہرہ خاصی مغرور لگتی ہے۔''

عامر نے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اسے تو بھابی جیسی لڑکی کی تمنا تھی۔ جو گھر بار کو سنبھال سکے اور سب کی تلخ و ترش باتوں کو بھی امرت سمجھ کر پی لے۔

وہ جانتا تھا کہ گھر قربانیوں اور صبر کی عمارت پر بنتے ہیں۔

''چہروں کو اہمیت نہیں دے رہی پگلے! ہر طرح سے سوچا ہے۔ جگہ جگہ خوار ہونے سے ہم بچ گئے بیک وقت تم دونوں کا رشتہ طے ہو گیا۔ پھر وہ لوگ امیر کبیر ہیں' سارے معاملات کی از خود آفر کی ہے کہ سارے اخراجات وہ ساتھ باہمی رضامندی سے اٹھالیں گے۔ شادی ہال بھی انہوں نے اریج کر کے دیا ہے' ہر معاملہ میں ان کا رول ہے' ایسے نہیں جیسے ہم نے پہلے دھوکا کھایا تھا۔''

ثریا آپا کی تان آجا کر نیلم پر ہی ٹوٹتی تھی۔ عامر کچھ کہنے والا تھا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس کی کوئی بھی بات جو نیلم کے حق میں بولی جائے گی نیلم کے لیے مزید پریشانیاں اور دشواریاں ہی لائے گی۔

وہ دل ہی دل میں نیلم کی چھوٹی بہن ندا کو چاہتا تھا۔ وہ ہو بہو نیلم بھابی کا عکس تھی مگر یہاں تو نیلم بھابی کی ہی گنجائش نہ نکلتی تھی' کجا کہ ان کی چھوٹی بہن کے لیے گنجائش نکالی جاتی۔ بہتری اسی میں تھی کہ خاموشی اختیار کر لیتا۔

نیلم دیکھ رہی تھی کہ یہاں بھی دو رخی معاملہ روا رکھا جا رہا تھا' فری کو دینے کے معاملے میں بہترین چیزوں کا انتخاب کیا جا رہا تھا' جبکہ آنے والی بہو کے لیے قصداً کم مالیت کی چیزوں کا انتخاب کیا جا رہا تھا۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت۔

فری تو جس شے پر ہاتھ رکھتی تھی وہ فری کے لیے حاضر کر دی جاتی تھی جبکہ آنے والی کی آرزوؤں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

☆☆☆

پھر زہرہ دعاؤں کے حصار میں اس دہلیز پر آئی تو فریحہ نئے گلشن کی طرف چل دی۔

زہرہ نے جب اپنے لیے منتخب سوٹ دیکھے تو خاصے نخریلے انداز میں ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''آپ کی امی نے ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ میرے لیے منتخب نہیں کیا۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ سارے سوٹ آپ اپنی بہن کو ہی بھجوا دیں' میں نئے سرے سے اپنی پسند کی شاپنگ کروں گی، فی الحال تو سلوانے میں بھی دشواری ہو گی۔ اس لیے میں ریڈی میڈ سوٹ ہی لے لوں گی۔''

زہرہ سارے معاملات از خود ہی طے کرتی چلی جا رہی تھی اور عامر متعجب اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

''یہ تو اب ممکن نہیں ہے' کم از کم میرے بجٹ کے حساب سے تو ایسا مشکل ہے۔'' عامر ہچکچایا تھا۔ پھر ماں کی خفگی کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی بہادر ہوتا تو ندا آج اس کی جیون ساتھی بن چکی ہوتی۔

مگر زہرہ نے تو ضد پکڑ لی تھی۔ اس لیے مجبوراً عامر اسے شاپنگ کے لیے لے گیا۔ واپسی پر وہ ڈھیر سارے شاپنگ بیگز تھامے فاتحانہ انداز میں لوٹی تھی۔

''ارے، ابھی تو اتنے سارے کپڑے لیے تھے اب اور شاپنگ کر آئی ہو۔''

نگہت بیگم دبے دبے لفظوں میں اس کے لائے شوخ اور نکھرے رنگوں والے لباس دیکھ کر بولی تھیں۔ مبادا وہ برا ہی نہ مان جائے۔ یہ بھی — مجبوری کے تحت تھا کہ دوسری جانب ان کی اپنی بیٹی بیاہی تھی اور اس کی خوشی کا انحصار اب اس پر تھا کہ زہرہ کتنی خوش اور مطمئن رہتی ہے۔

''افوہ وہ بھی کوئی سوٹ ہیں' مجھے اتنے پھیکے رنگ پسند نہیں پھر وہ انتہائی سستے سے سوٹ تھے۔ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھائے' الٹا میرا دل اتنا خراب ہوا

''وہ اگر آپ لوگوں کو اتنے ہی پسند ہیں تو ایسا کریں فری بھائی کو بھیج دیں۔''

زہرہ لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک انداز میں بولی تھی۔

نگہت بیگم تو برا مان کر بھی خاموش رہ گئی تھیں مگر ثریا آپا خاموش نہ رہ سکی تھیں۔ ان کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

''یہ تو کوئی طور طریقہ نہیں ہے اور آج تک نہ دیکھا نہ سنا کہ لڑکی اپنے ملبوسات سسرال والوں کے منہ پر دے مارے۔ ہماری بہن بھی تو ہے، اس نے تو ایسی کوئی مین میکھ نہیں نکالی۔''

ثریا آپا نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

''ہونہہ! وہ بھلا کیا مین میکھ نکالیں گی' ان کی حیثیت ہی کہاں تھی کہ اتنے قیمتی ملبوسات زیب تن کرتیں۔ ہم نے ہر شے اعلا پائے کی منتخب کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کو اپنی اوقات کے مطابق دیا ہے' اب آپ لوگ شاید اتنا ہی دے سکتے تھے۔''

آخری جملہ اس نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا' نگہت بیگم تو سلگ ہی اٹھی تھیں۔ وہ کہاں عادی تھیں بہو کے ایسے لب ولہجہ کی۔

مگر وہ نیلم نہ تھی زہرہ تھی۔ جسے دوبدو جواب دینے آتے تھے' اور منہ پر باتوں سے تھپڑ برسانا بھی آتے تھے۔

''سن رہے ہو عامر! اور گڑ کھائے بیٹھے ہو۔''

نگہت بیگم کا سارا غصہ اب عامر کی جانب منتقل ہو گیا تھا جو ساری بات سن کر بھی بالکل پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں' زہرہ آپ کی ہی پسند ہے۔''

عامر نے یہ کہہ کر وہاں بیٹھنا بھی بیکار سمجھا تھا۔

پھر آئے دن کے جھگڑوں نے طول پکڑ لیا تھا۔ جس میں عامر بالکل خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا تھا۔ چپ کی مہر لگائے بیٹھا سب سنتا مگر بولتا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ماں کے حق میں نہ بیوی کی طرف داری میں' پھر دونوں گھرانے متاثر ہو رہے تھے۔ اگر یہاں زہرہ کا موڈ خراب ہوتا، دوسری طرف زاہد فری کو طعنہ دینے لگتا تھا۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو ایک گھرانہ کا رویہ دوسرے گھرانے پر اثر انداز ہونے لگا تھا اور رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگی تھی۔

یہ ایک سمجھوتہ تھا جسے دونوں اطراف کے گھرانے نبھا رہے تھے' اس کا سبب وہ وٹہ سٹہ تھا۔

☆☆☆

ایک سال ہونے کو آیا تھا' مگر زہرہ کے وہی ناز و انداز تھے۔ محض سجنا سنورنا اور شام کو آؤٹنگ کی غرض سے چل دینا۔ اگر ساس یا نند منع کرتیں تو زہرہ واویلا مچا دیتی تھی۔

زہرہ اکثر نیلم کو بھی بغاوت پر اکساتی تھی' مگر نیلم جانتی تھی کہ زہرہ کی خود سری کے کئی ایک جواز ہیں۔ دولت کی ریل پیل تھی' پھر وٹہ سٹہ کی شادی تھی سب سے بڑھ کر عامر کا رویہ تھا' اگر عامر اور سجیل کے رویے کو پیمانے میں رکھ کر تولا جاتا تو عامر پر ماں اور بہن کی کسی بات کا بھی خاطر خواہ اثر نہ ہوتا تھا' جبکہ سجیل تو ہر معاملہ میں ماں اور بہن کی بات کو حرف آخر قرار دیتا تھا۔ اس لیے نیلم اور زہرہ کی حیثیت میں فرق تھا۔

''میری بات سنو بہن! یہ کب تک چلے گا' آخر کب تک یوں ہی زہرہ بیٹھ کر کھاتی رہے گی' کھانے کی ٹرے کمرے میں لے جاتی ہے اور واپس میری بڑی بہو نوکرانی کی طرح اٹھا کر لے آتی ہے' ارے ابھی ہم ہیں جو اسے پکا پکا کر کھلا رہے ہیں' اس نے تو ایک دن اپنے شوہر کو ڈھنگ کا پکا کر نہیں کھلایا ہے' رہنا پڑے الگ تو عقل ٹھکانے آجائے۔''

نگہت بیگم غصیلے لہجے میں فریحہ کی ساس سے مخاطب تھیں' اگرچہ وہ ایک عرصہ سے برداشت کرتی چلی آرہی تھیں مگر اب سال سے اوپر ہو چلا تھا لیکن زہرہ تو ٹس سی مس نہ ہو رہی تھی۔

دوسری جانب فری پر ظلم و ستم توڑے جانے لگے۔ ادھر زہرہ خفا ہو کر میکے جاتی اور فری پر مصیبت آجاتی۔

''میں کہتی ہوں جب میری بچی ہی خوش نہیں تو تو کیوں اس کلموہی کو اس کی ماں کے گھر نہیں چھوڑ آتا۔''

اور پھر واقعی ایک مرتبہ زاہد نے طیش میں آکر

فری کو گھر سے نکال باہر کیا۔ فری روتی بلکتی ہوئی ماں کی دہلیز پر آن بیٹھی تھی۔

سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ثریا آپا بھی اس معاملے میں خود کو پہلی مرتبہ بے بس پا رہی تھیں۔ جمیل سے تو ہر بات منوالیا کرتی تھیں اور جمیل کے ہاتھوں نیلم کی وہ عزت افزائی کرواتی تھیں کہ نیلم کی آنکھیں اشک بار ہو جایا کرتی تھیں پھر فاتحانہ انداز میں نیلم کو دیکھ کر ایک ہی جملہ اکثر بولا کرتی تھیں۔

''جانتی ہو ناں مجھے بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر بات کرنے کا ڈھنگ بھلا کسے آتا ہوگا۔'' اس میں دھمکی بھی پوشیدہ ہوا کرتی تھی۔ جس کے خوف کے سائے میں آکر نیلم ہر وقت چابک دستی سے کاموں میں لگی رہتی تھی اور وہی کچھ کرتی جیسا کہ اس کی ساس اور نند کی منشا ہوا کرتی تھی..... مگر اس مرتبہ حالات مختلف تھے۔

فری ان کے لیے آزمائش بن گئی تھی جس دولت کی ریل پیل دیکھ کر انہوں نے شادی میں جلدی کی تھی' وہی دولت اب فری کے لیے طعنہ بن چکی تھی۔

''ارے کہاں دیکھی تھی اتنی دولت تم نے۔ کہاں دیکھے تھے اتنے عیش تم نے' تمہاری تو اوقات ہی نہ تھی' دو کوڑی کی اوقات تھی' فرش سے عرش پر لا بٹھایا ہے تم کو۔''

زاہد اس کا تمسخر اڑایا کرتے تھے اور فری رو دیتی تھی۔

پھر دوسری جانب جس خوبصورتی پر نگہت اور خود ثریا آپا فریفتہ تھیں' وہی زہرہ کا ہتھیار بن چکی تھی۔ عامر بیوی کی خوبصورتی کی چکا چوند میں آکر ماں اور بہن کی کوئی بھی بات سننے کا روادار نہ تھا۔ الٹا وہ اگر کبھی بولتا تو فقط اتنا ہی کہتا تھا۔

''زہرہ کی خوب صورتی پر تو آپ دونوں ہی مرمٹی تھیں' اب شکایات کا دفتر کھول کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔ ایک تو انسان پہلے ہی آفس سے تھکا ہارا آتا ہے اور پھر آپ لوگ شروع ہو جاتے ہیں۔''

فری ان دنوں جس دور سے گزر رہی تھی' اس میں یہ ناروا سلوک اور پھر گھر سے نکال دینا۔ اس پر ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ ماں اس کے آنسو دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں۔

مزید ستم یہ کہ دوسری جانب سے طلاق کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب پانی سر سے اوپر اٹھ چکا تھا' ان لوگوں کا کہنا تھا کہ عامر اور زہرہ کو علیحدہ گھر لے کر دیا جائے ورنہ زہرہ واپس آنے کو قطعی طور پر تیار نہیں ہے اور پھر اس کی واپسی نہ ہونے کی صورت میں فری بھی طلاق کے لیے انتظار کرے' اب ان لوگوں کو صحیح معنوں میں ہوش آیا تھا' اور وٹہ سٹہ کی اس شادی کی خرابی کا احساس ہوا تھا۔

وقت ہاتھ سے نکل جائے تو سوائے خسارے کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسا ہی اب ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ پھر نگہت بیگم نے قبل اس کے وہ اپنے بیٹے کو کھو دیتیں' نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے زہرہ کو بلا لیا تھا۔

''بیٹی! تم بس خوش رہو' ہماری خیر ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ ان کے لبوں سے پھسلا تھا۔ پھر زہرہ سارا دن آرام کرتی اور سر شام تیار ہو کر میاں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب نگہت بیگم اور ثریا آپا کو شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اس گھر کو صحیح معنوں میں چلانے والی نیلم ہی ہے' جس نے ہر ستم ہنس کر سہا مگر اف تک نہ کی۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ اب سب کا رویہ نیلم کے ساتھ نرم ہوتا جا رہا تھا۔

نیلم بھی مطمئن سی ہو گئی تھی کہ اب سب کو اس کی وقعت کا احساس ہو جائے گا۔ مگر قبل اس کے کہ سب کچھ بالکل نارمل ہو جاتا' زہرہ نے خوش خبری سنادی جو خوش خبری نیلم اتنے سال میں نہ سنا پائی تھی' اب دوبارہ سب کا جھکاؤ زہرہ کی جانب ہو گیا تھا۔ زہرہ کے ہزار نخرے تھے' وہ تو یوں بھی نخریلی سی تھی' اور اب اس حالت میں اس کے نخرے آسمان کو چھو رہے تھے۔

نت نئے پکوان بنتے اس کے سامنے سجائے جاتے مگر وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے انکار کر دیتی اور کبھی کبھار احسان عظیم کرتے ہوئے کھا لیتی۔ مگر

ا اور احساس ممنونیت جیسے کوئی لفظ اس کی
نری میں رقم نہ تھے۔
وہ ان بیاری خدمت گزاریوں کو اپنا حق سمجھ کر
صول کرتی تھی۔ نگہت بیگم بھی خوش تھیں' جو خوشی
تے کی اب تک ان کو نہ مل سکی تھی' اب وہ انہیں زہرہ
ی جانب سے ملنے والی تھی۔ جو تھوڑا بہت گلہ رہ
یا تھا عامر کے دل میں وہ بھی اب زہرہ کے حوالے
سے ڈھل گیا تھا۔ نیلم سارا دن زہرہ کے لیے فرمائشی
کھانے بناتی رہتی' جنہیں منہ میں رکھتے ہی زہرہ رد
کر دیتی تھی اور پھر اسے کوئی اور مینیو یاد آجاتا تھا' ایک
ن زہرہ کسی بات پر بحث کر رہی تھی تو نیلم نے اتنی
سارت کر لی۔
''دیکھو، اتنے مزے کی تو بنی ہے بریانی کھالو'
یخنی ہی پی لو' یہ تو بہت فائدہ مند ہے تمہارے اور
بچے کے لیے۔''
اس کا انداز حکمیہ نہ تھا بلکہ ملتجیانہ سا تھا مگر زہرہ
کو اس کا نصیحت آموز انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ اس
لیے کڑے تیور لیے بولی۔
''تم کو کیا معلوم، تمہارے کون سے بچے
ں؟'' نیلم کی آنکھ نم ہوگئی تھی' تب ہی ثریا آپا۔
گئیں
''نیلم اپنی منحوس نظریں سنبھال کر رکھا کرو' تم
ود تو کوئی خوشی ہمیں دے نہ سکیں' اب اگر زہرہ
میں یہ نوید دے رہی ہے تو کیوں نحوست پھیلا رہی
و' جاؤ دفعان ہو جاؤ۔''

☆☆☆

نیلم بالکل پرسکون تھی۔ وہ اپنی قسمت پر شاکر تھی۔
گلہ تھا تو فقط اپنے محبوب شوہر سے۔ جس نے
چاہت سے اپنا کر پرایا کر ڈالا تھا۔ پھر ایک دن جب
سب گھر والے کسی دعوت میں شریک تھے۔ گھر میں
نیلم رہ گئی تھی اور زہرہ اپنی طبیعت کی وجہ سے جا نہ سکی
تھی۔ اچانک زہرہ کسی کام کے لیے سیڑھیوں سے
تر رہی تھی کہ بری طرح سے پھسل گئی۔
جتنی دیر میں اسے ہاسپٹل لے جایا گیا' سب
کچھ ختم ہو چکا تھا' زہرہ اب کبھی مامتا کے جذبے سے
سیراب نہ ہو سکتی تھی' ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا'
زہرہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ باقی تو وہ جیسی بھی تھی،
مامتا کے حوالے سے اس نے بہت سے خواب دیکھے
تھے اور ہر خواب ادھورا رہ گیا تھا۔
ان ہی دنوں اچانک نیلم کو بخار نے آن گھیرا
تھا۔ سارا گھر الٹ پلٹ ہو رہا تھا' دوسری جانب نیلم
کا بخار کم ہونے میں نہ آرہا تھا' بالکل زردی مائل
رنگت ہو رہی تھی پھر ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے گھر
میں ننھے مہمان کی آمد کی نوید دی' سب کھوئی ہوئی
خوشیوں کو کسی اور صورت میں پانے کو بے تاب
تھے۔ عامر کی جانب سے نہ سہی تجمیل کی جانب سے'
اب بھی وہ دادی بن سکتی تھیں۔
نیلم کا یا پلٹ پر حیران تھی۔ ڈاکٹر کی تلقین کے
مطابق اسے سخت آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے
اب سب ہی اس کا خیال رکھنے لگے تھے۔ وہ اداس
تھی' کیونکہ جانتی تھی کہ تجمیل کی فکرمندی کی اصل وجہ
وہ بچہ ہے جو ابھی دنیا میں بھی نہیں آیا ہے۔

☆☆☆

جس دن اس نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا، وہ
مکمل ہوگئی تھی۔ سارے شکوے جو دل کے نہاں
خانے میں تھے مٹ گئے تھے۔ زہرہ نے محبت سے
اس کے گل گوتھنے بچوں کو چوما تھا' نہ جانے وہ کون سا
لمحہ تھا جب نیلم نے ایک بچہ اٹھا کر زہرہ کو دے ڈالا'
گود میں اٹھائے زہرہ متعجب تھی۔ کیا کسی کا اتنا بڑا
دل بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر زہرہ نے آبدیدہ ہو کر نیلم
کو گلے سے لگا لیا تھا' اس کا ظرف کتنا بلند تھا جبکہ وہ
اس کو طعنے ہی دیتی رہی تھی۔
ثریا آپا' نگہت بیگم سب خوش تھے' دونوں
بھابیوں کی گود بھر گئی تھی۔ زہرہ کے انداز میں جو
چڑچڑا پن عود کر آیا تھا' وہ بھی زائل ہو گیا تھا۔
نیلم کی مسلسل قربانیوں نے اس گھر کو نئی جہت
دی تھی۔ محبت کی جہت۔

☆☆

ہاجرہ ریحان

لڑکے کی ماں

صرف ایک سے دو ہفتوں کے وقفے کے بعد جو اس کو دیکھا تو بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''یہ اتنے سے دنوں میں کیا حالت بنالی تم نے ہیں؟ صدیوں کی بیمار لگ رہی ہو۔''

بے اختیار میں جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی تو وہ بھی بلا تامل مجھ سے لپٹ گئی۔

''آپ! پلیز میں کیا کہوں آپ۔''

وہ اپنی بات بھی مکمل نہیں کر پا رہی تھی، پورا وجود بخار کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کی کمزوری کو محسوس کر کے اسے سہارا دے کر صوفے پر لا بٹھایا اور پھر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی کیونکہ وہ میرا ہاتھ چھوڑنے پر راضی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی ایسی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر میرا غصہ میری انا، ضد یہاں تک کہ وہ لمبی چوڑی تقریر جو میں پورے راستے سوچتی ہوئی آئی تھی کہ کس طرح کس انداز میں مجھے سنانا ہے کہ بات بھی پہنچ جائے اور سننے والے ایسے لاجواب ہوں کہ منہ ہی چلاتے رہ جائیں یہاں تک کہ میرے آگے سب کی بولتی بند ہو جائے۔ سب ہی کچھ تو بھول گئی تھی واقعی اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

''آپ لوگوں کی ہی مہربانیاں سہہ رہی ہے اور کیا۔ میں پوچھتی ہوں کہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے کیا؟ مانا کہ اپنی ماں کی انا اور ضد بھی بحال رکھنا ضروری ہے مگر اب ایسا بھی کیا تھا۔ اسلام آباد سے آجاتا پھر سکون سے یہاں آکر بات کر لیتا بلکہ وہ کیا بات کرتا، ہماری شکایت بھی اسے دور کرتا۔ اصولاً بات تو ہم سے ہی کرنی چاہیے تھی آپ کے بیٹے کو مگر نہیں بھئی کتنے جذباتی ہو گئے ہیں آج کل کے لڑکے بھی، کہاں تو شادی سے پہلے ماں سے دو تین منٹ سے زیادہ بیٹھ کر سیدھے منہ بات بھی نہیں کریں گے اور کہاں شادی کرتے کے ساتھ ہی ماں سے زیادہ کوئی لائق گفتگو نہیں ملے گا ان لوگوں کو، بیوی کو اکیلا چھوڑ ماں کے پہلو سے چپکے رہیں گے۔''

میرے عین مقابل بیٹھی لڑکی کی ماں نے چمک کر کہنا شروع کیا اور میں جو اب تک اسی پر دھیان کیے ہوئے تھی، سمدھن صاحبہ کے طنز پر جواب دینے کے لیے منہ کھولنے ہی والی تھی کہ وہ کپکپاتی بول پڑی۔

''امی جان! پلیز مزید بات نہ بڑھائیں میں۔''

اس کو بیچ میں بولتا دیکھ کر سمدھن صاحبہ ایک دم طیش میں آ گئیں۔

''ہے ہے لڑکی اب اپنی ہی ماں کو چھوٹا بنواؤ گی تم؟ بس اسی دن کے لیے اب تک پال پوس کر بڑا کیا کہ سسرال ملتے ہی رنگ بدل لو.....؟''

ماں کی ڈانٹ سن کر وہ سہم کر ایک بار پھر مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی۔

ویسے بھی دھان پان سی تو تھی مگر عام لڑکیوں سے ذرا نکلتے ہوئے قد کی مضبوط کاٹھی کی حامل جب اچھی سی تیار ہو کر سامنے آتی تو بے اختیار بلائیں لینے کو دل چاہتا۔ گو ایسے جذبات کو ظاہر کرنے کی میں عادی نہیں تھی لہٰذا نظریں چرا جاتی اور ایسے بن جاتی جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہ ہو مگر وہ بھی جیسے میری پسند ناپسند جاننے کے لیے ضد پر اڑی رہتی۔

''ماما میں ٹھیک لگ رہی ہوں ناں کپڑوں کا

نا اور میک اپ زیادہ تو نہیں ہو گیا؟''

ایسے ہی کتنے سوالات کرتے اس کے چہرے پر ملامت دو چند ہو جاتی اور مجھے دل ہی دل میں اس پر اور پیار آ جاتا..... وقار ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ اپنی خوب صورتی اور دلکشی سے انجان کتنی بھولی ہے، اس پر تو ہر رنگ اچھا لگتا ہے، جیسے بھی بال بنائے سراپا پر خوب جچتا ہے۔ مگر میں یہ سب کہنے کے بجائے جان بوجھ کر اپنے چہرے پر عینک درست کرنے کی اداکاری کرتی ہوئی، ہوں ہاں، کر کے جیسے اسے فارغ کر دیتی مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بیٹے وقار کے ساتھ یہ دھان پان سی لڑکی بہت بھلی لگتی۔

تمام محلے دار، احباب، رشتہ دار یہاں تک کہ گھر پر آنے والے میرے چند طالب علموں کا بھی خیال تھا کہ وقار کی جوڑی آسمان پر خاص طور پر بنائی گئی ہے اور تعریف سن کر میری گردن تن جاتی ہاں یہ الگ بات کہ میں نے کبھی کسی کو اپنے اس احساس فخر سے آگاہ نہیں کیا بلکہ اپنی طبیعت کے مطابق اپنی خوب صورت اور خوب سیرت بہو کی تعریفوں پر ایک طرح کی بے نیازی دکھاتی، بات کو جلد از جلد نمٹا دیا کرتی تھی اس وقت میرے دل میں ذرہ برابر بھی یہ خیال آتا کہ وقار کی ہی طرح میں بھی چند ہی دنوں میں اس کی نازک طبع اور بھول پن پر فریفتہ ہو گئی ہوں تو میں بے حد جھنجھلا جاتی اور خود کو سمجھاتی۔

''لو بھلا کبھی کوئی ساس بھی اپنی بہو پر فریفتہ ہوئی ہے؟''

ایسا سوچ کر ہی جیسے میری انا، خودی اور ضد کو زبردست ٹھیس لگتی اور میں سنبھل کر خود کو سخت بنائی اور ظاہری طور پر اپنے رویے کو سخت گیر ہی رکھتی جیسا کہ میں مشہور تھی جی ہاں بس مشہوری کی حد تک.....

میرے ساتھ المیہ یہ تھا کہ میں اتنی تیز مزاج کی تھی نہیں جتنا کہ مشہور تھی۔ اس کی وجہ شاید ہمیشہ سے یہی تھی کہ بابا جانی نے مجھے اکیلے پالا تھا۔ اپنی ماں کو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد نہیں دیکھا اور بابا جانی جو کاروبار میں مصروف رہتے تو اکثر میری بے جا ضد بھی پوری کر دیتے شاید یہی وجہ تھی کہ بچپن سے ہی بے حد من موجی اور اپنی مرضی کی مالک ہو گئی

تھی پھر شوہر صاحب بھی کچھ ایسے دھیمے مزاج کے ملے کہ انہوں نے میرے غصے پر اپنی سہل پسندی اور نرم بول چال سے پردہ ڈالے رکھا مگر پھر بھی میرا مزاج ہر دو چار ہفتے بعد بگڑتا اور گھر میں موجود ہر کسی کو معلوم تھا کہ اب مجھے اکیلا چھوڑ دینے میں ہی ان کی خیر ہے۔

☆☆☆

ایسے میں جب شوہر صاحب نے اسے لانے کے لیے مجھے کہا تو میں بپھر گئی۔

''میں جاؤں اسے لینے کے لیے؟ مگر کیوں بھئی؟ وہ جو ابھی چند دن ہوئے اس گھر میں بہو بن کر آئی ہے اس کو لینے میں یعنی کہ لڑکے کی ماں جائے؟ بدتمیزی بھی وہ لوگ کریں لڑکی کو گھر بھی وہ لوگ بٹھائیں اور پھر آپ کہتے ہیں کہ میں بھیک منگوں کی طرح اس کو لینے جاؤں تاکہ وہ مجھے گھر سے ذلیل کر کے نکالیں۔ ہے ناں.....اب یہی ذلت اٹھانی رہ گئی ہے میری قسمت میں۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔''

میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں شوہر صاحب کو صاف لفظوں میں سنا ڈالا۔

''ارے بھئی آپ شاید بھول رہی ہیں کہ وہ گئی نہیں بلکہ آپ کے صاحبزادے نے اپنی نئی نئی بیوی کو گھر سے نکل جانے کا حکم فرمایا تھا اور اب میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موصوف یوں تو خود کو معمول کے مطابق مصروف رکھے ہوئے ہیں مگر اندر سے بے حد تکلیف میں ہیں۔''

شوہر صاحب بھی ہار ماننے والے کہاں تھے، ان کی تو ہمیشہ کی ہی عادت تھی کہ کبھی سختی سے یا تیز لہجے میں اپنی بات نہ منواتے بلکہ جب بھی میں سوچ سمجھ بنا دوٹوک فیصلے صادر کر دیتی اور ان کو فیصلے پر نظر ثانی کروانی ہوتی تو آہستہ روی اور بہت ہی احتیاط سے وہ مجھے احساس دلاتے کہ میں ٹھیک نہیں کر رہی اور میں جو ہمیشہ سے کافی حد تک تند خو اور خود سر تھی، ان کی بار بار کی تلقین پر غیر محسوس طریقے سے ان کی ہی بات مان کر اپنا کہا واپس لے لیتی اور اب یہ سب پھر سے ہو رہا تھا۔

مجھے اس بات پر شوہر صاحب پر بھی غصہ تھا کہ وہ اتنا کچھ ہو جانے پر بھی ابھی تک مجھے ہی جھک جانے کو کہہ رہے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنے بیٹے وقار پر بھی شدت سے غصہ آنے لگا جس کے اس جذباتی عمل نے بلاوجہ مجھے ایک بار پھر لڑکی کے گھر والوں کی نظروں میں لڑکے کی ظالم ماں کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ سب کیا دھرا وقار کا تھا اور الزام مجھ پر آ گیا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ پہلی ہی رات لڑکی کو اس کے کمرے میں سجائے بٹھائے جانے کے بعد میں جو کئی دنوں سے لڑکی والوں پر بے حد خفا تھی لڑکی کو بے نقط سنانے پہنچ چکی تھی۔

''میں نے مانا کہ وقار نے پسند کی شادی کی اور یہ کہ مجھے یا شوہر صاحب کو کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ شوہر صاحب سے زیادہ مجھے اپنے چھوٹے سے حلقہ احباب کا شدت سے احساس تھا، ایسے میں اگر وقار نے ایک اچھی مستحکم نوکری لگتے ہی اپنی پسند ہمارے سامنے رکھ دی تو ہم دونوں کو حیرت تو ضرور ہوئی مگر ایک طرح سے سکھ کا سانس بھی لیا۔

میں نے روایتی ساس کی طرح تمہیں یا تمہارے گھر والوں سے کسی قسم کی کوئی باز پرس نہیں کی، تمہاری یا تمہارے خاندان کی تاریخ کھود نکالنے کا نہ تو مجھے شوق تھا اور نہ ہی وقت، زندگی تو تم دونوں کو گزارنی ہے میں نے ہر ممکن حد تک تمہارے گھر والوں کو سہولت دی۔ کسی قسم کی کوئی خواہش یا ڈیمانڈ بھی نہیں کی، یہاں تک کہ مایوں، مہندی، نکاح، رخصتی کی تاریخ تک تم لوگوں نے اپنی پسند سے طے کیں اور ہم دونوں میاں بیوی بے چوں چرا مانتے چلے گئے، مگر کچھ جگہوں پر میں خاموش نہیں رہ سکی۔ آخر کو چھوٹا سا ہی سہی ہمارا بھی ایک خاندان ہے۔ رشتہ دار، دوست احباب، سب ہی شادی میں بلائے جائیں گے بعد میں ملنا ملانا ہوگا ایسے میں تم لوگوں کو

اپنی نہیں تو ہماری عزت کا کچھ خیال کر لینا چاہیے تھا مگر بھئی شاباش ہے تمہارے گھر والوں پر کہ مجھے زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا اور مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ یہ شادی تو محبت کی بنیاد پر طے ہوئی تھی پھر اس میں اس قدر رضد، بدتمیزی آخر کیوں؟''

میں آگے بھی کچھ کہتی مگر اسی لمحے وقار اپنے چھوٹے بھائی شیراز اور چند کزنز کے ہمراہ کمرے کے باہر دروازہ چھکائی کی رسم کے لیے آ گیا۔ میں نے دلہن کے کپڑے ایک بار پھر درست کیے کمرے میں چل پھر کر تمام انتظامات کا اطمینان کر لینے کے بعد باہر نکل گئی، میری بات کا لڑکی نے کس قدر صدمہ لیا تھا، یہ جان کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور ایک طرح سے لگا کہ شاید مکاری کر رہی ہے، صبح ناشتے کی میز پر وقار کی زبانی اس کی حالت کا معلوم چلا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی لاپروائی دکھانے لگی۔ بقول وقار کے رات ہی دلہن صاحبہ کو بخار چڑھ گیا جو صبح سویرے جا کر کچھ کم ہوا ہے۔

''عجیب بے وقوف لڑکی نکلی یہ تو، اتنی ڈرپوک، اتنی بزدل، توبہ توبہ وقار بیٹا! یہ آخر تم کو پسند کیسے آ گئی؟ کیا ساری عمر اس کے لیے سفارشیں کرتے پھرو گے تم؟''

میری بات پر شوہر صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''یہ بات تو ہے آپ کے صاحبزادے نے اپنی ماں سے بالکل مختلف بالکل الگ لڑکی پسند کر لی ہے اور مجھے تو یہی فکر ہے کہ ابھی سے آپ نے بچاری بچی کا یہ حشر کرنا شروع کر دیا ہے تو اب آگے کیا ہوگا؟''

''بھائی ب تک تو ماما سہتی چلی آ رہی تھیں مگر اب ماما کی باری ہے، اب تو یہ دیں گی ٹف ٹائم بھابھی کو آپ بس دیکھتے جائیں۔'' شیراز، وقار کو آنکھ مارتا ہوا چکا۔

''میری کیا مجال کہ میں ٹف ٹائم دوں اب تک تو وہ لوگ ہی دیتے رہے ہیں مجھے ٹف ٹائم۔'' میں نے اونچی آواز میں خود کلامی کی۔

''ٹف ٹائم کی بات نہیں ہے، وہ بہت سیدھی ہے بہت معصوم ماما پلیز۔'' وقار نے اپنے باپ کی طرح دھیما لہجہ پایا تھا اور اس کا مجھے سمجھانے کا انداز بھی ویسا ہی تھا۔

''دیکھو وقار بیٹا! میں کوئی غلط بات نہیں کر رہی۔ میں کیا تمہارے بابا نے بھی بہت بار محسوس کیا کہ لڑکی والوں نے میری ایک ایک بات پر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ بھئی یہ بھی عجیب مسئلہ ہے ہمارے معاشرے کا شادی بیاہ کی رسومات بھی پوری کرنی ہیں اور ساتھ میں ایک دوسرے کو نیچا بھی دکھانا ہے اور بھئی زیادتی جس نے بھی کی ہو، الزام ہمیشہ لڑکے کی ماں پر ڈال دیتے ہیں۔ لڑکے کی ماں نہ ہوئی جلاد ہوئی، ایک ذرا صاف گلاس میں پانی کیا مانگ لیا میں نے کہ ان لوگوں نے مایوں کے روز کس قدر واویلا مچایا تم خود بھی تو موجود تھے، بولو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ پھر وہ شادی ہال، ارے بھئی، حیثیت کے کم ہوتے تو چلو کوئی بات بھی تھی مگر یہ کیا کہ عین قبرستان کے برابر شادی ہال ٹھہرا لیا؟ وہ تو شکر کرو کہ شیراز کو اس ہال کے محل وقوع کا پہلے سے معلوم تھا تو مجھے پتا چل گیا۔ سوچو ہمارے رشتہ دار آتے تمہارے بابا کے احباب اور میرے کئی ایک کولیگز اور طالب علم کیا کہتے سب؟ جبکہ میں نے ان سے کوئی بھی فرمائش نہیں کی مگر ایک شادی ہال بدلنے کا کہہ کر تو جیسے میں ایک محاذ پر کھڑی کر دی گئی بہت عجیب لوگ ہیں بھئی ذرا ذرا سی بات پکڑ لیتے ہیں؟''

میں نے جھنجھلا کر وقار کو یاد دلانے کی کوشش کی۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہیں بیگم صاحبہ مگر دیکھیں، ابھی یہ سب باتیں لڑکی سے کر کے کیا فائدہ ہوگا۔ ویسے بھی اب وہ ہمارے گھر کی بچی ہوگئی ہے پھر خیر شکر سے تقریبات مکمل ہوگئی ہیں، اب آپ بھی پرانی باتیں درگزر کر دیں۔''

شوہر صاحب نے وقار کی طرف سے مجھے سمجھایا

تو وقار بھی متمنی سا ہو کر میرے سامنے مودب ہو گیا۔

''مگر بابا..... پارٹی تو ابھی باقی ہے ولیمہ بھی تو ہونا ہے ابھی۔''

شیراز ناشتے کی میز پر ڈٹ کر کھانے کے علاوہ ہماری باتوں سے خوب مزے لے رہا تھا۔

''اچھا چلو مانا کہ رات مجھ سے زیادتی ہو گئی..... مگر یہ تمہاری بیوی اتنی نازک ہے، تم ہے شکایت کر کے اس کا دل نہیں بھرا اور ابھی تک اس کا غم غلط نہیں ہوا؟ صبح مجھے اور تمہارے بابا کو سلام تک کرنے نہیں آئی بلکہ تم کو بھیج دیا کہ جا کر میری باتیں سب کے سامنے کرو؟''

میں نے شیراز کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بار پھر وقار کو گھسیٹا۔

''وہ ہی آ رہی تھی ماما، میں نے کہا پہلے میں بات کر لیتا ہوں پھر جانا میں اسے لے کر آتا ہوں۔''

وقار جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''دیکھا آپ نے ابھی سے میرے بیٹے کو میرے خلاف کر رہی ہے۔''

مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہاں تو میں سوچتی تھی کہ میں اپنے دونوں بیٹوں کی بیویوں کو اپنی بہو نہیں بلکہ بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ مجھے شوق بھی تو تھا ناں بہت بیٹی کا اور اب جبکہ موقع ہاتھ لگ گیا تھا تو کچھ اس طرح حالات و واقعات نے رنگ دکھایا تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ظالم جابر ساس کے روپ میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ مگر یہ بھی میری خوش نصیبی کہی جا سکتی ہے کہ جس قدر میں خود کو الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتی بہو اتنا ہی مجھ سے جڑتی جاتی۔

باورچی خانے میں کھانا پکانے سے لے کر گھر میں آنے والے مختلف کام کرنے والوں سے کام لینے میں بھی میرے ساتھ ساتھ لگی رہتی، میں بھی جیسے چند ہی ہفتوں میں غیر محسوس طریقے سے اس کی عادی ہو گئی اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ میں صبح سب سے پہلے چائے پیتی ہوں تو بلا ناغہ میرے جاگنے کا انتظار کرتی رہتی یہاں میں کمرے سے باہر آتی گرم چائے تازہ اخبار کے ساتھ میرے آگے رکھ دیتی۔

ایک عدد شوہر صاحب کے ساتھ شب و روز گزارتے اور پھر دو لڑکوں کی پرورش کرتے کرتے اتنی چھوٹی موٹی سہولیات کے ملنے کو تو میں جیسے بھول ہی گئی تھی۔ واقعی ٹھیک ہی کہتے ہیں لوگ بیٹی ہوتی ہے رحمت ہے پانی مانگوں یا نہ مانگوں، کالج سے واپسی پر جیسے ہی لاؤنج تک پہنچتی، وہ ٹھنڈا پانی کا گلاس لیے منتظر نظر آتی..... کپڑے استری کر دیتی اور طالب علموں کے جانے کے بعد ادھر ادھر بکھری ہوئی کتب سمیٹ کر سلیقے سے میری پسند کے مطابق کتابوں کے ریک پر سجا دیتی اور پھر اس کے اندر جیسے کوئی گلوکومیٹر لگا ہوا تھا یہاں میری شوگر کم یا زیادہ ہونے لگتی سب سے پہلے الہام اسے ہو جاتا..... فوراً سدباب کرنے سر پر آ دھمکتی۔

''ماما دیکھیں لگ رہا ہے آپ کی شوگر کم ہو رہی ہے۔ آپ پلیز یہ تھوڑا سا میٹھا کھالیں فوراً میں دوائیاں لاتی ہوں جب تک۔''

ایسے میں اس کا معمول کا ڈرا سہما ہوا سا وجود اپنی ساخت بدل کر گھنا ٹھنڈا سایہ دار درخت بن جاتا اور مجھے اس کا اپنے لیے اس قدر پریشان ہونا بہت نہیں تو اچھا ضرور لگتا تھا۔ ویسے بھی صبح سے دوپہر تک تو کالج میں وقت گزر جاتا۔ گھر آ کر باورچی خانے میں جلد از جلد کام نمٹا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد شام تک ہم سب ساتھ چائے پیتے تو اس وقت تک دن کے ڈھل جانے کے احساس اور دوسرے دن کی مصروفیات کا سوچ کر ہی کچھ اور نہ سوجھتا۔ اس پر کبھی کبھار کالج سے کچھ طالب علم بھی ملنے چلے آتے۔ لہٰذا اپنے معمولات کو جلد از جلد نمٹا کر میں اپنی کمرے کی راہ لیتی اور اس طرح میں واقعی درگزر کر کے آگے بڑھ گئی تھی مگر بھلا ہو سمدھیانے کا کہ آئے دن ان کے ہاں سے ایسا کچھ ہوتا رہتا کہ بھرتے ہوئے زخم ایک دم ہرے ہو جاتے اور نوک جھونک اکثر ہی کسی نہ کسی بات پر ہو ہی جاتی، یہ الگ بات تھی اب میں نے اپنے گھر کے ماحول کو خراب نہ

کرنے کا عہد کرلیا تھا، لہٰذا جیسے بھی جو بھی بات ہوتی میرے یا شوہر صاحب تک ہی محدود رہتی۔

☆☆☆

دوسری طرف وقار بھی اپنی بیوی کے خاندان والوں سے کم ہی ملتا یہاں تک کہ اس کی بیوی بھی کچھ اس طرح ہمارے گھر میں رچ بس گئی تھی کہ اب تو مہمان کی طرح اپنے میکے جاتی اور چند گھنٹے گزار کر واپس آجاتی۔

جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سمدھیانے میں پڑھے لکھے ہوؤں کے باوجود ماحول بے ڈھنگا تھا رات دیر تک جاگتے اور پھر سارا دن چڑچڑے لب و لہجے میں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بات پر بھائی بہن الجھتے رہتے۔ ماں باپ کا یہ عالم تھا کہ کچھ بھی ہو۔ ان کو غلطی سے بھی کسی محفل کا دعوت نامہ مل جاتا تو دن رات، بچوں کے امتحان، بیماری کچھ بھی نہ دیکھتے اور تمام بچوں کو گھسیٹ گھساٹ کر محفل میں پہنچ جاتے روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر کچھ اس طرح سے گھر کے اخراجات بڑھا لیے گئے تھے کہ مہینے کی آخری تاریخوں تک چڑچڑاہٹ عروج پر پہنچ جاتی۔

پھر سب سے بڑا نقص تو یہ تھا کہ دکھاوا بے حد تھا کسی بھی معاملے میں میانہ روی تو چھو کر نہیں گزری تھی اسی بات پر ہم سے بھی کئی ایک موقعوں پر نوک جھونک ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وقار کی تربیت پر مجھے بھروسا تھا ہم نے اپنے دونوں بیٹوں کو بہت لاڈ سے پالا تھا دنیا کی ہر آسائش بھی مہیا کی مگر بے جا خواہشات اور بلاوجہ کی ضد ہم نے بھی نہیں مانی تھی لہٰذا اب دونوں بچے اپنی پڑھائی مکمل کر کے اچھی ملازمت کر رہے تھے مگر گھر میں سادہ ماحول ہی تھا۔

ہم دونوں میاں بیوی برسرروزگار تھے لہٰذا وقار کی تنخواہ کی ہمیں کبھی چاہت نہ ہوئی جس کے نتیجے میں وقار کو پوری اجازت تھی کہ جس طرح چاہے خرچا کرے۔ اس کو دو چار بار سسرالیوں نے کسی پارٹی یا پکنک پر لے جانے کی ضد کی جس کو وقار نے ایک دو بار تو پورا کر دیا مگر پھر جیسے وقار سمٹ گیا۔

اب ان کی طرف سے کہیں بھی چلنے یا گھومنے کے پروگرام پر بات ہوتی بھی تو وقار صاف انکار کر دیتا اور سب سے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ بہو کو بھی اپنے گھر والوں کی خواہش پوری کروانے کے لیے وقار کے پیچھے لگتے نہیں دیکھا۔ میں نے یہ تو سمجھ لیا تھا کہ شروع سے ہی سمدھیانے والے جو مجھ سے سلوک کر رہے تھے اس کے پیچھے مقصد مجھے اپنے بیٹے کے معاملات سے الگ کرنا تھا اور اب میرے الگ ہونے پر جو وقار اور اس کی بیوی نے ان سب کو بہت خندہ پیشانی اور تحمل سے پیچھے دھکیلا تو ان سب کو بے اختیار ہنسنے لگ گئے تھے۔

وقار تو مجھے بتاتا بھی نہیں کہ اس کے سسرال سے اب کی بار کیا پلان کیا جا رہا ہے مگر جب وہ ان لوگوں کو انکار کر دیتا تو الزام سارا مجھ پر ڈال کر کسی نہ کسی طرح بات مجھ تک ضرور پہنچائی جاتی۔ میں بھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑانے لگی۔

''بھئی مجھے تو اپنی بہو سے کوئی شکایت نہیں آپ کو اپنے داماد سے ہو تو آپ جانیں آپ کا داماد جانے پھر میں تو ہوں ہی بری لہٰذا مجھے اس معاملے میں نہ ڈالیں۔''

میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر عید کے چوتھے روز سمدھن صاحبہ کے جلے بھنے انداز میں فون پر بات کرنے پر آخر کار کہہ ہی دیا۔ مگر وہ بھی خوب گھاک تھیں۔ بتا کر ہی دم لیا کہ وقار میاں نے شادی کے بعد پہلی عید پر صرف بہو صاحبہ کو عیدی اور تحفہ دلایا جبکہ بہو کے چھوٹے بھائی بہنوں اور ماں باپ کو تحائف کے قابل نہ سمجھا..... دل تو چاہا کہ فوراً پوچھوں کہ تو کیا آپ لوگوں نے لڑکے والوں کا تحائف سے گھر بھر دیا ہے مگر پھر خود پر قابو پالیا۔ میں کوئی تحائف کی لالچی ہوں کہ اس طرح لڑکی والوں سے خواہشات کا اظہار کرتی پھروں؟

''میں نے کہا ناں میں اس سلسلے میں کچھ نہیں

کہہ سکتی..... آپ کا داماد ہے، آپ خود ہی بات کرلیں اس سے اور جہاں تک رسم ورواج کی بات ہے تو ایسی کوئی رسم نہیں سنی کہ شادی کی پہلی عید پر لڑکی کے پورے گھر والوں کو تحائف دیئے جاتے ہیں۔ ہم متوسط طبقے کے نوکری پیشہ لوگ ہیں ہمارے ہاں اتنا دکھاوا نہیں ہوتا بہرحال آپ وقار سے ہی بات کریں۔''

سمدھن صاحبہ کچھ نہ کچھ بولتی ہی چلی جارہی تھیں۔ اپنے فلاں فلاں رشتہ دار کے حوالہ جات کے ساتھ مجھے باور کروارہی تھیں کہ ایسی ہی رسومات میں ان کی زندگی گزری ہے، خیر میں نے چند اور باتیں کرکے فون بند کردیا اور مجھ سے اپنی بات منوا نہ سکنے کی جلن تھی یا وقار کی پسند کی شادی کا گھمنڈ کہ وقار کے آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد سے واپس آنے کا انتظار کرنے کے بجائے دوسرے ہی دن سمدھیانے سے بہو کا چھوٹا بھائی آ گیا کہ آپا کو امی جان نے بلایا ہے۔

عید کی چھٹیاں تھیں میں بھی گھر پر موجود تھی بہو کو دیکھا تو وہ عجیب کشمکش میں دکھائی دی مجھے اصل بات کا تو علم نہیں تھا مگر اتنا محسوس ہوا کہ رات میں ہی وقار کے ساتھ سمدھن صاحبہ کی تلخ کلامی کے نتیجے میں یہ سزا تجویز کی گئی تھی کیونکہ بہو نے بھی اپنے میکے والوں کے بجائے وقار کا ساتھ دیا تھا، لہٰذا سزا دونوں کو ہی ملنی تھی۔

وقار اسلام آباد میں بیٹھا ہوا تھا اور یقیناً اس وقت آفس کے اہم سیمینار میں مصروف تھا لہٰذا اس سے بات بھی کرنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ ادھر بہو کا چھوٹا بھائی کھڑے کھڑے بہو کو ساتھ چلنے کی ضد کیے چلے جارہا تھا۔

آخر کار بہو چلی گئی اور اچانک گھر بہت سونا سونا سا لگنے لگا، اوپر سے پریشانی الگ ہوگئی پتا نہیں یہ بے ڈھنگے جذباتی لوگ بچی کو کیا کیا پٹی پڑھائیں اور پھر وقار کو سزا دینے کے چکر میں اپنی ہی بچی کا نقصان نہ کر بیٹھیں عجیب وغریب وہم آنے لگے۔

میں نے بڑی مشکل سے دو تین گھنٹے کاٹے اور ساتھ میں مسلسل وقار کو بھی فون کرتی رہی۔ اللہ اللہ کرکے وقار کا فون آ گیا میں نے خیر خیریت پوچھ کر جلدی جلدی تمام احوال سنایا۔ دوسری طرف سے گہری سانس لی گئی۔

''ماما، آپ ٹھیک ہی کہتی تھیں ان لوگوں کے لیے بہت ہی گھمنڈی اور بدتمیز لوگ ہیں۔''

وقار کے آخر کار میرے مطابق بات کرنے پر یوں تو مجھے خوشی ہونی چاہیے تھی مگر ابھی میں خوش ہونے کے بجائے ڈر گئی تھی۔

''ہاں مگر بیٹا بہو کا اس میں کیا قصور ہے؟ تم ابھی اس کو فون کرکے کہو کہ فوراً واپس آئے!'' میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''نہیں ماما رہنے دیں اسے بھی وہیں۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اس کو روک کر وہ مجھے جھکائیں گے اور مجھے سزا دیں گے تو کر لینے دیں یہ سب بھی میں نے خود ہی کہا تھا کہ لے جانا ہے اپنی بیٹی کو تو لے جائیں بہت ہوگیا تماشا!''

وقار سخت لہجے میں اپنا فیصلہ بتانے لگا۔

''ارے ارے دیوانے ہوگئے ہو کیا؟ شادی کے پانچویں مہینے میں ہی اس قدر اکڑ اور ضد.....اور بھئی تم نے آخر بہو کو کیوں بھیجا..... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آرام سے بات ختم کردیتے۔ وہ کوئی زبردستی تھوڑی تمہاری بیوی کو لے جاسکتے ہیں؟''

میں اب مکمل طور پر بدحواس ہو چکی تھی۔

''ارے چھوڑیں ماما بس.....جو ہوگیا ہے ٹھیک ہے آپ بس اپنا خیال رکھیے گا۔ میں باقی باتیں واپس آکر ہی کروں گا آپ سے۔''

وقار نے جلدی جلدی مجھے دلاسا دے کر فون بند کردیا۔ اس قدر اپنائیت اور بے رونقی کے ساتھ اپنے بچے کی خوشحال اور پرسکون زندگی کی دھجیاں اڑتے سوچ کر ہی مجھے ہول اٹھنے لگے۔

☆☆☆

وقار کے واپس آنے کے تین چار دن گزرنے

لے باوجود بھی ان لوگوں کی طرف سے مکمل خاموشی رہی، ادھر وقار بھی ہر دم یہ ہی ظاہر کرتا جیسے اسے پرواہ نہ ہو۔

آخر کار ہم دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ مگر شوہر صاحب کا یہ مشورہ کہ میں خود ہی جا کر بہو کو واپس لے آؤں مجھے ایک آنکھ نہ بھایا۔

اب تک تو جو کچھ ہو رہا تھا سمدھیانے کی طرف سے ہوتا تھا تو چلو پھر بھی قابل قبول تھا کہ میں اپنے ضمیر سے مطمئن تھی مگر اب کی بار تو وقار صاحب نے بے ڈھنگا پن دکھا کر مجھے بھی شرمسار کر دیا تھا اور میں اپنے سمدھیانے میں جھکا سر اور شرمندہ نظر لے کر جاتی کیا اچھی لگوں گی؟ جبکہ اس بات پر پورا یقین رکھتی تھی کہ اب کی بار سمدھیانے گئی تو میرا وہ حشر کیا جائے گا کہ ساری عمر سنبھلتے گزر جائے گی مگر پھر کیا کرتی ماں ہوں ناں۔

ادھر وقار کی خاموشی اور دوسری طرف جب بہو کی بیماری کا سنا تو رہا نہ گیا۔ تمام خدشات ایک طرف کر کے میں نے وقار کو اپنے ازلی سخت لہجے میں دوٹوک فیصلہ سنایا اور اسے فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد شوہر صاحب، میں اور وقار سمدھیانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

بہو کے آنے تک دونوں طرف خاموشی رہی اور اسے اس حالت میں دیکھ کر تو میرا دل بھی نہیں تھا کہ میں ایک منٹ بھی یہاں اور بیٹھوں..... ایسے لوگ جو اپنی ہی بیٹی کی اس حالت کو دیکھ کر خود فکر تردد کرنے کے بجائے ہمیں پریشان دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں ان سے کیا شکایت، کیسی بات چیت میں نے تھوڑی دیر بعد محبت سے بہو کو دھیرے دھیرے دلاسا دیا پھر وقار اور شوہر صاحب کو چلنے کا کہا تو سمدھن صاحبہ ایک بار پھر چمک گئیں۔

''ہاں جس طرح آئے ہیں، ویسے ہی لوٹ جائیں یہ تو یہیں رہے گی یہ نہیں جائے گی اب آپ لوگوں کے ساتھ، ہمیں بھاری نہیں ہے اپنی بیٹی!''

وقار غصے سے کھڑا ہو گیا۔ بہو نے مجھے سختی سے بھینچ لیا اور شوہر صاحب نے بات سنبھالنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔

''وقار! میں نے شیراز کو فون کر دیا ہے وہ ہمیں لینے کے لیے اپنی گاڑی لے کر نکل چکا ہے میں اور تمہارے بابا جب تک قریبی پارک میں ٹہل لیں گے۔ تم اسی وقت بہو کو لے کر ڈاکٹر صمد کے ہاں جاؤ اور ٹھیک سے اس کا چیک اپ کرا کر دوائی وغیرہ لے کر آنا۔ کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گی تمہاری اب سمجھے؟''

میری بات سن کر وقار اور بہو کو تو جیسے بہانا مل گیا جھٹ ایک دوسرے کا سہارا لیے دونوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے، ادھر سمدھیانے والے جز بز ہو گئے۔

''ارے ارے یہ آپ کون ہوتی ہیں اس طرح فیصلے کرنے والی، سمجھ کیا رکھا ہے خود کو؟''

سمدھن صاحبہ نے بات ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ایک بار پھر مجھ پر وار کیا۔

''میں لڑکے کی ماں ہوں اور جس لڑکی کو میرا بیٹا ابھی لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہے وہ اس کی بیوی اور میری بہو ہے لہٰذا میں لڑکے کی ماں کی حیثیت سے اپنے بچوں کے فیصلے کروں گی اور آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتیں اور فضول بحث کرنے کی تو مجھے عادت ہی نہیں ہے۔''

ہم دونوں میاں بیوی بھی سلام دعا کرنے کے بجائے سمدھن صاحبہ کی ہائے ہو کو خاطر میں لائے بغیر فوراً ہی گھر سے باہر آ گئے۔ پارک چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ شام کا وقت تھا اور کئی گھٹے سہمے دنوں کے بعد آج کی شام بہت نکھری ہوئی کھلی کھلی سی لگ رہی تھی چند منٹ خاموشی سے پارک کی جانب چلنے کے بعد اچانک شوہر صاحب کھلکھلائے اور لگاوٹ سے مخاطب ہوئے۔

''ہاہا..... آج صحیح معنوں میں لڑکے کی ماں لگ رہی ہو۔''

☆☆

شازیہ جمال

اے دل بے خبر

نین تارہ کو ماں نے بچپن سے ایک ہی بات سکھائی تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے۔ پیسے کے بل بوتے پر دنیا کی ہر چیز، ہر خوشی، ہر آسائش خریدی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ عزت، محبت اور رشتے بھی۔ نین تارہ نے ماں کی بات پلو سے باندھ لی تھی۔

''اور یہ جو تمہاری دادی، تائی، تایا وغیرہ تم سے اتنی محبت اور لاڈ پیار جتاتے ہیں اس سب کے پیچھے بھی وجہ ہماری دولت ہے۔'' تمہارے ابا کی فیکٹری کی وجہ سے ہی ان سب کے اتنے ٹھاٹ ہیں۔ ورنہ بھائی صاحب کی بھلا اوقات ہی کیا ہے؟ معمولی سے ریٹائرڈ ماسٹر۔

لیکن انہوں نے کس قدر چالاکی سے تمہارے ابا کی وفات کے بعد اپنے دونوں بیٹوں کو فیکٹری پر لگا دیا۔ گویا وہ ہی اس لاکھوں مالیت کی فیکٹری کے اصل مالک ہوں۔ لیکن میں بھی انہیں یہ بات بھی بھولنے نہیں دوں گی کہ تمہارے ابا کی اس فیکٹری پر صرف تمہارا حق ہے۔''

شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے تک ماں نے یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں بٹھا دی تھیں۔

''ان کی چاکری کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس آدھے کچے پکے گھر کو شاندار بنگلے میں تمہارے ابا نے ہی تبدیل کیا تھا۔ بھائی صاحب سال میں ایک آدھ بار اس پرانے گھر کو وائٹ واش کروا لیتے تھے یہ بھی غنیمت تھا۔''

اماں کے لہجے میں جو تفاخر تھا وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ نین تارہ کے ہر اک انداز سے جھلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

''وردہ! یار ایک کپ اچھی سی چائے تو پلا دو۔''

ناولٹ

بھرپور نیند لینے کے بعد وہ فریش ہوکر باہر نکلی تھی۔ دن چڑھ آیا تھا اور وردہ غالباً دوپہر کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں ہی کچن میں مصروف تھی۔

''خالی چائے نہیں وردہ! نین تارہ کے لیے ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی بنادو بیٹا!'' تائی اماں کو اس کا صبح خالی پیٹ چائے پینا اچھا نہیں لگتا تھا۔

''جی اماں!'' وردہ نے کچن سے ہی جوابی ہانک لگائی تھی۔ نین تارہ دادی کے تخت پر ان کے ساتھ نیم دراز ہوکر پاؤں جھلاتی تسبیح کے دانے گرانے لگی۔

''بیٹا! صبح جلدی اٹھ کر سب کے ساتھ ناشتہ کیا کرو۔ اب دن کے گیارہ بجے ناشتہ کروگی تو دن کا کھانا کب کھاؤ گی؟'' الفاظ کے معمولی ردوبدل کے ساتھ دادی کی روزانہ کی جانے والی یہ نصیحت اسے ازبر ہوچکی تھی۔ تب ہی لاپروائی سے کہنے لگی۔

''میں جتنی بھی کوشش کرلوں دادی! اتنی صبح صبح نہیں اٹھا جاتا مجھ سے''

''جس رات صبح جلدی اٹھنے کی نیت کرکے سوؤ گی دیکھنا خود بخود آنکھ کھل جائے گی۔ بس نیت پکی ہونی چاہیے۔ عمل کی توفیق اللہ بندے کو خود عطا کردیتا ہے۔''

''اف دادی! صبح صبح اتنی مشکل باتیں۔ نیت، عمل، توفیق وغیرہ وغیرہ.....''

دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی وہ اٹھ بیٹھی۔ وردہ اس کے لیے گرما گرم ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹرے اٹھائے چلی آئی۔ نین تارہ رغبت سے ناشتہ کرنے لگی۔ یہ ساری عنایت وہ حق سمجھ کر وصول کرنے کی عادی تھی۔

☆☆☆

''وردہ کہاں ہو؟''

زارون پورے گھر میں اسے آوازیں لگاتا پھر رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں پورے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے؟'' کفگیر ہاتھ میں تھامے بالوں کا گول مول جوڑا بنائے چولہے کی تمازت سے سرخ پڑتا چہرہ لیے وہ کچن کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی۔

''جلدی سے میری یہ شرٹ پریس کردو۔ ہارون بھائی نے ارجنٹ فیکٹری بلایا ہے۔''

''میں اس وقت مصروف ہوں۔ ابا کے لیے الگ سے پرہیزی کھانا بھی بنانا ہے۔ تم نین تارہ سے کہہ دونا۔''

نین تارہ اپنے مخصوص جھولے پر پاؤں اوپر کیے موبائل پر مصروف تھی۔ چھوٹے سے باغیچے میں سفید پھولوں کے گنج کے پاس پڑا یہ جھولا اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔

''نین تارہ! میری شرٹ پریس کردو۔'' اس نے شرٹ گول مول کرکے نین کی طرف اچھالی۔

''میں؟'' نین تارہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''تمہیں یاد ہے نا کہ۔''

''ہاں ہاں مجھے پتا ہے کہ ایک بار استری کرتے ہوئے تمہارا ہاتھ جل گیا تھا۔ دوسری بار اتفاقاً میری شرٹ تم سے جل گئی۔ اور تیسری بار تم نے عہد کرلیا کہ آئندہ کبھی استری کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس دن تم نے میری شرٹ اتفاقاً نہیں بلکہ انتقاماً جلادی تھی۔''

''لگتا ہے تمہیں اپنی یہ والی شرٹ بھی کچھ زیادہ عزیز نہیں ہے۔'' اس کے تیور دیکھ کر دانت کچکچاتے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے شرٹ جھپٹ لی۔ ان کی تکرار سنتی وردہ جلدی سے چولہا بند کرتی باہر نکل آئی تھی۔

''اوہو! مجھے دو، ابھی کرکے لاتی ہوں۔''

وردہ شرٹ لے کر استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

''مجھے ایسی نظروں سے گھورنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی جس کا کام اسی کو ساجھے۔'' نین تارہ جھولے سے اٹھ کر ڈھٹائی سے کہتی زارون اور اس کی ملامت کرتی نگاہوں کو نظرانداز کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟ کیا کہہ رہا تھا زارون تم سے؟''

الماری کا پٹ بند کرکے زاہدہ نے اس سے پوچھا۔

''شرٹ استری کرنے کو کہہ رہا تھا۔'' موبائل چارج پر لگاتے ہوئے نین تارہ نے جواب دیا۔

''تم نے کردی؟''

''میں کر ہی نہ دیتی اس کو۔'' نین تارہ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ زاہدہ نے گہری سانس لی۔

''اچھا کیا، تم کوئی ملازمہ لگی ہوئی ہو ان کی۔ خود کرلیتا یا پھر وردہ سے کہتا۔ ملازمہ رکھنا ویسے بھی ان کی

خاندانی روایت کے خلاف ہے تو پھر کریں اپنا ہر کام خود۔"

☆☆☆

ہوا کے سنگ کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ادھر ادھر اڑتے بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹپا ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ نین تارہ نے اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر برستی بوندوں کو محسوس کیا اور پھر سرشاری باہر نکل آئی۔ اسے بارش بہت پسند تھی۔

"زارون! رکو..... بات سنو تو....." سامنے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جاتے زارون کو اس نے سرعت سے روکا تھا۔ "کتنا مزے کا موسم ہے نا، کچھ چٹ پٹا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ جیسے کہ سموسے، دہی بھلے، چاٹ یا پھر گرم گرم پکوڑے....." منہ میں پانی لیے وہ جیسے اسے بھی للچا رہی تھی۔

"یہ سامنے ہی تو مارکیٹ ہے۔"

ہاتھ لمبا کر کے یوں اشارہ کیا گویا مارکیٹ واقعی اس کے ہاتھ کے سامنے ہی تو ہو۔

"بات یہ ہے ڈیئر کزن! ایک بار جب میں برستی بارش میں یہ سامنے والی مارکیٹ تک گیا تو آگے سے راستہ بلاک تھا۔ دوسری بار گیا تو راستے میں پھسل کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ تیسری بار میں نے عہد کرلیا کہ آئندہ کبھی بھی برستی بارش میں مارکیٹ نہیں جاؤں گا۔"

نین تارہ سخت بدمزہ ہوئی۔ یعنی کہ حد ہوگئی۔ اس کے الفاظ اسی کو لوٹائے جا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی اسی وقت وردہ نے کچن کی کھڑکی سے سر نکال کر آواز دی۔

"آجاؤ تم دونوں، گرما گرم پکوڑے اور چائے تیار ہے۔" نین تارہ کی ساری بے زاری اڑنچھو ہوگئی۔

"مجھے ایسی نظروں سے گھورنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی جس کا کام اسی کو ساجھے۔" وہ مزے سے کندھے اچکا کر کہتا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ نین تارہ اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☆☆☆

اگلے کچھ روز بہت مصروف گزرے۔ اس کے بی اے کے سالانہ پیپرز شروع ہوگئے۔ پڑھائی سے اسے ویسے بھی کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ روزانہ کالج میں جدید تراش خراش کے لباس پہن کر اپنی دوستوں کو مرعوب کرنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ کیفے ٹیریا ادھر ادھر کی گوسپ، کلاس فیلوز کے افیئرز کا حال سننے میں اسے بہت دلچسپی تھی۔ پڑھائی سے اس کی جان جاتی تھی۔ مزید ان دنوں امتحانات نے ادھ موا کردیا۔ اس نے خود کو کمرے تک ہی محدود کرلیا تھا۔ تائی اماں کو اس کے کھانے پینے کی فکر ستانے لگی تو وردہ کے ہاتھ وقتاً فوقتاً اس کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتیں۔ زاہدہ الگ مزاج کی تھیں۔ گھر کی ذمہ داریوں میں کبھی جیٹھانی کا ہاتھ نہیں بٹایا۔

وردہ نے تعلیم مکمل کرتے ہی گھر کی آدھے سے زیادہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی۔ اسے کبھی اس بات سے مسئلہ نہیں رہا تھا کہ نین تارہ بھی اسی گھر کی بیٹی ہے تو پھر وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ کیوں نہیں بٹاتی؟ وہ ماں کی طرح صلح جو اور صاف دل تھی۔ زاہدہ چچی کا مزاج، ان کا سرد رویہ ایک طرف نین تارہ اسے بہت عزیز تھی۔

"لو بھئی ڈیئر کزن! منہ میٹھا کرو۔ خیر سے سہرے کے پھول کھلنے کا وقت آ ہی گیا۔"

وہ جوں ہی آخری پیپر دے کر گھر لوٹی دروازے پر ہی زارون سے ٹاکرا ہوگیا۔ جس نے ہاتھ میں پکڑی آدھی گلاب جامن اس کے منہ میں تقریباً ٹھونس سی دی۔ نین تارہ کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

"پریشان مت ہو۔ میں اپنی نہیں۔ ہارون بھائی کی بات کر رہا ہوں۔" اس کی حالت سے حظ اٹھاتا وہ مسکرا دیا۔ نین تارہ فوراً اندر کی جانب بھاگی۔

☆☆☆

"اماں! یہ میں کیا سن کے آرہی ہوں؟ کیا واقعی ہارون بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ اوہ..... مطلب ڈھیر سارا ہلہ گلہ" چادر اور بیگ بیڈ پر اچھالتی وہ پرجوش ہوئی۔

"حد ہے نین تارہ! تم اتنی ایکسائٹڈ ہو رہی ہو۔ انہوں نے بالا ہی بالا اتنے بڑے فیصلے کرلیے اور تمہیں بتانا تک گوارا نہیں کیا، تمہیں ذرا بھی اپنی بے عزتی محسوس نہیں ہو رہی؟" نین تارہ جہاں کی تہاں تھم سی گئی۔

''جس بات پر تمہیں ان سے شدید خفا ہونا چاہیے اسی بات پر تم خوشی سے اچھل رہی ہو۔'' ماں نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔

''ہاں تو میں انہیں بخشوں گی تھوڑی۔ ابھی جا کر پوچھتی ہوں.....''

زاہدہ نے کھینچ کر اسے دوبارہ بیڈ پر بٹھا دیا۔ ''بے وقوف! تمہیں اپنی ناراضی کیش کروانے کا سنہری موقع مل رہا ہے تو اس کو ہاتھ سے جانے مت دو۔''

ماں اسے جو سمجھانا چاہ رہی تھیں وہ اچھی طرح سمجھ گئی۔ وہ تو ان کی آنکھ کا اشارہ تک سمجھ لیتی تھی۔ اتنی سیدھی سی بات بھلا کیسے نہ سمجھ پاتی۔

☆☆☆

کھانے کی ٹیبل پر پر اس کی غیر موجودگی کو سب سے پہلے تایا ابا نے ہی محسوس کیا تھا۔

''ارے بھائی ہماری تارہ کہاں ہے؟ پیپروں کی تھکاوٹ نے خدانخواستہ بیمار تو نہیں کر ڈالا۔''

''میں بھی کہوں آج ٹیبل پر اتنی خاموشی کیوں ہے؟'' تائی اماں بھی بول پڑیں۔

''خاموشی نہیں ''سکون'' کہیں اماں۔'' زارون کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔ تائی اماں نے اسے گھورا۔

دادی، وردہ، ہارون بھی کھانے سے ہاتھ روکے زاہدہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''ہونا کیا ہے بھائی صاحب! جب سے اسے ہارون کی رشتے والی بات کا پتا چلا ہے اسی بات کو دل پر لے لیا ہے کہ کسی نے اسے بتایا کیوں نہیں۔ تب سے کچھ کھائے پیے بغیر منہ سر لپیٹ کر پڑی ہے۔'' تایا ابا کے تو دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ ان کے حلق سے نوالہ اتر بھی کیسے سکتا تھا۔ بغیر کچھ کہے فوراً اٹھے اور تھوڑی دیر بعد نین تارہ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وہ سب پر ایک خفا سی نظر ڈالتی اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''تو ہماری تارہ ہم سے ناراض ہے؟''

''آپ تو مجھ سے بات ہی مت کریں ہارون بھائی۔ منگنی کروالی اور مجھے بتانا تک گوارا نہیں کیا۔ اتنی ہی غیر اہم ہوں میں آپ سب کے لیے۔'' فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی۔

''ارے بھئی کیسی منگنی؟ کہاں کی منگنی؟ فرد جرم عائد کرنے سے پہلے پوری بات تو سن لو۔ ابھی صرف لڑکی پسند کی ہے۔ ان لوگوں نے ہمارا گھر بار دیکھنے آنا ہے۔ اگر میں ان کے مطلوبہ معیار پر پورا اترا تب ہی باقاعدہ ہاں ہوگی۔ اور تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے میں تمہیں اگنور کروں گا۔''

نین تارہ نے ماں کی طرف دیکھا۔ جو بے تاثر چہرہ لیے۔ چمچے سے پلیٹ میں پڑے چاول ادھر ادھر گھما رہی تھیں۔ نین تارہ نے گہری سانس کھینچی۔

''خیر اب آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میرے اتنے قیمتی آنسو تو ضائع ہو گئے ناں؟ خمیازہ تو آپ کو بھگتنا ہی پڑے گا۔''

''منظور ہے جو تم کہو۔''

''تو پھر ٹھیک ہے آپ کی شادی کی شاپنگ کے لیے میں آپ سے الگ رقم لوں گی وہ بھی تگڑی سی۔''

''وعدہ رہا۔'' ہارون نے مسکراتے ہوئے سر خم کیا۔

''اب تو خوش ہو جاؤ ندیدی قوم! خوامخواہ سب کا کھانا ٹھنڈا کروادیا۔ میں سمجھا پتا نہیں کتنی دھواں دھار ناراضی ہے۔ اور نجانے کتنے دن چلے گی۔ مگر تم تو چند ہزار روپوں کے وعدے میں ہی نپٹ گئی۔''

سلاد کی پلیٹ اپنی طرف کھسکاتا زارون اسے چڑا رہا تھا۔ زاہدہ نے چبھتی ہوئی نظر اس ''منہ پھٹ'' پر ڈالی تھی۔

☆☆☆

آج ہارون اور گھر بار دیکھنے لڑکی والوں نے آنا تھا۔

دادی سے صلاح مشورے کے بعد تائی اماں نے کچن سنبھال لیا۔ وردہ گھر کا کونا کونا چمکانے میں لگی ہوئی تھی۔ دادی باہر تخت پر براجمان تسبیح کے دانے گرنانے کے ساتھ ساتھ وردہ کے گھٹرا پے کے گن بھی گاتی جا رہی تھیں۔ زارون ہنسا۔

''واہ دادی! ایک تیر سے دو شکار خدا کی عبادت اور پوتی کی تعریفیں ایک ساتھ۔''

''ایسی گنوں والی میری بچی جس گھر میں بھی

جائے گی اجالا کردے گی۔'' ان کا لہجہ وردہ کی محبت سے لبریز تھا۔

''اور اپنی دوسری والی نیک پروین کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مجھے تو لگتا ہے محترمہ جہاں بھی قدم رنجہ فرمائیں گی سمجھیں اندھیر ہی اندھیر۔''

جھولے کی چرچراہٹ ایک دم رک گئی تھی۔ زارون نے مسکراہٹ دبائی۔

''اللہ نہ کرے۔'' دادی نے اسے زوردار چپت لگائی۔

''تو اور کیا سونے، کھانے اور ناراض ہونے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے تجھ کو۔ لکھ کر رکھ لیں میری بات دادی! جس گھر میں بھی آنسہ نین تارہ صاحبہ جائیں گی آپ کی ناک کٹوا کر رہیں گی۔''

''بے فکر رہو۔ ہم اسے ایسے کسی گھر بھیجیں گے ہی نہیں جہاں ہماری ناک کٹنے کا خطرہ ہو کیوں دادی؟''

گیلے پائنچے جھٹک کر نیچے کرتی وردہ ذومعنی سا مسکرائی۔ دادی بھی مسکرانے لگیں۔

ان کی ذومعنی مسکراہٹ کا پس منظر سمجھتے ہوئے زارون نے خوش گوار سا قہقہہ لگایا۔ نین تارہ جھولا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب تک وہ تن فن کرتی ان کے سر پر پہنچی تب تک تائی اماں زارون کو کسی کام سے باہر بھیج چکی تھیں۔

''نین تارہ! آؤ آج پہننے کے لیے کپڑے سلیکٹ کرتے ہیں۔ مہمان بھی بس تھوڑی دیر تک پہنچنے والے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہم تیار ہو جائیں۔''

وردہ اسے ہاتھ سے کھینچتی اپنے ساتھ لے گئی۔

☆☆☆

عظمیٰ کے گھر والوں کو ہارون دل و جان سے پسند آیا تھا۔ ان کے گھر کی خواتین جن نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں، تائی اماں کو اپنے بیٹے پر بے ساختہ پیار آگیا تھا۔ ورنہ صبح سے ہی ان کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ اتنے اہم موقع پر بھی زاہدہ نے بے مروتی کی انتہا کردی۔ کام میں ہاتھ بٹانا تو دور کی بات کسی قسم کی خوشی اور تعریف کا ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ بلکہ عجیب ناقدانہ نظروں سے آنے والوں کو جانچتی اور تولتی رہیں۔ لیکن تائی اماں کی ساری کلفت دور ہونے لگی تھی۔

دادی نے منگنی وغیرہ کے جھنجھٹ میں پڑنے بجائے ڈائریکٹ شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات کی۔ تائی اماں اور تایا ابا نے ہمیشہ کی طرح ان کی خواہش کا احترام کیا۔

تھوڑے سے پس وپیش کے بعد لڑکی والوں نے بھی اگلے مہینے کی تاریخ دے دی۔

'توبہ ہے آج کل کے لوگوں پر بیٹیاں اتنی بھاری پڑ گئی ہیں۔ بوجھ کی طرح سر سے اتارنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔'' زاہدہ نے ناک چڑھا کر تبصرہ کیا۔ دادی اور تائی اماں دانستہ خاموش رہیں۔

گھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں۔ ہارون نے وعدے کے مطابق ہزار ہزار کے کئی نوٹ بغیر گنے نین تارہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ صبح ان سب کا شاپنگ پر جانے کا پروگرام۔

''مجھے سخت زہر لگتا ہے جب تمہاری تائی ہر فنکشن کے لیے وردہ اور تمہارے ایک جیسے کپڑے بنواتی ہیں۔ جیسے یونی فارم پہن رکھے ہوں۔''

نین تارہ نے موبائل سے نظریں ہٹا کر ماں کو دیکھا۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھیں۔ تائی اماں خاندان کی تقریبات عید وغیرہ کے تہوار کے موقع پر ہمیشہ وردہ اور اس کے ایک جیسے کپڑے ہی بنواتی تھیں۔ اس بار بھی یقیناً وہ ایسا کرتیں۔ لیکن زاہدہ نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن نین تارہ کو فلونے آلیا۔ تائی اماں، زاہدہ اور وردہ بازار جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھیں۔ نین تارہ کے بغیر بھلا وردہ کو شاپنگ کا خاک مزہ آنا تھا۔ وہ سخت بدمزہ ہوئی۔ اس کی لاکھ منت سماجت کے باوجود بھی نین تارہ بازار چلنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ناچار وردہ بدلی سے ماں اور چچی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

ان کے جانے کے بعد دادی اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں۔ نین تارہ لاؤنج میں پاپ کارن سے بھرا باؤل لیے صوفے پر آڑی ترچھی نیم دراز اپنی پسندیدہ مووی دیکھنے لگی۔

''یہ آج ہمارے گھر کی ساری سگھڑ خواتین کہاں چلی گئیں؟ خالی کچن بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔'' زارون کچن کا دروازہ بند کر کے لاؤنج میں چلا آیا۔

''شاپنگ پر گئی ہیں۔'' ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر نین تارہ نے جواب دیا۔

گلابی کاٹن کے شلوار قمیض میں نیٹ کا ہم رنگ دوپٹہ لیے وہ اس وقت خود بھی گلابی گلابی سی ہو رہی تھی۔ اوپر سے اس کی لمبی سیاہ پلکیں۔ زارون نے بمشکل اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

''تو کیا آج کی تاریخ میں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا؟''

''باہر سے کچھ آرڈر کر لو۔ بلکہ میرے لیے بھی کچھ منگوا لو۔ قسم سے بہت زور کی بھوک لگی تب ہی پاپ کارن سے کام چلا رہی تھی۔'' باؤل گود میں رکھتی وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''اور وہ بے چاریاں جو شاپنگ سے تھکی ہاری واپس آئیں گی۔ ان کا کیا؟''

''یہ ان بے چاریوں کو شاپنگ پر جانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔''

''چہ چہ نین تارہ! کتنی خود غرض ہو تم۔ وہ جو روز تمہارے لیے اتنا کچھ کرتی ہیں تم ایک دن ان کے لیے کھانا تک نہیں بنا سکتیں۔'' ریموٹ اس کے ہاتھ سے لے کر وہ یونہی کھڑے کھڑے چینل بدلنے لگا۔ نین تارہ بری طرح چڑ گئی۔

''تم کیوں میرے سر پر سوار ہو رہے ہو؟ جانتے تو ہو مجھے کھانا وغیرہ بنانا نہیں آتا۔ اگر تمہیں ان سے اتنی ہمدردی ہو رہی ہے تو ان کے لیے بھی کچھ باہر سے منگوا لو۔''

''ظاہر ہے وہ تو میں منگوا لوں گا۔ ویسے خیر تو ہے شاپنگ کا پروگرام بنے اور تم نہ جاؤ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔''

''فلو ہو رہا ہے مجھے اس لیے نہیں گئی۔'' زکام زدہ آواز میں کہتے اس نے ٹشو سے اپنی ناک رگڑی۔

''خیر اتنا تو میں بھی جانتا ہوں اس معمولی سے فلو کے پیچھے شاپنگ چھوڑنے والی نہیں ہو تم، اصل معاملہ کچھ اور ہے؟'' ریموٹ اس کی جانب اچھالتا وہ باہر نکل گیا۔

''پکا خبیث ہے یہ۔ اماں اس کے بارے میں بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔'' بڑبڑاتی وہ پھر سے صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

☆☆☆

شام ڈھلے ڈھیر سارے شاپنگ بیگز کے ہمراہ ان کی واپسی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آ گئے۔ بری کے جوڑے جھلمل کر رہے تھے۔ تائی اماں نے ایک ایک جوڑا کھول کر ہارون کو دکھایا۔ ان کے سنجیدہ چہرے پر مدہم مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔

''اماں! مجھے کیا پتا ان چیزوں کا۔''

''ارے واہ! کیسے نہیں پتا، شادی کے بعد جب ہماری عظمیٰ بھابھی یہ جھلملاتا سوٹ پہن کر آپ کے سامنے اتراتے ہوئے گزریں گی تب آپ اس جوڑے اور اس کو پہننے والی کی تعریف میں بیٹھے زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہوں گے۔''

زارون کی بات پر زوردار قہقہہ پڑا تھا۔ ہارون مزید جھینپ گئے۔ تائی اماں نے ہمیشہ کی طرح وردہ اور نین تارہ کے لیے سارے فنکشنز کے ایک جیسے کپڑے لیے تھے۔ جنہیں دیکھتے ہی نین تارہ نے خاصی ناک بھوں چڑھائی۔

''اتنے ڈل کلرز، میں تو اس بار کچھ مختلف پہننے کا سوچ رہی تھی۔'' وردہ کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے اتنے شوق سے سارے جوڑے پسند کیے تھے۔ مگر نین تارہ سے واقعی کچھ بعید نہیں تھا۔ اگلے دن نین تارہ زاہدہ کیساتھ جو جوڑے خرید کر لائی، انہیں دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایسے بھاری کامدار سوٹ جو بری کے جوڑوں کو بھی مات دے رہے تھے۔

زاہدہ نے سب کے رنگ بدلتے چہروں پر رہے تھے ایک فاتحانہ نظر ڈالی اور نین تارہ کو سب کچھ سمیٹ کر اپنے کمرے میں لے جانے کو کہا۔

''اوہ تو اس ''بے موسمی'' فلو کے پیچھے یہ وجہ کارفرما تھی۔'' زارون نے کندھا مار کر اس زور سے ٹھوکا دیا کہ

شاپنگ بیگز اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچے۔ تلملا کر اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن تب تک وہ سیٹی پر کوئی شوخ سی دھن گنگناتا باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

تایا ابا سے مشاورت کے بعد زارون نے شادی کے کارڈز پر نام لکھنے کا کام سنبھال لیا۔ تب ہی تائی اماں تھکے تھکے انداز میں صوفے پر آ بیٹھیں۔

''دیکھ لیں اماں! پہلے بیٹے کی شادی کی تیاریوں نے آپ کو اتنا تھکا دیا ہے۔ ہماری باری پر نہ جانے آپ کا کیا حال ہوگا۔'' زارون کارڈ چھوڑ کر ان کے کندھے دبانے لگا۔

قریب ہی نیچے قالین پر نین تارہ اپنے کیوٹکس سے سجے ہاتھوں پر تنقیدی نظر دوڑاتی پھونکیں مار رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر وردہ ڈھیر سارے کشن پر کور چڑھانے میں مصروف تھی۔

''غیر برادری میں رشتہ کرتے وقت سو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تمہاری دفعہ تو مجھے ان جھمیلوں میں پڑنا ہی نہیں پڑے گا۔''

''دس از ناٹ فیئر اماں! اگر آپ گھر کی مرغی دال برابر والا معاملہ کرنے کا سوچ رہی ہیں تو میں اس ناانصافی پر شدید احتجاج کروں گا۔'' تائی اماں نے اسے زوردار دھپ لگائی۔ وہ ہنسنے لگا۔ اسی وقت نین نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس ساری گفتگو کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ اس کی تمام تر توجہ اپنے ناخنوں پر تھی۔

دادی اور تائی اماں عظمیٰ کے کپڑے، جوتے وغیرہ کا ناپ لینے گئی تھیں۔ لیکن باتوں باتوں میں چوڑی کا ناپ لینا بھول گئیں۔ شام کو یاد آیا تو زارون کے سر ہوگئیں کہ ابھی جا کے لے آؤ، شادی میں بھلا دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ زارون جھنجلایا۔

''افوہ اماں! مانا کہ وہ بھائی کی ہونے والی سسرال ہے کیا میں یوں شادی سے پہلے اکیلے ان کے گھر منہ اٹھا کر جاتا اچھا لگوں گا؟'' بات تو معقول تھی۔ تائی اماں لمحہ بھر کو سوچ میں ڈوب گئیں۔

''اچھا ایسا کرو نین تارہ کو ساتھ لے جاؤ'' وردہ تو ابھی نہانے کے لیے گئی ہے۔''

نین تارہ اپنے کمرے سے نکل کر باغیچے کی طرف جا رہی تھی کہ تائی اماں نے ایسی افراتفری مچائی، اسے زارون کے ساتھ روانہ کر کے ہی دم لیا۔

''تو یہ ہے ایسی بھی کیا قیامت آ گئی۔ میں تم از کم اماں کو تو بتا دیتی اپنے جانے کا۔'' زارون کے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔

''تھوڑی دیر ہی لگے گی۔ ابھی واپس آ جائیں گے۔ تمہیں کہیں اغوا کر کے نہیں لے جا رہا جو چچی پریشان ہو جائیں گی۔''

''کیا بول رہے ہو؟ کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ اور یہ بائیک تو آہستہ چلاؤ۔ مرواؤ گے کیا؟'' نین تارہ چلائی۔

''مرواؤں گا تو مروں گا بھی ساتھ ہی۔'' وہ مزید ترنگ میں آ گیا تھا۔ نین تارہ نے بوکھلا کر اسے کندھے سے دبوچ لیا۔

زاہدہ کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جو باہر کا منظر انہیں نظر آ رہا تھا اس نے ان کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔

زارون کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی بحث میں الجھی نین تارہ اور اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتا زارون.....''

ان کا دل چاہا کھینچ کر ایک تھپڑ نین تارہ کے منہ پر دے ماریں۔ وہ اس کے لیے کیا سوچے بیٹھی تھیں اور وہ کیا کرتی پھر رہی تھی۔ گہری سانس کھینچتے ہوئے انہوں نے بمشکل اپنے اندر اٹھتے اشتعال پر قابو پایا۔ ہارون کی شادی ہو جائے پھر اس معاملے کو ہلکا نہیں لوں گی۔ کل اماں جی اور بھائی صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے بعد تو بالکل نہیں۔

انہیں وہ منظر بھولتا ہی نہیں تھا۔

''کیا چیز پریشان کر رہی ہے آپ کو؟'' ماں جی کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ عبدالرحمن ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے تشویش سے ان کا جھریوں زدہ چہرہ دیکھ رہے تھے۔

''نین تارہ.....! میرے عبداللہ کی نشانی۔'' ماں جی سسکی تھیں۔ ''نجانے کیوں دل کو دھڑکا سا لگا

رہتا ہے۔ اپنے عبداللہ کو میں کھو چکی ہوں۔ اس کی اکلوتی نشانی کو نہیں کھونا چاہتی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ جانتی ہیں نا کہ عبداللہ کی کیا خواہش تھی۔ نین تارہ ہمیشہ اسی گھر میں رہے گی ہمارے زارون کی دلہن بن کر۔''

''لیکن زاہدہ.....''

''زاہدہ سے میں خود بات کرلوں گا۔ خیر سے ہارون کی شادی ہوجائے پھر زارون اور نین تارہ کے معاملے پر مل بیٹھ کر بات کریں گے۔ ویسے بھی زارون اب اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا ہے۔ ہارون کے ساتھ مل کر فیکٹری کا تقریباً سارا کام سمجھ لیا ہے اور.....''

وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن زاہدہ کے اندر اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔

''ایسا تو میں مر کر بھی نہیں ہونے دوں گی۔'' انہیں اب جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔

☆☆☆

گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہوگئے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نین تارہ نے ماں کے کہنے میں آکر زرق برق کپڑے تو لیے تھے لیکن انہیں پہنتے ہوئے اسے خود بہت آکورڈ لگ رہا تھا۔ بارات والے دن تو حد ہی ہوگئی۔ فوٹو سیشن کے بعد وہ اسٹیج سے نیچے اتر رہی تھی کہ دلہن والوں کی طرف سے کسی لڑکے نے اسے آواز دے کر کہا۔

''سنیں..... ادھر آپ کے ہزبنڈ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''جی؟'' نین تارہ کا چہرہ پل بھر میں فق ہوا تھا۔ کامدار فالئی رنگ کے غرارہ کو دونوں چٹکیوں سے اوپر اٹھائے وہ ہونق پن سے اس لڑکے کو دیکھنے لگی۔

''جی..... میں نے کہا ادھر نیچے آپ کے شوہر آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''ایکسکوزمی! میرے کوئی شوہر نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''اچھا..... لیکن.....'' مجمل سا ہوتا وہ کان کھجانے۔ پاس سے گزرتی دو لڑکیوں کی کھی کھی، نین تارہ سرخ چہرہ لیے تیز تیز قدم اٹھاتی نیچے اتری تھی۔

☆☆☆

''یہ میری بیٹی ہے نین تارہ!''

زاہدہ نے خاص طور پر بتول بیگم کو اس سے ملوایا تھا۔ بند یا ٹھیک کرتی، محبت میں سلام کرکے آگے بڑھتی نین تارہ کو بتول بیگم نے خاصی پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ ان کی باتوں سے زاہدہ کو لگا کہ وہ اچھے خاصے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنے برسرروزگار بیٹے کے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ زاہدہ نے کچھ سوچ کر ہی نین تارہ کو ان سے ملوایا تھا اور اب ان کے چہرے پر سجے خوش گوار تاثرات دیکھ کر زاہدہ کو اپنے اندر گہرا اطمینان اترتا محسوس ہوا۔

دلہن گھر آچکی تھی۔ اور اب رخصتی کے بعد کی رسمیں ادا کی جارہی تھیں۔

نین تارہ نے واپس آکر سب سے پہلے کپڑے تبدیل کیے تھے۔ لائٹ بلو کلر کے جارجٹ کا سادہ شلوار قمیض پر جارجٹ کا دوپٹہ اوڑھتے اس نے گویا سکھ کی سانس لی تھی۔

''ارے یہ تو اپنی نین تارہ ہے۔ میں خوامخواہ ساری شادی میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ یہ کون بن بلائی خاتون گولہ گنڈا بنی گھوم رہی ہیں۔''

ہارون سے نیگ لینے کے لیے زارون اور وردہ ان کے کمرے کے سامنے ان کا راستہ روکے رکے تھے کہ نین تارہ کو آتا دیکھ کر زارون شرارت سے مسکراہٹ دباتا بولا۔ نین تارہ اسے گھورتی ہوئی دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

ہارون نے ہنستے ہوئے تینوں کے ہاتھ پر پیسے رکھے تو اندر جانے کی اجازت ملی۔

''اگر تم عین وقت پر نہ دھمکیں تو ہارون بھائی کو نیگ کے پیسے دو کے بجائے تین حصوں میں نہ بانٹنے پڑتے۔''

''ارے واہ..... میں کیوں نہ آتی۔'' وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے اپنے اپنے نوٹ گن رہے تھے۔

''اچھا سنو.....'' زارون نے سرگوشی کی، نین تارہ غیر محسوس انداز میں اس کی طرف تھوڑا جھکی۔ اس سے

پہلے وہ کچھ کہتا زاہدہ اسے کلائی سے دبوچ کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ زارون اور وردہ ہکا بکا بیٹھے رہ گئے۔

☆☆☆

''تم کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہو نین تارہ! جو تمہیں ایک ایک بات سمجھانی پڑے۔ کون لگتا ہے وہ تمہارا جس کے ساتھ ایسے جڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ محض تایا زاد اور بس وہ تم سے بلاوجہ چھیڑ خانی کرتا ہے اور تم اتنی بے وقوف ہو کہ حد نہیں۔''

نین تارہ حیرت سے ماں کو دیکھے گئی۔ یہ وہ کیا کہہ رہی تھیں؟ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

''جانتی ہو جن لڑکیوں کے سر پر نہ باپ ہو نہ بھائی، وہ ہر کسی کے لیے تر نوالے سے کم نہیں ہوتیں۔ جنہیں سالم نگل کر وہ ڈکار تک نہ لیں۔''

نین تارہ کی آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔

''اور ان سب کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بلکہ تمہاری آڑ میں وہ تمہارے ابا کی فیکٹری ہم سے ہتھیانا چاہتے ہیں۔ تمہیں زارون کے پلے باندھ کر۔ نہ انہیں اس مکان میں سے تمہیں حصہ دینا پڑے گا اور نہ ہی فیکٹری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ تر نوالہ سمجھ کر نگل جائیں گے تمہیں۔ اور لوگوں کی واہ واہ الگ سمیٹنے کا موقع مل جائے گا کہ یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنایا ہے۔ جبکہ تم اس سے کہیں بہتر ڈیزرو کرتی ہو۔ شادی میں ایک سے بڑھ کر ایک اچھے خاندان کی عورتوں نے مجھ سے تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔ میں اب تک چپ تھی نہ صرف اس وجہ سے کہ پڑھائی میں تمہارا دھیان ڈسٹرب نہ ہو لیکن اب نہیں..... میں ان سب کو ان کی ملی بھگت میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ تم سن رہی ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' وہ خالی خالی نگاہوں سے ماں کو دیکھے گئی۔

☆☆☆

فطری شرم و جھجک اور وردہ کے سلیقے سے میک اپ، نئی نویلی دلہن عظمیٰ پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ وہ خاصی خوش اخلاق اور ہنس مکھ تھی۔ جلد ہی سب میں گھل مل گئی۔

گھر میں مبارکباد دینے کے لیے رشتہ دار خواتین کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ لیکن بتول بیگم کی آمد کا مقصد صرف زاہدہ ہی جانتی تھیں۔ انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں نین تارہ کے لیے عندیہ دے دیا۔ زاہدہ خود دروازے تک چھوڑنے گئی۔

شام ڈھل رہی تھی جب نین تارہ آہستگی سے چھت کی سیڑھیاں اتری۔

''اوئے بے وقوف لڑکی! اس وقت تم چھت پر کیا کر رہی تھیں؟ اگر کوئی جن بھوت عاشق ہو جاتا تو؟ تمہارا شہزادہ لاکھ بہادر سہی لیکن کوہ قاف کے جنوں بھوتوں سے نمٹنے کا اسے کوئی تجربہ نہیں۔'' زارون مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''اچھا ادھر تو آؤ۔ تمہیں ایک زبردست چیز دکھاتا ہوں۔'' زارون نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ اس نے سرعت سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

نین تارہ نے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے زور سے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

''تمہاری جرأت بھی کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟'' زارون سرخ چہرہ لیے کھڑا تھا۔ میں بے وقوف ضرور زارون رحمٰن، لیکن ناسمجھ نہیں۔''

پھنکار کر کہتی وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ زارون سکتے میں آ گیا۔

☆☆☆

''میں نے نین تارہ کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' زاہدہ نے ان کے سروں پر بم پھوڑ دیا تھا۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔

''کیا..... تم ایسا کیسے کر سکتی ہو زاہدہ؟'' تایا ابا بمشکل بولنے کے قابل ہوئے تھے۔

''میں اس کی ماں ہوں بھائی صاحب! اور اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن تارہ کے رشتے کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ تم اکیلے نہیں کر سکتیں۔'' ان کی حیرت پر اب غصہ غالب آنے لگا تھا۔

''ہماری کوئی بات بری لگی ہے تو ہمیں معاف کر دو زاہدہ! لیکن خدا کے لیے یہ ظلم مت کرو۔ ہماری

بچی ہم سے چھین کر تم یوں کسی اور کے حوالے کیسے کرسکتی ہو؟'' تائی اماں رونے لگی تھیں۔ دادی بے بسی سے ایک ایک کا منہ یوں تک رہی تھیں جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا سب کچھ لوٹا جارہا ہو اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی ہوں۔

''بھابھی جان! آپ اپنی وردہ کا بھی تو کہیں نہ کہیں رشتہ طے کریں گی تو پھر میری نین تارہ کی باری پر یہ واویلا کیوں؟''

''وردہ کی بات اور ہے چچی۔ جبکہ نین تارہ کے لیے سب نے زارون کا ہی سوچ رکھا تھا۔'' ان کے جان بوجھ کر بے خبر بننے پر ہارون کو غصہ آنے لگا تھا۔

''میں سب کی سوچ کی ذمہ دار نہیں ہوں۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا سوچا ہوا بھی تھا تو لازمی نہیں ہے کہ میں بھی ایسا ہی سوچتی۔''

''میرے عبداللہ کی بھی یہی خواہش تھی۔'' دادی کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

''معاف کیجیے گا ماں جی! مرنے والوں سے زیادہ زندہ لوگوں کی خواہشیں اہم ہوتی ہیں کیونکہ زندگی انہوں نے گزارنی ہوتی ہے۔ مرنے والوں کا کیا ہے ان کے پیچھے کوئی ہنسے یا روئے۔''

دادی کا کلیجہ چھلنی ہونے لگا۔ تائی اماں نے بے بسی سے اس ضدی عورت کو دیکھا۔

''اور نین تارہ! اس سے پوچھا ہے تم نے۔'' تایا ابا نے ضبط سے پوچھا تھا۔

''اس کی بھی یہی خواہش ہے۔'' تابوت میں آخری کیل ٹھونکتی وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔

☆☆☆

زارون پاگل سا ہوگیا۔

''ایسا کیسے کرسکتی ہیں وہ؟ نین تارہ کو کسی اور کو سونپنے کا انہوں نے سوچ بھی کیسے لیا؟''

تائی اماں نم آنکھوں سے بیٹے کو ہیجانی انداز میں چیختا چلاتا دیکھتی رہیں۔ وہ کرسی کو زور دار ٹھوکر سے اڑاتا باہر نکل گیا تھا۔ ابھی تو وہ اس شاک سے باہر نکلا تھا کہ نین تارہ نے اس روز اسے کیا جتانے کی کوشش کی تھی؟ اور اب زاہدہ چچی نے تو اس کے دل پر ہی پاؤں رکھ دیا تھا۔

نین تارہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہوگیا تھا۔

زاہدہ بھائی صاحب کو صلاح الدین اور اس کی فیملی کے بارے میں بتانے کے لیے لاؤنج میں آگئیں۔ اپنی طرف سے انہوں نے سب کچھ طے کرلیا تھا۔ وہ جلد از جلد شادی کی خواہاں تھیں۔

عبدالرحمٰن صاحب سنجیدہ چہرہ لیے انہیں بولتا سنتے رہے۔ دادی اور تائی اماں خاموش تماشائی بنی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ ہارون کے ساتھ عظمیٰ بھی صوفے پر آکر ٹک گئی۔

''نین تارہ میری اکلوتی بیٹی ہے بھائی صاحب! اور اس کی خوشیوں اور آسودہ زندگی کے لیے میں کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔ میں آج تک خاموش رہی تاکہ اس گھر کا ماحول خراب نہ ہو لیکن اب چونکہ نین تارہ نئی زندگی کی شروعات کرنے جارہی ہے تو میں نہیں چاہتی کسی قسم کی کوئی کمی بیشی ہو۔ گھر کو رہنے دیتے ہیں لیکن..... فیکٹری..... جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ فیکٹری عبداللہ کی ذاتی پراپرٹی تھی جو اس وقت کے بعد یقیناً اس کی اکلوتی اولاد کی ہی پراپرٹی کہلائی جائے گی۔ میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کررہی لیکن کل کو اگر نین تارہ کے شوہر نے اس سلسلے میں کوئی اقدام اٹھایا تو میں امید کرتی ہوں آپ کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بنیں گے۔''

تایا ابا نے بہت ضبط سے ان کا لفظ لفظ سنا تھا۔ ان کے خاموش ہونے پر بلا کی سنجیدگی سے بولے۔

''مجھے تمہاری کسی بات سے کوئی اختلاف نہیں زاہدہ! لیکن اس سب سے پہلے میں ایک بار نین تارہ سے بات کرنا چاہوں گا۔''

نین تارہ آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر وردہ کا دل چاہا اس سے لپٹ جائے لیکن وہ بنا کسی کی طرف دیکھے تایا ابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ جو نم آواز میں اس سے اس کی مرضی، اس کی خوشی پوچھ رہے تھے۔

''مجھے اماں کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تایا ابا! اور مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی اگر میری ماں میرے لیے کچھ بہتر سوچ رہی ہیں تو آپ سب لوگوں کو اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟ اگر میرے ابا زندہ ہوتے تو کیا تب بھی آپ لوگ میرے ساتھ یہی کرتے؟''

تایا ابا کے سارے سوال دم توڑ گئے تھے۔

☆☆☆

نین تارہ کے جانے کے بعد زاہدہ سب کے سفید پڑتے چہروں پر ایک نگاہ ڈالتی مطمئن سی وہاں سے اٹھ گئیں۔ بالآخر وہ سب کچھ ہونے جارہا تھا جو وہ چاہتی تھیں۔

وہ بہت چھوٹی تھیں جب ان کے ماں باپ گزر گئے۔ تایا اور ان کی بیوی نے ان کی ذمہ داری اٹھانے سے صاف انکار کردیا کہ ان کے معاشی حالات انہیں مزید ایک فرد کا بوجھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لے دے کہ بڑے ماموں ہی تھے جو ممانی کی ناراضی کے باوجود انہیں اپنے گھر لے آئے۔ ممانی اور ان کی نخریلی بیٹی مائرہ نے دنوں ان سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ لیکن بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ شروع ہوئی تھی۔ وہ انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں۔ گھر آئی مفت کی ملازمہ کا سا سلوک روا رکھتیں۔ مائرہ کی اترن پہننے کو ملتی۔ ماموں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انجان بنے ہوئے تھے کہ ان کے خیال میں اسے اپنے گھر لاکر وہ پہلے ہی بہت بڑی نیکی کرچکے ہیں۔

رات کو جب وہ تھکن سے چور بان کی چارپائی والے بستر پر سوتیں تو آنکھیں بند ہونے سے پہلے روز یہی خیال ان کے دماغ پر پنجے گاڑھ دیتا کہ کاش ان کے پاس کہیں سے اتنے پیسے آجائیں کہ وہ سب کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھیں۔

دن رات ایک ذلت، احساس کمتری اور بے بسی کا احساس کچوکے لگاتا۔ لیکن وہ ایک دن ان کی زندگی کی کایا پلٹ گیا۔

مائرہ کی دوست کی شادی تھی اور ماموں اسے کسی صورت اکیلے رات کے فنکشن میں جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ناچار اسے زاہدہ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا پڑا۔ واپسی پر بہت دیر ہوگئی تھی۔ اوپر سے خراب موسم میں وہ دونوں آدھی بھیگی سڑک کے کنارے کسی سواری کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

عبداللہ کی گاڑی کے ٹائر زور سے ان کے قریب چرچرائے تھے۔ سیاہ شیفون کے لباس میں بھیگی، ٹین ٹینٹی زاہدہ کو دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھے اور وہ نیکی جو اس رات انہوں نے ان دونوں کو بحفاظت گھر چھوڑنے کی تھی، وہ ان کی زندگی بھر کے لیے گلے پڑ گئی۔ وہ پرفسوں لمحہ ان کی ساری زندگی پر حاوی ہوگیا تھا۔ ماں جی کو منانے سے لے کر زاہدہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے تک وہ ایک خوب صورت حصار میں گھرے رہے اور زاہدہ..... انہیں تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ قسمت ان پر کیسے اتنی مہربان ہوگئی؟ ممانی نے لاکھ روڑے اٹکانے کی کوشش کی لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

اور ایک دن وہ عبداللہ کے سنگ عزت سے رخصت ہوکر اس شان دار سے گھر میں آگئیں۔

بھوکا پیٹ طلب سے زیادہ بھر جائے تو سارا کھایا پیا منہ کو آنے لگتا ہے۔ یہی حال زاہدہ کا ہوا تھا۔ بہت کم وقت میں انہوں نے سارا جوڑ توڑ کرلیا تھا۔ گھر میں بھائی صاحب (عبدالرحمن) کے مقابلے میں عبداللہ کی معاشی حالت زیادہ مستحکم تھی۔ گھر بے شک دونوں بھائیوں کا مشترکہ تھا لیکن اس کی ازسرنو تعمیر، تزئین و آرائش، ساز و سامان وغیرہ سب عبداللہ کے پیسوں سے ہوا تھا۔ عبداللہ کی ذاتی لیدر گارمنٹس کی فیکٹری تھی.....

عبداللہ ماں کا فرماں بردار تھا تو بڑے بھائی اور بھاوج کا حد درجہ سعادت مند۔ زاہدہ کو یہ رشتے چبھنے لگے تھے۔ ان کی تنگ دلی اور کج فہمی رشتوں کے درمیان دراڑ ڈالنے میں تو کامیاب نہ ہوسکی لیکن گھر کا ماحول مکدر ہوکر رہ گیا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا زاہدہ! تم اتنی تنگ دلی اور سطحی سوچ کی مالک نکلو گی، تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنے اتنے انمول رشتوں کو تمہاری سازشوں کی نذر ہونے دوں گا۔ یہ مکان، فیکٹری تو کیا میں اپنا سب کچھ ہزار بار ان پر وارنے کو تیار ہوں۔''

اہانت کے احساس میں زاہدہ زخمی ناگن بن گئی تھیں۔ سب کچھ ان کا ہوتے ہوئے بھی ان کا نہیں تھا۔

نین تارہ کی پیدائش بھی ان کا رویہ، ان کی روش نہ بدل سکی۔ عبداللہ سے ان کے اختلافات بڑھتے جارہے تھے۔ ایک دن ماں جی اور بھائی صاحب کے سامنے وہ بے بسی سے رو پڑے۔

''تم اس کی بات مان لو عبداللہ۔''

دونوں ہی اپنے لختِ جگر کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''وہ اس گھر کا، ہمارے رشتوں اور دلوں کا بٹوارہ چاہتی ہے ماں جی۔ اور میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ اس کا خمیازہ میں بھگت رہا ہوں لیکن میری تارہ..... مجھے ڈر ہے وہ نہ چھن جائے ہم سے۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں.....''

ان کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ اس رات انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

گھر میں صف ماتم سی بچھ گئی تھی۔ ماں جی اور عبدالرحمٰن کو زاہدہ کے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے انہوں نے اپنا عبداللہ کھویا تھا۔ وہ چاہتے تو اسے کٹہرے میں کھڑا کر کے فردِ جرم عائد کر دیتے لیکن انہیں عبداللہ سے کیا اپنا وعدہ نبھانا تھا۔ انہوں نے معصوم اور کم سن نین تارہ کو اپنی مہربان آغوش میں لے کر سارے سود و زیاں بھلا دیے تھے اور جس نین تارہ کے لیے انہوں نے اتنا کچھ سہا تھا، آج وہ ان کے سامنے کھڑی سوال کر رہی تھی۔

''اگر میرے ابا زندہ ہوتے تو کیا تب بھی آپ لوگ میرے ساتھ یہی کچھ کرتے؟''

تایا ابا کا سارا حوصلہ دم توڑ گیا تھا۔

☆☆☆

پھر زاہدہ نے جو چاہا، جیسے چاہا اسے کرنے دیا گیا۔ بیٹی کو لاکھوں کا جہیز دے کر وہ اس کے سسرال پر پہلے سے ہی دھاک بٹھا دینا چاہتی تھیں۔ زیور، کپڑے، کراکری، الیکٹرک کا سامان سب اعلا سے اعلا ترین۔

شادی کا گھر تھا لیکن عجیب سی سوگواریت نے گھر کے در و دیوار کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وردہ چپکے چپکے کئی بار رو چکی تھی۔ ہارون نے بڑے بھائی کی طرح اندر باہر کے سارے انتظام سنبھال رکھے تھے۔ دادی آنکھوں میں بار بار در آنے والی نمی کو چھپانے کے لیے خواہ مخواہ دوپٹے کے پلو سے چہرہ ڈھانپ کر لیٹ جاتیں۔ تائی اماں اور عظمیٰ نے زاہدہ کے ساتھ مل کر مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔ زارون، نین تارہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار تھا اور بالآخر وہ اسے بارات سے ایک دن پہلے کچن کی طرف جاتی دکھائی دی۔ سبز اور پیلے لباس میں، کلائیوں میں گجرے، ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں اور اس کے وجود سے اٹھتی مہندی اور ابٹن کی مہک۔

زارون بے خودی کے عالم میں اسے دیکھے گیا۔

''راستہ دو۔'' زارون ایک دم ہوش میں آیا تھا۔ وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ جاتی۔ اس کا دل چاہا اسے ہاتھ سے پکڑ کر روک لے۔ بمشکل اپنی خواہش پر قابو پاتا وہ گویا ہوا۔

''میں جانتا ہوں، مجھ سے میرے سارے اختیار، سارے حق چھن گئے ہیں، بس میرا بھروسا لوٹا دو۔ کہہ دو نین تارہ! جو کچھ اس دن تم نے مجھ سے کہا تمہارا وہ مطلب نہیں تھا۔ ورنہ میں عمر بھر اپنی نظروں میں سرخرو نہیں ہو سکوں گا۔''

نین تارہ نے سر سے پھسلتا گوٹے کناری والا دوپٹا پھر سے اوڑھ لیا۔ چوڑیوں کی جلترنگ سی بج اٹھی۔ اور وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

زارون کی آنکھوں میں زخمی پن اتر آیا تھا۔

☆☆☆

تازہ گلاب کے پھولوں سے سجا کمرہ مہک رہا تھا۔ اسے بیڈ کے وسط میں بٹھا دینے کے بعد صلاح الدین کے گھر کی خواتین نہ جانے کون کون سی رسمیں کرنے لگیں۔ اونچے قہقہے، ذومعنی سرگوشیاں۔

''یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہوگئے ہیں؟ میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' صلاح الدین کی بڑی بھابھی نے چونک کر چند گھنٹوں کی بیاہی دلہن کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ یہ سرگوشی ان کے علاوہ کسی اور کی سماعتوں تک نہیں پہنچی تھی۔ دلہن کے لہجے میں بے زاری، ناگواری کیا کچھ نہیں تھا۔

بڑی بھابھی نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے سب کو باہر چلنے کا کہا کہ.....

''دلہن تھک گئی ہے، اسے تھوڑا آرام کرنے دو۔'' آہستہ آہستہ کمرہ خالی ہوگیا۔ نین تارہ نے سر اوپر اٹھا کر سکون کا سانس لیا۔

''اف توبہ۔ کتنی عجیب عورتیں ہیں۔'' اس نے قدرے پرسکون ہوکر تکیے سے ٹیک لگالی۔

''یہ کیا منتر پڑھ کر پھونک رہی ہو؟'' دروازہ اتنی آہستگی سے کھل کر بند ہوا تھا کہ اسے بالکل پتا نہ چلا، ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔ سفید کاٹن کے شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہنے اونچا لمبا خوبرو صلاح الدین مسکراتا ہوا اس کے سامنے آبیٹھا۔

''کیا بڑبڑا رہی تھیں؟'' نین تارہ نے چہرہ جھکالیا۔

''سنا تھا صلاح الدین کی ہونے والی دلہن بہت خوب صورت ہے لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ کہنے والے نے بہت کنجوسی سے کام لیا۔ جتنا سنا تھا تم اس سے کہیں زیادہ حسین ہو۔''

انگلی سے ٹھوڑی اوپر کرتا وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ نین تارہ کے سرخ لبوں پر مخمور سی مسکراہٹ نے چھب دکھلائی تھی۔ صلاح الدین بے خود سا اسے دیکھے گیا اور نین تارہ سوچ رہی تھی.....

''اماں نے کہا تھا شادی کی پہلی ہی رات اگر شوہر تمہارے حسن و ادا کے سامنے گھٹنے ٹیک دے تو پھر زندگی بھر سر نہیں اٹھا پائے گا۔ ہمیشہ تم ہی حاوی رہو گی اس پر۔''

☆☆☆

صبح وہ ابھی ڈھنگ سے بیزار بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسی جم غفیر نے پھر سے دھاوا بول دیا۔ وہ سخت بدمزا ہوئی۔

''اس طرح کون کسی کے کمرے میں آدھمکتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد تانیہ (صلاح الدین کی چھوٹی بہن) سب کو باہر لے گئی کہ دلہن نے ناشتا کرنا اور تیار ہونا ہے۔

نین تارہ صلاح الدین کے سامنے اپنی ناگواری ظاہر کیے بنا نہ رہ سکی۔

''یار! اپنے ہی ہیں سب اور ہم ہمیشہ سے اسی طرح مل جل کر رہتے آرہے ہیں۔ تم ابھی نئی نئی ہو نا اس لیے تمہیں عجیب لگ رہا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں تمہیں بھی اس سب کی عادت ہوجائے گی۔'' ناشتے کی ٹرے سامنے کرتا وہ رسان سے بولا۔

''پھر بھی مجھے نہیں پسند، کوئی خواہ مخواہ ہماری پرائیویسی میں مخل ہو۔''

صلاح الدین ہنسا۔ ''جوائنٹ فیملی سسٹم میں بھلا کہاں کی پرائیویسی۔'' پھر قدرے سنجیدہ ہوکر کہنے لگا۔

''میری دونوں بھابھیاں، رقیہ آپا، ثانیہ، اماں، ابا سب میرے لیے بہت قابل احترام ہیں اور یہ سب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہیں بھی ان کی طرف سے مان، محبت، عزت میں کوئی کمی نہیں ملے گی۔ بس اپنا ظرف اور دل بڑا رکھنا۔''

نین تارہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ در پردہ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا؟ سر جھٹکتے ہوئے اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگالیا۔

☆☆☆

''بھابھی! ہمارے ہاں شادی کے دوسرے روز بری کا سوٹ ہی پہنتے ہیں اور اماں نے یہ سوٹ آپ کے لیے خاص طور پر بہت شوق سے لیا تھا۔''

ناشتے کے بعد ثانیہ اسے تیار کرنے کے لیے کمرے میں آ گئی تھی اور اب الماری کھولے آ تی گلابی کام دار فراک لہراتی اس سے کہہ رہی تھی۔ جبکہ نین تارہ نے اپنی طرف کی نیلے کلر کی میکسی پہلے سے ہی نکال کر بیڈ پر رکھ دی تھی۔

''یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ دوسرے روز بری کا سوٹ ہی پہنا جائے؟ میں نے یہ سلیکٹ کیا ہوا ہے آج پہننے کے لیے۔''

اس کا انداز قطعی تھا کہ ثانیہ چپ کی چپ رہ گئی اور پھر خاموشی سے اس کا میک اپ کرنے لگی۔ آگے جو کچھ ہونے والا تھا، اس کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

اپنی خاندانی روایات خاندان کی بزرگ ہستیوں کو بہت عزیز ہوتی ہیں۔ ان روایات سے ان کی معصوم خواہشیں اور خوشیاں جڑی ہوتی ہیں۔ لیکن بتول بیگم کی چھوٹی بہو کو دوسروں کی خوشیوں اور خواہشوں سے کبھی سروکار نہیں رہا تھا۔ اس کا اندازہ بہت جلد سب کو ہو گیا۔

وہ آج میکے آئی تھی۔

تائی اماں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ ''سدا خوش رہو۔'' دادی نے بھی گلے سے لگا کر پیار کیا تھا۔ وردہ کو اس کے آنے کا پتا چلا تو بھاگتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ زارون اس وقت فیکٹری کے لیے نکل رہا تھا۔ ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ عظمیٰ بھابھی سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھیں۔

''عجیب پینڈو قسم کے لوگ ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ہر وقت جمع ہو جاتی ہیں۔ کھانا پینا، گپیں، اف.....''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ سب مل جل کر رہنے کے عادی ہیں۔'' دادی نے رسانیت سے کہا۔

''خاک اچھی بات ہے۔ ہمارے ہاں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔''

''ہمارے ہاں بھی ایسا ہی ہوتا تھا بس.....'' دادی سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔ زاہدہ نے نین تارہ کو اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر ان کے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

''صلاح الدین کیسا ہے تمہارے ساتھ؟''

''دیوانہ ہے میرا۔'' وہ ہنسی۔

''بس اسے اپنا دیوانہ ہی بنائے رکھو۔ باقی کسی کو سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میں بھلا کس چیز کی کمی ہے خوب صورت ہو، لاکھوں کا جہیز الگ۔ میں جلد ہی بھائی صاحب سے فیکٹری تمہارے نام کرنے کی بات کروں گی۔ بس کسی سے دبنے یا کسی کی جی حضوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔''

☆☆☆

صلاح الدین کی ہمراہی میں زندگی بہت خوب صورت ہوتی اگر وہ اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک اور دل میں گنجائش پیدا کر لیتی۔ بتول بیگم کا اتنا کہنا غضب ہو گیا کہ صبح اٹھ کر اپنے میاں کو ناشتہ کروا کر کام پر رخصت کیا کرو۔ یوں دن چڑھے کمرہ بند کر کے سوئے رہنا اچھی بہوؤں کے طور طریقے نہیں ہوتے۔''

وہ حسب معمول گیارہ بجے اٹھی تھی۔ ارادہ کچن میں جا کر بھرپور ناشتہ کرنے کا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی بتول بیگم نے روک لیا۔ اس وقت وہ بڑی بھابھی کے ساتھ ٹی وی پر چلتی خبروں پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ مٹر بھی چھیل رہی تھیں۔ ان کا انداز سادہ اور سمجھانے والا تھا۔ لیکن نین تارہ کو سراسر اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ کمرے میں جا کر ماں کو کال ملائی اور زاہدہ اتنی عقلمند کہ بیٹی کے روہانسے انداز پر بھاگی چلی آئیں۔ اور آتے ہی عدالت سی لگا دی۔

''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی بتول آپا! بھلا میری بیٹی کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کہ آپ کو اس کا سونا چبھنے لگا۔ جہاں گھر میں اور لوگوں

کے لیے ناشتہ بن سکتا ہے تو صلاح الدین کے لیے کیوں نہیں؟ آخر شادی سے پہلے بھی تو اس کے لیے ناشتہ، کھانا وغیرہ بنتا ہوگا۔ اب کیوں ایک دم سب پر بوجھ پڑنے لگا۔ ویسے بھی میری بیٹی کو صبح اتنی جلدی اٹھنے کی عادت نہیں ہے۔''

بتول بیگم نے تحمل سے ان کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا تھا۔

''بات بوجھ کی نہیں ہے زاہدہ! اصولوں کی ہے۔ جہاں میری باقی دونوں بہوویں گھر کی ساری ذمہ داری اٹھا رہی ہیں وہاں تیری بیٹی اٹھ کر پانی تک نہ پیئے۔ میں یہ ناانصافی اپنے گھر نہیں ہونے دینا چاہتی۔ ویسے بھی گھر کے سربراہ ہی اگر رشتوں کے درمیان عدل اور توازن نہیں رکھیں گے تو گھر کا تو سارا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے گا اور تم عجیب ماں ہو۔ بجائے بیٹی کی غلطی پر اس کو سرزنش کرنے کے الٹا بات کو بڑھانے چلی آئیں۔''

بتول بیگم صاف گو خاتون تھیں۔ بغیر لگی لپٹی سنا دیا۔ لیکن سامنے بھی زاہدہ تھیں جنہیں اپنا غلط بھی ہمیشہ صحیح لگتا۔ ابھی بھی دو چار مزید باتیں سنا کر بسورتی ہوئی تارہ کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔

''بہت ناسمجھ ہوتی ہیں وہ مائیں جو بیٹیوں کے سسرال کے معاملات میں بے جا مداخلت کر کے ان کے لیے مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔'' بتول بیگم تاسف سے گویا ہوئیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوتا صلاح الدین ٹھٹکا۔ ''گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ اور نین تارہ کہاں ہے؟'' سب نے نظریں چرالیں۔ گھر میں ایسا تماشا پہلے کب لگا تھا بھلا؟

''اماں! پلیز مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟''

ثانیہ نے سوچا اگر اس وقت بھائی کو اصل بات نہ بتائی گئی تو پھر بعد میں نین تارہ جو بھی سچ جھوٹ انہیں بتائے گی وہ اسی کو سچ مان لیں گے۔'' یہی سوچ کر وہ آہستہ سے انہیں سب بتاتی چلی گئی۔ صلاح الدین لب بھینچے سنے گیا۔

☆☆☆

زارون نے بے بسی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

''آپ مجھ سے وہ کیوں کروانا چاہتی ہیں جس کے لیے میرا دل رضامند نہیں۔''

''تو کیا تم اس انتظار میں ہو کہ اس کا گھر ٹوٹے، اس کی شادی ختم ہو اور زاہدہ اسے تمہارے نام کر دے؟'' زارون تڑپ اٹھا۔

''آپ مجھے اتنا گھٹیا سمجھتی ہیں؟''

''تو پھر مان کیوں نہیں جاتے؟ میں تمہارے اور وردہ کے فرض سے ایک ساتھ سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے ہار مان لی تھی۔ تائی اماں نے اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔

''تم بہت خوش رہو گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' ضبط سے بولتے ہوئے بھی ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ جلد از جلد بیٹے کا اجڑا دل بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

نین تارہ کا خیال تھا اسے گھر میں نہ پا کر صلاح الدین اس کے پیچھے دوڑا چلا آئے گا۔ لیکن آنا تو ایک طرف اس نے تو ایک فون کال تک اسے نہیں کی تھی۔

گھر میں وردہ اور زارون کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک دن تائی اماں نے چپکے سے اپنے پاس بٹھالیا۔

''گھر والوں سے کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟''

''جی!'' وہ اپنے ناخن سے نیل پالش کھرچنے لگی۔ پھر ساری بات بتاتی چلی گئی۔ تائی اماں نے گہری سانس لی۔ تو ایک اور زاہدہ گھر والوں کے لیے آزمائش بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''دیکھو بیٹا! شادی والا گھر ہے۔ میں چاہتی ہوں تم اپنے گھر والوں کے ساتھ شرکت کرو۔ کل کو ساری برادری جمع ہو گی۔ جتنے منہ اتنی باتیں..... تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟ اچھی اور سمجھ دار بیٹیاں یوں

معمولی باتوں پر گھر والوں سے روٹھ کر نہیں آجاتیں۔'' وہ رسانیت سے اسے سمجھانے لگیں۔

''تو بھابھی! آپ کیا چاہتی ہیں میری بیٹی ان لوگوں کے سامنے جھک جائے؟'' زاہدہ وہاں تن کر آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''مصالحت کی راہ اختیار کر لینے سے کوئی چھوٹا نہیں پڑ جاتا۔'' تائی اماں کہہ کر چپ ہو گئیں۔

☆☆☆

زاہدہ کو اس میں سراسر اپنی اور نین تارہ کی توہین لگ رہی تھی۔

نین تارہ نے سوچا ''واقعی شادی کے موقع پر ساری برادری اکٹھی ہوگی۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ وہ اپنے سسرال والوں سے لڑ کر میکے آئی بیٹھی ہے تو کس قدر سبکی ہوگی۔ یہی سوچ کر اس نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ سب لاؤنج میں جمع تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ وہی خوش گپیاں، وہی قہقہے۔

کسی نے کچھ بھی جتائے بغیر خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ صلاح الدین کی طرف سے دانستہ رخ موڑ کر وہ بتول بیگم کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ وہ اس سے گھر والوں کی خیر خیریت پوچھنے لگیں۔

''بھابھی! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' ثانیہ اپنا خالی کپ ٹرے میں رکھتی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

''کیسی ہو؟'' کمرے میں آئی تو صلاح الدین مطمئن انداز میں پاؤں ہلاتا بیڈ کے وسط میں تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔

''میں جھوٹے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنے تراشیدہ بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

''میں نے کب جھوٹ بولا ہے تم سے؟'' صلاح الدین سیدھا ہو بیٹھا۔

''میں اتنے دن اماں کے ہاں رہی آپ نے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کیا، اس کا اور کیا مطلب ہے کہ وہ ساری محبت، وہ بے قراری وہ وعدے سب جھوٹ تھے؟''

صلاح الدین نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنے عین سامنے بٹھا دیا۔ ''کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ اگر تم جانے سے پہلے کم از کم مجھے ایک فون کر لیتیں تو اتنے دن میں یہ سوچ بچار نہ کر رہا ہوتا کہ تمہارے اتنے ایمرجنسی میں جانے کی آخر کیا وجہ تھی؟''

''میں نہیں مان سکتی آپ کے گھر والوں نے آپ کو کچھ نہ بتایا ہو۔''

''یار ابھی یہ سوال جواب رہنے دو۔ بلکہ مجھے اپنا حساب بے باق کرنا ہے۔ اتنے دن کی غیر حاضری کا کچھ تو تاوان بھرنا ہوگا۔'' اس کی طرف جھکتے ہوئے وہ شرارتی لہجے میں بول رہا تھا۔ نین تارہ کے بھاگنے کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔

☆☆☆

زارون کے ولیمے والے دن وردہ کی رخصتی تھی۔

ہمیشہ سادہ حلیے میں رہنے والی وردہ پرٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ زارون کی دلہن رخسار کو بھی اس کے ساتھ اسٹیج پر بٹھا دیا گیا تھا۔ تائی اماں آتے جاتے دونوں کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ سنجیدہ سا زارون بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کی ساری شوخیاں اسی دن رخصت ہو گئی تھیں جس دن تارہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ شوخ، ہنس مکھ، لاپروا زارون کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

زاہدہ کے ماتھے کے بل بھی آج کچھ کم تھے کہ شادی کی ساری رسموں کے دوران نین تارہ کو بڑی شادی شدہ بیٹیوں والا پروٹوکول دیا جا رہا تھا اور پھر وردہ رخصت ہو گئی۔

اس کی کمی شاید تائی اماں اور دادی کو پاگل کر دیتی اگر جو رخسار اس گھر میں نہ آ گئی ہوتی۔ زندہ دل اور ہر دم ہنسنے کھلکھلانے والی رخسار نے گھر بھر میں خوش گوار ہلچل مچا دی تھی۔

☆☆☆

''صلاح الدین! یہ اسٹور آپ تینوں بھائیوں میں سے کس کے نام پر ہے؟''

رجسٹر پر جھکے حساب کتاب میں الجھے صلاح الدین نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے؟ آپ تینوں بھائی مل کر اس کو چلا رہے ہیں لیکن یہ کسی ایک کی تو پراپرٹی ہوگی نا؟''

''یہ ہمارے والد صاحب کا اسٹور تھا۔ جو ہم تینوں بھائیوں کی مشترکہ پراپرٹی ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ مرتضیٰ بھائی کو ادھر ادھر کے سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں ملتی۔ وہاب بھائی کو بھی اکثر دن چڑھے اسٹور جاتے دیکھا ہے، محنت ساری آپ کرتے ہیں تو اصولاً یہ آپ کا ہی ہونا چاہیے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو نین تارہ! تمہارے دماغ میں ایسی باتیں آ کہاں سے جاتی ہیں؟'' سدا کا نرم مزاج صلاح الدین اس کی بات پر بھڑک اٹھا تھا۔

نین تارہ خائف ہونے کے بجائے مزید کہنے لگی۔

''اس میں بکواس والی کون سی بات ہے۔ کل کو اگر آپ ان سے الگ ہو جائیں تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ابھی سے اپنی پراپرٹی وغیرہ کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کر لیں۔''

''میں کیوں ہونے لگا ان سب سے الگ؟ اور خبردار جو آئندہ ایسی کوئی بات منہ سے نکالی تو۔ اگر ایسا کوئی خناس تمہارے دماغ میں بھرا ہوا بھی ہے تو اسے فوراً نکال دو۔''

غصے سے رجسٹر بند کرتا وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔ نین تارہ کو لگا لوہا گرم ہے یہی موقع ہے چوٹ لگانے کا۔ ورنہ وہ شاید پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

''لیکن آپ کے اس جنجال میں میرا گزارا مشکل ہے۔ مجال ہے جو دو منٹ بندہ آرام سے گزارا سکے۔ ایک جا رہا ہے تو دوسرا آ رہا ہے۔'' صلاح الدین طیش میں اس کی طرف گھوما تھا۔ درحقیقت تارہ کے جوہر اب اس پر کھلنا شروع ہوئے تھے۔ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتا بولا۔

''مجھے اپنے گھر کا ماحول اور سکون بہت عزیز ہے نین تارہ! خبردار تم نے اس میں رخنہ ڈالنے کی ذرا سی بھی کوشش کی۔''

☆☆☆

''آنٹی! کیا زارون اس شادی پر خوش نہیں ہے؟ آپ لوگوں نے زبردستی اس کی شادی مجھ سے کروائی ہے؟'' چائے کا کپ تپائی پر رکھتی رخسار تائی اماں کے سامنے صوفے پر ٹک گئی۔ تائی اماں نے چونک کر اس کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

''کیا زارون نے تمہیں کچھ کہا ہے؟''

''زارون نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں جانتی ہوں وہ مجھ سے، اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔'' وہ ہنس مکھ، شوخ رخسار ایک بیوی بھی تو تھی اور بیویوں کی چھٹی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کے اندر جو وہم سر اٹھا رہا تھا اس نے وہ تائی اماں کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''کیا وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''میری ایک بات مانو گی بیٹا!'' تائی اماں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ رخسار نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

نین تارہ نے زندگی میں کبھی ''نا'' نہیں سنی تھی۔ ہمیشہ جو چاہا وہی پایا تھا اور اب اس کا مجازی خدا بھی اس کی خواہشوں کو جھٹلا رہا تھا گویا اس کے نزدیک نین تارہ کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

شومئی قسمت اسی دن گھر میں اس کی ''کھیر پکائی'' کی رسم کے بارے میں پروگرام بننے لگا۔ اس نے سنا تو بدک گئی۔ ''مجھے نہیں پڑنا ان خرافات۔

میں، آپ لوگوں کو ایک بات سمجھ کیوں نہیں آ رہی؟'' وہ چلا ہی تو اٹھی۔

بتول بیگم حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔

''یہ تو رسم ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو ایسی چیزوں کو بہت انجوائے کرتی ہیں۔'' رقیہ آپا نے نرمی سے کہا۔

''میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں اور آپ کو اپنے گھر سکون نہیں ملتا کیا! جب دیکھو یہاں منہ اٹھا کر چلی آتی ہیں۔'' وہ خاصی بدتمیزی سے گویا ہوئی۔

رقیہ آپا کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑنے لگا۔ وہ اس گھر کی بڑی بیٹی تھیں۔ آج تک ان سے اس انداز اور لہجے میں کسی نے بات نہیں کی تھی۔ لیکن سامنے نین تارہ تھی۔ جسے رشتوں کا بھرم اور مان رکھنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

''اگر تم نے یہی کچھ کرنا تھا تو پھر ہامی کیوں بھری تھی؟ ماں کو شرمندہ کرنے کے لیے؟'' تمہیں کیا لگا تھا وہ اتنی بے وقوف اور ناسمجھ ہے کہ تمہاری اس دم گھوٹتی سنجیدگی کی وجہ نہیں کھوج لے گی؟

تائی اماں کا لہجہ دکھ سے بھاری ہونے لگا۔

زارون سر جھکائے لب کاٹ رہا تھا۔

''میں اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر اسے اس گھر میں لے آئی تھی۔ تم نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ تمہارا اس کے ساتھ رویہ تمہاری ماں کو جوابدہ ٹھہرائے گا۔ دوسروں کی بیٹیاں بھیڑ بکریاں نہیں ہوتیں کہ ہم انہیں اپنے گھر لا کر جو مرضی سلوک کریں۔''

''میں نے اپنی طرف سے تو بہت کوشش کی اماں لیکن.....''

''اگر تم نے کوشش کی ہوتی تو آج شک کے ناگ یوں اس کے دل میں پھن پھیلا کر نہ کھڑے ہو جاتے۔ ابھی بھی وقت ہے زارون اگر تم اس رشتے کو پورے خلوص اور ایمانداری سے نہیں نبھا سکتے تو اسے آزاد کر دو۔ میں نہیں جانتی تھی میرا بیٹا اتنا قدر ناشناس ہے جو بہتر کے چھن جانے پر بہترین مل جانے کی قدر نہیں کرے گا۔ وہ نین تارہ نہ سہی لیکن کیا اس کی کوئی خوبی، کوئی اچھائی تمہیں نظر نہیں آتی؟''

''آئی ایم سوری اماں!'' وہ کرب سے کراہا تھا۔

''اسے آزاد کر دو زارون!''

''پلیز اماں! بس کریں اس سے تو اچھا تھا آپ ایک جوتا کھینچ کر میرے منہ پر دے مارتیں۔'' چھوٹے بچے کی طرح وہ ماں کی گود میں منہ چھپا گیا تھا۔

''وردہ! رات کو کاشف تمہیں لینے آئے گا۔ کھانے میں کیا بنا لیں؟'' دادی کے تخت پر تائی اماں کے سر پہ تیل کی مالش کرتی عظمیٰ بھابھی وردہ سے پوچھ رہی تھیں۔

''جو آپ کا دل چاہے بنا لیں بھابھی! کاشف کو ویسے بھی آپ کے ہاتھ کا ذائقہ بہت پسند ہے۔'' وردہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''لو، اپنی نین تارہ بھی آ گئی۔'' دادی کی اس پر نظر پڑی تو خوشی سے بولتی اٹھ بیٹھیں۔

وہ وہیں ان کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئی۔

''شام کا کھانا کھا کر جاؤ گی نا۔ بلکہ صلاح الدین سے بھی کہنا، اچھا ہے رونق رہے گی۔''

''نہیں تائی اماں! میں بس تھوڑی دیر کے لیے آئی ہوں، شام تک نہیں رکوں گی۔''

اس کے علاوہ وہ اور کیا کہتی کہ صبح ہی اس کی صلاح الدین کے ساتھ پھر سے اچھی خاصی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ اب اسے کیسے یہاں کھانے کے لیے بلاتی۔ وہ اٹھ کر زاہدہ کے کمرے میں آ گئی۔

''میں کیا کروں اماں! عجیب شخص ہے۔ میری کسی بات کو سیریس لیتا ہی نہیں ہے۔''

''تم نے اس سے الگ ہونے کی بات کی؟ اور وہ سپر اسٹور اپنے نام کروانے کا معاملہ؟''

''وہ میری کوئی بات سنے تب نا۔ اس کی ہر بات میری ماں، میری بھابھیاں، میری بہنوں سے

شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہوتی ہے لیکن میرا نام بھی نین تارہ ہے، اس کو ان جادوگرنیوں کے چنگل سے چھڑا کر اپنا کر کے ہی رہوں گی۔ صرف اپنا۔''

''دو دن سیدھے منہ بات مت کرو، دیکھنا خود ہی تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔''

''اسے سیدھا کرنے کے میرے پاس اور بھی کئی طریقے ہیں۔'' نین تارہ ہنسی۔

دونوں ماں بیٹیوں کا حرف بہ حرف سنتا زارون ادھ کھلے دروازے کے باہر جم سا گیا تھا۔

بظاہر خوب صورت چہرے لیکن مکروہ سوچ رکھنے والی اس نین تارہ کی خاطر میں اس سے بے رخی برتتا رہا جس نے پورے خلوص اور ایمان داری سے میرے رشتوں کو محبت سے جوڑ رکھا ہے۔ جو توڑنے کے ہنر سے نا آشنا ہے، خواہ دل ہو، رشتے یا پھر گھر۔ اماں سچ کہتی ہیں ہیٹر پا کر بھی کوئلے کے ہاتھ سے نکلنے پر کف افسوس ملتا رہا۔

کوئی پردہ سا تھا جو اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا تھا۔

☆☆☆

''صلاح الدین! مجھے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس جانا ہے۔ الرجی بڑھتی جا رہی ہے۔''

صلاح الدین الماری سے ضروری رجسٹر اٹھاتا تیزی سے باہر نکل رہا تھا جب نین تارہ نے اسے روکا۔

''ابھی مجھے اسٹور پر جلدی پہنچنا ہے۔ شام کو تیار رہنا، چلیں گے۔'' صلاح الدین جواب دیتا باہر نکل گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد نین تارہ اپنے بیڈ پر نیم دراز یوں ہی وقت گزاری کے لیے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ کب آنکھ لگی کچھ پتا نہیں چلا۔ جب وہ اٹھی تب شام ڈھلنے کو تھی۔

باہر نکلی تو پتا چلا صلاح الدین ابھی ابھی سیرت بھابھی کو لے کر ہاسپٹل گیا ہے۔ ان کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ نین تارہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ صلاح الدین کو کال ملائی' دوسری طرف اس نے کال کاٹ دی۔

''کیا فائدہ ایسی خوب صورتی کا۔ ایک شوہر تک تو قابو ہوا نہیں تم سے۔''

زاہدہ کا دیا طعنہ آج اسے چابک کی طرح لگا تھا۔ ان کے واپس گھر آتے ہی وہ بری طرح پھٹ پڑی۔

''میں تمہارے لیے جلدی اسٹور سے واپس آ گیا تھا، تم سو رہی تھیں۔ اسی وقت بھابھی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی تو انہیں لے کر ہاسپٹل چلا گیا۔''

صلاح الدین رسانیت سے بولا۔ نین تارہ طنزیہ ہنسی۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو بھی اور مردوں کی طرح اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسروں کی بیویوں کو ساتھ ساتھ لیے پھرنے کا شوق ہے۔''

صلاح الدین کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ سب اس وقت لاؤنج میں جمع تھے۔ نین تارہ کے تماشے نے جیسے سب کو گنگ سا کر دیا۔ صبر و تحمل کا مادہ اس میں ویسے بھی نہیں تھا۔ اس وقت یہ احساس کہ ''اس کا شوہر اس کی طرف ملتفت نہیں'' مزید آپے سے باہر کر گیا۔

''اور آپ کی بھابھیاں ویسے بھی اس کام میں ماہر ہیں۔ دوسرے مردوں کو اپنے پیچھے لگانا ان کو خوب آتا ہے۔''

صلاح الدین کا زناٹے دار تھپڑ اس کی بولتی بند کروا گیا تھا۔

''اتنی گھٹیا اور نیچ سوچ کی توقع تمہارے جیسی عورت سے ہی کی جا سکتی ہے۔'' نین تارہ گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ جو غصے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ زاہدہ نے گھر میں قیامت سی اٹھا دی۔

''اس کی جرأت کیسے ہوئی میری بیٹی پر ہاتھ اٹھانے کی؟'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا جا کر صلاح الدین کو گریبان سے پکڑ لیں۔ دادی نے بمشکل انہیں

ٹھنڈا آیا۔

''میری بیٹی کو لاوارث سمجھ رکھا ہے کیا؟ ایسی بھی لونی گری پڑی نہیں ہے۔ اب جب تک صلاح الدین یہاں آکر معافی نہیں مانگے نین تارہ اس گھر میں واپس نہیں جائے گی۔''

تائی اماں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ زاہدہ نے پہلے کب کس کی سنی تھی جو اب سنتی۔ نین تارہ کمرے میں بند ہوگئی۔

☆☆☆

عظمیٰ پھپھی نے بچن کی ساری ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔ لیکن جب سے ان کے امید سے ہونے کی خوش خبری پتا چلی تھی، رخسار نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ تائی اماں نے الگ انہیں ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ رخسار گاہے بہ گاہے کچھ چٹ پٹا سا بنا کر ان کے لیے کھانے کو لے آتی اور وہ محبتوں کی ایسی قدر دان خرابی طبیعت کے باوجود کبھی دادی کے پاؤں دبانے لگتیں تو کبھی تائی اماں کی الماری سیٹ کرنے کھڑی ہوجاتیں۔ وردہ آجاتی تو پھر رات کو دیر تک سب کی محفل جمتی۔

''جانتی ہو وردہ! تمہارے اس گھر سے رخصت ہونے سے پہلے تک میں یہی سمجھتا تھا کہ تم سے اچھی چائے اور کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ لیکن اب پتا چلا ہے کہ اپنی رخسار ایسی اچھی اور مزے دار چائے بنا کر پلاتی ہے کہ ساری تھکاوٹ کہیں دور بھاگ جاتی ہے۔''

کھانے کے بعد زارون کہہ رہا تھا۔ رخسار نے خوش گوار حیرت سے زارون کو دیکھا وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رخسار نے شرما کر سر جھکا لیا۔ سب کے سامنے شوہر کے منہ سے نکلنے والے تعریف کے دو بول ایک بیوی کو کتنی مسرت سے ہمکنار کردیتے ہیں، یہ اس وقت کوئی رخسار سے پوچھتا۔ تائی اماں کی آنکھیں اللہ کے حضور تشکر کے اظہار سے بھر آئی تھیں۔

''تو آخر میرا بیٹا زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔''

''اوہو.....'' وردہ نے مسکراتے ہوئے ساتھ بیٹھی رخسار کو کہنی ماری۔

نین تارہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ یہ لوگ اتنا خوش کیسے رہ لیتے ہیں؟ وہ اپنے اندر جھانکتی جہاں گہری چپ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسی ویرانی اور دل کو چیرتی وحشت کہ دل چاہتا کہیں دور بھاگ جائے۔

صلاح الدین اسے بھول گیا تھا۔ یوں جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھی ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اتنی ڈھیر ساری ویرانی اور بے کلی سی کیوں اتر آئی ہے، میرے اندر۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے وہ یوں ہی سوچے گئی۔

''یار! مانا کہ تمہاری مسکراہٹ بہت قیمتی ہے لیکن یقین جانو کبھی کبھی کھل کر مسکرا لینے سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوجائے گی۔''

صلاح الدین کی مدھم، گمبھیر سرگوشی اس کے کان کے قریب ابھر کر معدوم ہوگئی تھی۔

''کیوں کرتی ہو اس طرح کی حرکتیں؟ مجھے تم بہت عزیز ہو نین تارہ! میں تمہیں ہمیشہ اپنے آس پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تمہاری باتیں اکثر مجھے ڈرا دیتی ہیں۔ کبھی کچھ ایسا مت کرنا کہ میرے ساتھ ساتھ خود اپنے اوپر بھی ظلم کر بیٹھو۔ یہ جدائی ظلم ہی تو ہے۔'' ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنے قریب کرتا وہ بوجھل لہجے میں بولا تھا۔

یہ سرگوشیاں نین تارہ کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو کوئی لمس پہلو میں جاگ اٹھتا۔ اپنے بے حد قریب کسی کی مہکتی سانسوں کی تپش اسے سونے نہ دیتی۔ تھک ہار کر وہ کھلی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔

''کیا مجھے صلاح الدین سے محبت ہوگئی ہے؟''

چاند خوب صورت تھا لیکن اس کی طرح بہت اداس اور تنہا۔

☆☆☆

''آج برسوں بعد آپ کے اندر ویسی ہی بے

کونی کیوں اماں جی؟ کیا چیز آپ کو دکھی کر رہی ہے؟''

تایا ابا کی عادت تھی، روز رات کو سونے سے پہلے دیر تک دادی کے پاس بیٹھے رہتے۔ کبھی ان کے پاؤں دباتے، کبھی سر اور کبھی یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ دادی کی بوڑھی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں۔ وہ انہیں کمبل اوڑھا کر آہستہ سے دروازہ بند کرتے اٹھ جاتے۔

''وہ اپنے گھر میں خوش نہیں ہے۔ میرے عبداللہ کی روح تکلیف میں ہوگی۔ یاد کرو عبدالرحمن! اس رات آخری بار وہ لمبا چوڑا مرد یہاں بیٹھ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس نے ہم سے اپنی نین تارہ کی خوشیوں کا وعدہ لیا تھا۔ ہم اس سے کیا وعدہ پورا نہیں کر سکے۔''

ان کے ضعیف لہجے میں ملال سا گھل گیا۔

''وہ عورت ہمارے عبداللہ کو کھا گئی لیکن ہم اس کی اکلوتی نشانی کو بھی سنبھال کر اپنے پاس نہ رکھ سکے۔''

''بات صرف زاہدہ کی ہوتی تو میں اسے کسی نہ کسی طرح سمجھا لیتا لیکن نین تارہ ہی ہم پر بھروسا نہیں کر پائی۔ میں کس منہ سے اسے کہتا کہ اس کے باپ کی یہ آخری خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ اس گھر میں رہے ہمارے زارون کی دلہن بن کر۔ وہ کبھی ہمارا اعتبار نہ کرتی۔ ماں کے کہے پر ہمیں ہی لالچی اور خودغرض سمجھتی ہے۔ عبداللہ اس عورت کے ہاتھوں ٹوٹا بکھرتا ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر اسی دن یہاں سے باہر نکال دیتا لیکن یہ عبداللہ کا وعدہ ہی تھا کہ اس کے جانے کے بعد صرف نین تارہ کی خاطر اس عورت کی ہر زیادتی خاموشی سے برداشت کر گئے۔''

تایا ابا بولتے رہے۔ مدہم آواز، نم لہجے میں۔ وہ ساری ان کہیاں.....

دروازے کے باہر ان کا حرف حرف سنتی نین تارہ پورے قد سے نیچے آ گری تھی۔ دھڑام کی آواز پر تایا ابا فوراً باہر کو لپکے۔

☆☆☆

اس رات نین تارہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی بلکہ درحقیقت ہوش میں آ گئی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے چلے گئے۔ زوردار آندھی سی چلی تھی اور مدتوں سے بے اعتباری، بے حسی اور خودغرضی کے زنگ سے آلودہ بند دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس کا دل چاہا، اپنے ہاتھوں ہونے والے نقصان پر دھاڑیں مار مار کر روئے۔

''آہ! اماں یہ آپ نے کیا کر دیا؟'' اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر نکلے اور تکیے سے بہتے تکیے میں جذب ہو گئے۔ زاہدہ تڑپ کر اٹھی تھیں۔

''نین تارہ! آنکھیں کھولو بیٹا۔'' سب اس وقت اس کے کمرے میں جمع تھے۔ کمرے میں بلا کی خاموشی تھی۔ نین تارہ نے آنکھیں کھول کر خود پر جھکی زاہدہ کو جن نظروں سے دیکھا انہیں شدت سے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا میری جان؟'' اس کے دونوں ہاتھ تھام کر وہ تفکر سے پوچھ رہی تھیں۔

''میرے ٹھیک ہونے سے کیا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اماں؟'' اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے کانچ کی کرچیاں تھیں۔ بچپن میں وردہ کو تائی اماں کے ساتھ چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹاتا دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ کام کرنے لگ جاتی تو اماں اسے بری طرح سرزنش کرتی، اپنے ساتھ لے جاتیں۔

''تم ان کی نوکر نہیں ہو۔''

''اپنے گھر کے کام کرنے سے کون نوکر بنتا ہے بھلا؟'' وہ بڑبڑائی تھی۔

وردہ اور زارون کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہ دادی کے کمرے میں گھس جاتی تو اماں فوراً وہاں سے بلا بھیجتیں۔ انہوں نے کبھی اسے ان سب کے قریب نہیں ہونے دیا۔ ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی جو فاصلے انہوں نے ان کے درمیان کھڑے کر دیے تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑھتے چلے گئے

یہاں تک کہ وہ بالکل اماں کے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔

''آپ غلط کہتی تھیں اماں کہ دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ میرے ہاتھ دیکھیں کتنے خالی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں رہا۔ دولت سے کچھ بھی نہیں خریدا جاسکتا، نہ پرخلوص رشتے، نہ بے لوث محبتیں، نہ بے پایاں اعتبار۔ یہ سب کچھ تو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور ہم جیسے ناشکرے، خودغرض مطلب پرست لوگ انہیں ٹھکرا کر دولت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔'' زاہدہ اس کے بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں۔

''آپ ہمیشہ کہتی تھیں یہ شان دار گھر میرے ابا نے بنوایا تھا۔ یہ کیوں نہیں بتایا کہ گھر اینٹ سیمنٹ سے نہیں بلکہ محبتوں سے بنائے جاتے ہیں۔ جس فیکٹری کی ملکیت کا آپ ہمیشہ دعوا کرتی رہیں، یہ کیوں بھول گئیں کہ اس فیکٹری کے کھڑا کرنے کے فوراً بعد ہی ابا اس دنیا سے چلے گئے۔ اگر تب تایا ابا اور ان کے بیٹے اس کو نہ سنبھالتے تو یہ سرمائے سمیت ڈوب جاتی۔ اماں! یہ سب بھی تو ہماری طرح انسان ہیں، کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ ابا کی محبت نے انہیں ساری زندگی ہمارے ساتھ کچھ بھی برا کرنے کی اجازت نہیں دی۔''

زاہدہ ساکت سی اسے دیکھے گئیں۔ جس چیز کا اعتراف وہ تنہائی میں خود سے بھی نہیں کر پائی تھیں ان کی بیٹی نے کتنی آسانی سے سب کے سامنے کرلیا تھا۔ کمرے میں دادی کی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔ نین تارہ آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ ماں کے سرد ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''ابھی بھی وقت ہاتھ سے نہیں پھسلا۔'' اس کی خاموش آنکھوں نے التجا کی تھی۔

زاہدہ نے سختی سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے کچلا۔ زخم خوردہ انا ناگن کی طرح پھن پھیلا کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ نین تارہ کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھا تھا۔

اور لمحوں میں فیصلہ ہوگیا۔ ضمیر کے کوڑے نے شکستہ خوردہ انا کی پھن پھیلائے کھڑی ناگن کو کچل دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھیں اور دادی کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھوں سے نکلنے والے ندامت کے آنسو دادی کے پاؤں بھگونے لگے تھے۔

''معافی کا لفظ بہت چھوٹا ہے ماں جی! میں ایسا کیا کروں کہ اپنی طرف سے دیے گئے آپ کے سب دکھوں کا مداوا کرسکوں؟'' دادی نے انہیں گلے سے لگالیا تھا۔

☆☆☆

رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ صبح بادلوں نے ہلکا پھلکا ہو کر رخت سفر باندھ لیا۔ سارے منظر دھل کر صاف ہوگئے تھے۔

''میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں اماں!'' کچن میں تائی امی کے ساتھ مل کر کھانا پکانے میں مصروف زاہدہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں ساتھ چلوں؟''

نین تارہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں اپنے راستے میں جو کانٹے بو کر آئی تھی، ان ہی پر چل کر جاؤں گی۔ مسرت کا کوئی پھول تو منزل کی نوید دے گا۔''

اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ماں کا یوں سب کے ساتھ گھل مل کر رہنا۔ وہ مسکراتے ہوئے پلٹی۔ عقب میں آتے زارون سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''واپسی کا سفر کبھی بھی آسان نہیں ہوتا زارون! میرے لیے دعا کرنا۔ سنا ہے ٹوٹے ہوئے دلوں سے نکلی دعا اللہ جلد قبول کرلیتا ہے اور اس دن میرا واقعی وہ مطلب نہیں تھا جو تم سمجھے تھے۔''

زارون بشاشت سے مسکرادیا۔ نین تارہ نے راستے میں صلاح الدین کو میسج کیا۔

''صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو کیا آپ اسے معاف کریں گے؟''

فوراً جواب موصول ہوا تھا۔

''صبح کے بھولے نے اگرچہ لوٹنے میں بہت شام کردی۔ لیکن معافی ملنے سے پہلے کچھ ''سزا'' تو ملے گی۔''

''آپ کی ایک معافی کے لیے یہ سزا منظور ہے۔''

''شام تو ہو ہی چکی۔ رات ہونے سے پہلے پہنچو۔ ورنہ سزا کا دائرہ وسیع بھی ہوسکتا ہے۔''

ساتھ میں آنکھ دباتا ایک اسمائلی فیس۔

نین تارہ نے کار کی سیٹ پر سر ٹکاتے ہوئے طمانیت سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

☆☆

شانیہ مرتضیٰ

راہِ راست

''ہادی..... ہادی بیٹا کہاں ہو۔''

انعم کمرے میں موبائل لینے آئی تو ہادی کو بیڈ پر نہ پا کر موبائل کو بھول گئی اور اسے ڈھونڈنے لگی۔

''کہاں گیا، ابھی تو سلا کر گئی تھی۔'' واش روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن ہادی وہاں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''آنٹی! آپ نے ہادی کو کہیں دیکھا ہے۔ کمرے میں نہیں ہے وہ۔'' انعم نے پریشان نظروں سے ساس کو دیکھا جو ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھیں۔

''ادھر ہی ہوگا، کہاں جائے گا۔ صحیح طرح سے دیکھو۔'' شائستہ پروگرام دیکھنے میں بری طرح مصروف تھیں۔

''نہیں ہے آنٹی! میں نے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔'' انعم بیٹے کی گمشدگی سے روہانسی ہوگئی۔ روز ٹی وی پر بچوں کے اغوا کی خبریں سن سن کر ویسے بھی دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو میں دیکھتی ہوں کہیں باہر نہ نکل گیا ہو۔'' اب تو شائستہ کو بھی پریشانی لاحق ہوئی۔

''گیٹ تو بند ہے۔ چلو کمرے میں جا کر ٹھیک سے دیکھو۔''

شائستہ بھی انعم کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی واش روم سے پانی کی آواز آئی تو انعم جلدی سے واش روم میں گئی اور ساتھ ہی خوف ناک چیخ اس کے گلے سے برآمد ہوئی تھی۔

شائستہ بھی گھبرا کر واش روم کی طرف بھاگیں جہاں تین سالہ عبدالہادی..... اپنی ماں کے نئے موبائل کو صابن لگا کر رگڑنے میں مصروف تھا۔

''ہائے اللہ۔ میرا اتنا مہنگا موبائل، کیا حال کر دیا اس کا۔'' انعم نے جلدی سے موبائل ہادی کے ہاتھ سے چھینا اور اسے دوپٹے سے خشک کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ ''اب کیا کروں گی میں۔'' انعم نے موبائل کی حالت دیکھ کر باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

ہادی ماں کی آہ و بکا سن کر سہم کر دادی کے ساتھ چپک گیا۔ اس سے پہلے کہ اسے دو چار تھپڑ پڑتے دادی پوتے کو اٹھا کر موقع واردات سے فرار ہوگئیں۔

☆☆☆

شام کو اسد گھر آیا تو انعم نے نہایت غم زدہ انداز میں اسے بیٹے کا کارنامہ سنایا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسد کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی تھی۔

''آپ ہنس رہے ہیں اور یہاں میرا اتنا نقصان ہوگیا۔ اتنی مشکل سے کمیٹی ڈال کر مہنگا والا اسمارٹ فون خریدا تھا۔ آپ کے پیسے خرچ نہیں ہوئے نا جبھی آپ کو کوئی پرواہ نہیں۔'' ایک تو اس کا موبائل ابھی تک بے ہوش تھا اوپر سے اسد کی ہنسی نے اسے اور بپا دیا۔

''بھئی اب میں تین سال کے بچے کے ساتھ مار پیٹ تو نہیں کر سکتا نا۔ پریشان نہ ہو ٹھیک ہو جائے گا موبائل۔'' اسد نے انعم کو تسلی دی۔

''ویسے شہزادہ صاحب ہیں کہاں؟ پوچھوں تو ہماری بیگم کا موبائل کیوں خراب کیا۔'' اسد نے ہادی کو کمرے میں نہ دیکھ کر سوال کیا۔

''آنٹی لے گئی تھیں اسے ساتھ ورنہ اس وقت میرے ہاتھوں پٹ جاتا۔''

اسد، ماں کے کمرے کی طرف بڑھا تو انعم بھی ساتھ ہی چل دی۔

''بیٹا موبائل کو پانی میں نہیں ڈالتے ورنہ وہ خراب ہو جاتا ہے۔ دوبارہ آپ نے ایسا نہیں کرنا۔ ٹھیک ہے۔'' اسد نرمی سے ہادی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بابا! میں تو اسے نہلا رہا تھا۔ موبائل کے کپڑے گندے تھے نا۔ جب میرے کپڑے گندے ہوتے ہیں نا تو مما بھی مجھے نہلاتی ہیں۔'' ہادی نے آہستہ آہستہ موبائل کو نہلانے کی معصوم سی وجہ پیش کی تھی۔

اور انعم اس دن کو کوسنے لگی جب ہادی کے پوچھنے پر اس نے موبائل کے کور کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ اس کے کپڑے ہیں۔ آج ہادی نے اپنے نہلانے کا بدلہ ماں کے موبائل سے لیا تھا۔

☆☆☆

''اچھا، اب ذرا اپنی پٹاخہ ساس کی سناؤ، کیا کر رہی ہیں۔ آج کل'' حورین نے کافی دیر بات کرنے کے بعد اپنی پسند کا ٹاپک چھیڑا تھا۔

''بس یار! وہی ان کے ہفتے دس دن بعد پارلر کے چکر۔ کل بھی بال ڈائی کروا کے آئیں۔ اتنی عجیب

سی لگ رہی تھیں۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیسی لگ رہی ہوں۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ بہت اچھی۔ اب ان کے منہ پر کیا کہتی۔'' انعم بھی ہنستے ہوئے بولی۔

''ویسے حد ہوتی ہے۔ اپنی عمر دیکھیں اور یہ چونچلے۔ ہم تم کریں تو سمجھ میں بھی آتا ہے اور نہیں تو اپنی جوان اولاد کو دیکھ کر ہی یہ جوانوں والے شوق چھوڑ دیں۔''

حورین نے انعم کی ساس کی عمر کے بارے میں تبصرہ کیا تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہو۔ اب ہماری امی کو ہی دیکھ لو۔ ان کی ڈریسنگ کتنی سادہ اور باوقار ہوتی ہے اپنی عمر کے لحاظ سے۔ کتنی رعب والی لگتی ہیں۔ سنجیدہ سی۔ اب بندہ اس عمر میں پنچ کرا کتنے شوخ کپڑے پہنتا۔ ہیئر اسٹائل بدلواتا اور محفلوں میں ٹھٹھے لگاتا کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔'' انعم نے بھی اپنے پسندیدہ ٹاپک کو طول دی۔

''یاد ہے تمہیں انعم! کالج میں ایک آنٹی ہوتی تھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے قریب تھیں لیکن ان کے فیشن یاد ہیں تمہیں''۔ حورین نے کالج کی یاد تازہ کرائی۔

''ہاں..... وہی جو اکثر سرخ رنگ کے کپڑے اور ساتھ میں سرخ رنگ کا ہی میک اپ کر کے آتی تھیں۔ لڑکیوں نے ان کا نام بڈھی گھوڑی لال لگام رکھا ہوا تھا۔'' انعم بھی یاد آنے پر ہنسنے لگی۔

''بالکل، تمہاری ساس کا بھی وہی حال ہے۔''

''اچھا چھوڑو ان قصوں کو، میں نے ابھی نماز بھی پڑھنی ہے۔ اسد بھی موبائل مانگ رہے ہیں۔'' انعم نے بات ختم کرتے ہوئے کال کاٹ دی۔

جب سے ہادی نے اس کا موبائل خراب کیا تھا اب بہن سے اسد کے ہی موبائل پر بات ہوتی تھی۔

☆☆☆

''امی پتا ہے آج میری دوستیں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری امی کتنی اسمارٹ ہیں۔ بالکل تمہاری بڑی بہن لگتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ وہ دادی بھی بن گئی ہیں۔'' ردا نے ماں کو دن بھر کی روداد سناتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ انہوں نے کہاں دیکھ لیا مجھے۔'' شائستہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہادی کی سالگرہ کی تصویریں دکھائی تھیں نا۔'' ردا نے مونگ پھلی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''کہہ رہی تھیں کہ تمہاری امی تو بالکل ماہ نور بلوچ جیسی اسمارٹ ہیں۔'' میں نے کہا بھئی اب اتنی محنت کرتی ہیں خود کو فٹ رکھنے کے لیے تو کیوں نہ اچھی لگیں گی۔ اور ویسے بھی آپ ان عورتوں کی طرح تھوڑی ہیں جو بچوں کے جوان ہوتے ہی خود کو بوڑھا تصور کرنے لگیں۔''

''نہیں بیٹا! اس میں محنت کی کیا بات ہے۔ انسان کو ہر عمر میں اچھا اور صحت مند دکھنا چاہیے۔ ویسے بھی انسان کا دل جوان ہو تو عمر سے فرق نہیں پڑتا۔ خود کو زمانے کے لحاظ سے چلانا چاہیے۔'' شائستہ نے مسکراتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔

''ویسے امی! آپ نے بھابھی کی امی کو دیکھا ہے آپ کی ہم عمر ہی ہوں گی لیکن ان میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

بھابھی کی امی کا لفظ سن کر کچن میں کام کرتی انعم کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

''بس بیٹا! ہر ایک کی الگ سوچ اور الگ فطرت ہوتی ہے۔ اگر وہ خود کو اس طرح اچھی لگتی ہیں تو مجھے اور تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔''

''مگر امی ابھی آپ نے کہا نا کہ زمانے کے مطابق چلنا چاہیے۔ ان کو تو دیکھتے ہی کسی اولڈ فیشن بوڑھی خاتون کا تصور آنے لگتا ہے۔ کم از کم بندہ اپنی ڈریسنگ تو فیشن کے مطابق کرے۔ اور ان کا تو ہیئر اسٹائل بھی اتنا پرانا ہے۔'' ردا کو بھابھی کی امی کچھ خاص پسند نہ تھیں۔

اپنی ماں کے بارے میں نند کے منہ سے یہ ارشادات سن کر تو انعم کے سر سے لگی اور تلوؤں میں بجھی تھی۔ اسی کی خیر خبر لینے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی کہ اسد کی آواز سن کر وہیں رک گئی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو ردا! آنٹی نے کیا پہنا ہے کیا نہیں۔ کیسا دکھنا ہے یہ ان کا اپنا حق ہے۔ تمہیں اگر یہ سب پسند نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہارے لیے اپنے آپ کو بدل لیں۔'' اسد نے آہستہ آواز میں ردا کو ڈانٹا۔

''سوری بھائی! میں تو بس ایسے ہی ایک عام سی بات کررہی تھی۔'' بھائی کو سنجیدہ دیکھ کر ردا بھی آہستہ سے بولی۔

''یہ عام سی بات نہیں ہے ردا! غیبت ہے اور تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں پتا ہوگا کہ غیبت کیا ہوتی ہے۔ اور دوسری بات انعم کی فیملی اب میری فیملی بھی ہے۔ اس لیے میں بالکل برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی بھی میری فیملی کے بارے میں نازیبا بات کرے۔'' نرم مزاج اسد اس وقت بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

''اسد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ آئندہ دھیان رکھنا۔ سوچو اگر انعم تمہاری باتیں سن لے تو اسے کتنا برا لگے گا کہ تم اس کی ماں کے بارے میں کیا سوچتی ہو۔'' شائستہ نے بھی بیٹی کو سمجھایا تھا۔

اور باہر کھڑی انعم تو ان کی باتیں سن کر خود اپنی ہی نظروں میں شرمندہ ہورہی تھی۔ وہ بھی تو یہی سب کچھ کرتی تھی۔ اگر ان میں سے کسی کو پتا چلتا تو کیا سوچتے میرے بارے میں۔ انعم یہ سوچ کر ہی لرز گئی تھی۔

☆☆☆

''کیا ہوا خیریت تو ہے۔ آج اتنا سناٹا کیوں ہے۔'' اسد کمرے میں آیا۔ تو ردا کو کافی دیر خاموش دیکھنے کے بعد بول اٹھا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔''

''نہیں کچھ تو ہوا ہے ورنہ تم اور اتنی خاموش ایسا آج تک تو ہوا نہیں۔ ہاں ابھی تک حورین سے بات نہیں ہوئی اسی وجہ سے خاموش ہو۔ یہ لو بات کرلو اس سے۔'' اسد نے موبائل انعم کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ موبائل لے کر انعم کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

''خیریت تو ہے انعم! کب سے نوٹ کررہی ہوں آج تم صحیح طرح سے بات کیوں نہیں کررہی ہو۔'' حورین نوٹ کررہی تھی کہ انعم کچھ چپ چپ سی ہے۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''کچھ تو ہے۔ کچھ الجھی الجھی لگ رہی ہو۔ اسد بھائی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے یا ساس نے کچھ کہا ہے۔'' حورین اس سے اصل بات اگلوانے کے چکر میں تھی۔

''نہیں یار، اسد سے کیوں جھگڑا ہوگا اور آنٹی انہوں نے تو آج تک مجھے کچھ ایسا ویسا نہیں کہا۔ اب کیا کہیں گی۔ بڑی اچھی ساس ہیں وہ۔''

''ہیں..... کیسی باتیں کررہی ہو انعم!'' حورین نے حیرانی بلکہ پریشانی سے پوچھا تھا۔

''اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ ساس ہے میری، کوئی دشمن تو نہیں جو ان کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کرسکتی میں۔'' انعم نے بھی اسی حیرانی سے جواب دیا۔

''میرا مطلب تھا۔ آج سے پہلے تو کبھی تم نے ان کی تعریف نہیں کی بلکہ میرے ساتھ مل کر ان کی برائیاں ہی کی ہیں۔'' حورین نے اسے پچھلی باتیں یاد کرائی تھیں۔

''ہاں غلط سوچ تھی میری۔ مجھے ان کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ جس طرح میں اپنی ماں کا احترام کرتی ہوں، ان کا بھی کرنا چاہیے تھا۔'' انعم کو اپنی غلطی کا احساس ہوچکا تھا اور وہ اعتراف بھی کررہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔'' حورین نے پھر سے انعم کا مذاق اڑایا تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے آج اسد اور آنٹی کے خیالات سن کر تو میں بہت شرمندہ ہوئی۔'' پھر انعم نے اسے ساری بات کہہ سنائی تھی۔

اسد نے کال ریکارڈنگ سن کر مسکراتے ہوئے سکون کا سانس خارج کیا تھا۔ ایک ایسی ہی کال اس نے پہلے بھی سنی تھی جب دونوں نے اس کی ماں کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کررہی تھیں۔ سن کر اسے غصہ تو بہت آیا تھا مگر وہ دھیمے مزاج کا بندہ تھا۔ اسی لیے اپنی بیوی کو راہ راست پر لانے کے لیے بہن کے ساتھ مل کر پلان بنایا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ اگر وہ اسے خود سمجھاتا تو ہوسکتا تھا کہ وہ ظاہری طور پر تو سدھر جاتی مگر اسے انعم کا دل صاف کرنا تھا۔ کسی کی راہ راست پر آنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے اور کسی کو سالوں بیت جاتے ہیں۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا ہو تو ضروری نہیں کہ ہر بار انگلی ٹیڑھی ہی کی جائے۔

☆☆

ماہنامہ کرن

اکتوبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

❁ بیاد محمود بابر فیصل،

❁ اداکارہ ''زہاب رانا'' سے شاہین رشید کی ملاقات،

❁ اداکارہ ''عالیہ علی'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیے''،

❁ اس ماہ ''اقصیٰ شہزاد'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،

❁ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،

❁ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ کے سلسلے وار ناول،

❁ ''کنار خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،

❁ ''دیس میں نکلا ہوگا چاند'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،

❁ ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کا ناولٹ،

❁ ''سوز عشق'' کوثر ناز کا ناولٹ،

❁ ''ہوئے جو تم مہربان'' بینش مجید کا ناولٹ،

❁ ایمل رضا، فوزیہ سرور، حرا احمد، سمعیہ خالد اور تانیہ چوہدری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

❁ **''کرن کتاب''**

ایشیائی خواتین کا بیوٹی سیکرٹ، چاول کا پانی، میرا ہیئر اسٹائل، روزانہ صرف ایک 'ناشپاتی'، نسوانیت کا دشمن لیکوریا، کچن اور آپ، کرن کا دسترخوان مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

اکتوبر 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

نازیہ رزاق

محبت غیر مشروط اور لامحدود

کسی قریب المرگ شخص کی آخری سسکی نما دھند ہر شے کو نگل جانے کے درپہ تھی۔ سال تھا ماضی قریب کا، مہینہ تھا گھاتک جاڑے کا اور وقت تھا چرند و پرند کے گھروں کو پلٹنے کا۔ اندرون لاہور کے بلند و پختہ بالکنیوں اور جالی دار کھڑکیوں والے گھروں سے پکوانوں کی اشتہاء بھری خوشبوئیں، سندیسوں کے مانند گلی کوچوں میں پھیلاتے۔ بھاٹی گیٹ کے محلے میں ایک گھر کسی اور منظر کا حصہ لگتا۔ نارنجی بیلوں اور گہرے بھورے رنگ کے مغلئی نقش و نگار والے دروازوں اور کھڑکیوں میں ایک آواز چھید کرتی، راز بتاتی جاتی۔

''سرسوں کا تیل ملنے سے روح پر پڑے آبلے ملائم نہیں ہونے والے آپا!'' تیز، گرج دار نسوانی آواز پہ نارنجی پھول سر ٹکراتے سرگوشیاں پھیلاتے۔

''خدا غارت کرے ایسے صاف گریبانوں والے شرفاء کو۔ بہوؤں کی اوڑھنیاں ڈھلک جائیں تو

بات طلاق کے لفظ پہ جا ٹکتی ہے۔ اور خود جا ہیں تو زندہ جلا دیں۔ راتوں رات دہلیز سے باہر پھنکوا دیں۔''

سانس لینے کی تیز آواز۔

''اب مجاہد بھائی کو دکھاؤ یہ چھلسا، نیلا پڑتا بدن اور وہ عزت مآب لے کر جائیں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بلکہ میں خود انہیں آفس سے یہیں بلواتی ہوں۔''

آپا نیم جان سی بیٹھی تھیں۔ جسم تھا کہ سارا درد نچوڑ نچوڑ رگوں میں ڈال رہا تھا۔

''سائرہ! بس بھی کردے۔'' سکینہ عبدالقیوم، پانی ملا سرسوں کا تیل آپا کے بدن پہ لگائے جاتی اور چیخے جاتی۔

''نثار کمپاؤنڈر کے پاس لے کر گئی تو محلے میں دھوم مچ جانی ہے۔ ہائے مجھے تو شرم مارے ڈال رہی ہے۔ لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ آپا کی ساس نے غسل کرتی آپا کو غسل خانہ باہر سے بند کر کے اذیت دینے کا نیا فارمولا نکالا ہے۔ پانی کی ٹنکی خالی۔ بدن پہ لگا گھٹیا تیز کیمیکل والا صابن کا چورا۔ مسلسل چار گھنٹوں میں وہ چورا تو سمجھو بدن میں یوں حلول کر گیا ہے کہ ان شاء اللہ صفیہ خالہ کی وراثت میں ہی منتقل ہوگا۔ اگلی نسل شدید خارش زدہ پیدا ہوگی دیکھ لینا۔''

سکینہ کی ملامتی نظریں ..... آپا کی سسکیاں اور سائرہ کا دائیں بائیں دھم دھم چلنا۔ صابن کا چورا جیسے سائرہ کے نتھنوں میں بھر دیا گیا ہو۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ بول بول کر اس چورے کو باہر نکالنا چاہتی اور وہ گھستا چلا جاتا۔

''اماں ہوتیں تو کہتیں ثریا عبدالقیوم ..... گھر گوند سے نہیں مشقت بھری ریاضتوں سے جڑتے ہیں اور اذیت بھری قربانیوں سے جڑے رہتے ہیں۔ اماں ہوتیں تو.....'' آپا سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ سائرہ کو چپ لگ گئی۔

''اماں ہوتیں تو ان کی آواز کی گونج بھاٹی گیٹ محلہ نمبر چار تک جاتی اور تمہاری ساس کی سماعتوں تک ہر ممکن دھمکی اتارتی۔ ہمارے لیے جنرل ہسپتال اتنا دور کبھی نہ ہوتا۔ تم ایسا کیوں نہیں سوچتیں آپا؟'' سکینہ کی بات پہ آپا مسکرا کے رہ گئیں۔

''پچھلے ہفتے کی بات ہے شعیلہ کی جھڑپ ہوگئی اپنی ساس سے۔ غصے میں واپس آگزرے۔ تایا ابا اسے دیکھ دیکھ کر افسردہ ہوتے رہے۔ دل جوئی کے لیے ابا کا سارا دسترخوان منگوا کے دیتے رہے اور خالہ امی نے شفیق بھائی کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ بے چارے اگلے ہی روز ماں کو لیے معافی تلافی کرنے چلے آئے۔'' سائرہ کے قلق ہی الگ تھے۔

دیوار پار رہتی خالہ اور تایا کی خانگی زندگی سے مثالیں چننے میں اس سے باکمال کوئی اور نہ تھا۔

''آپ کو یاد ہے آپا یہ وہی شعیلہ ہے جو شفیق بھائی سے شادی کے لیے کیسے ڈٹ گئی تھی اور تایا ابا اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ اب دیکھ لو۔''

سائرہ کو سکینہ عبدالقیوم کی خشمگیں نگاہیں بھی خاموش نہ کرسکیں۔

''اچھا بھلا سفیان بھائی رشتہ مانگتے تھے۔ کتنا چاہتے تھے وہ آپا کو۔ تین بار ماموں گھر آئے تھے پرناں جی..... ساری شرافت، ماں کی تربیت کا مان وغیرہ وغیرہ آپا کو ہی دیکھنا ہوتی ہے۔''

''تو کیا کرتی؟'' آپا پھٹ پڑیں۔ ''ابا کو مجاہد کا سول انجینئر ہونا بہتر لگتا تھا بس۔ سفیان کی کپڑے کی دوکان انہیں میرے مستقبل کی کوئی امید نہ دیتی تھی۔ تب میں سفیان کے لیے بولتی تو آج تم لوگ اس گھر آوازیں کسی چھوڑ نہ بول سکتی تھیں۔ ابا لے آتے سوتیلی ماں کو تم دونوں کی اچھی تربیت کے لیے۔ دینے کو میری مثال ہوتی۔ دیکھا کیسے باپ سے جھگڑ کے شادی کی سفیان سے۔ اماں کی تربیت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ یہ سب وہ میری گھٹی میں ڈال گئی تھیں اور میں آج تک اس گھٹی کو چاٹ رہی ہوں۔ جانے تم کہاں سے سیکھ رہی ہو ایسی گفتگو..... یہ دلائل۔''

سائرہ غصے میں باہر نکل گئی۔ ابا نے ہوٹل سے کھانا بھیجا تھا۔ آپا کے اجلال کو کھانا کھلاتے، خود کھالیا، ابا ہوٹل بند کر کے گھر لوٹ آئے۔ ابا کا سوجا سرخ منہ، خارش زدہ ہاتھ پاؤں دیکھے۔ پوچھا اور چپ ہوگئے۔

رات مجاہد بھائی آئے۔ آپا ابا کو دیکھنے لگیں۔

''گھر جاؤ پتری!'' وہ چپ چاپ چادر لپیٹنے لگیں۔ پھر چلی گئیں۔ گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

سکینہ عبدالقیوم کا گھر کچھ ایسا ہی تھا۔ ابا کا ہوٹل تھا درمیانے درجے کا، داتا دربار کی بائیں طرف والی گلی میں عبدالقیوم مرنجان مرنج تھے مگر فیصلوں کے ضدی۔ اماں اپنی جیٹھانی پلس بہن کا الٹ تھیں۔ انتہائی صابر اور سلیقہ شعار۔ اب تو اماں کو گئے بھی بارہ سال ہوگئے تھے۔ تین بہنوں کا بھائی نہ تھا۔ ابا کچھ لاپروا تھے۔ کچھ شریف۔ تایا اور خالہ کا خاندان ہمیشہ ان پہ حاوی رہا۔ سائرہ کو یہی بات باغی کررہی تھی۔

ثریا آپا کا سسرال بس ایسا ہی تھا۔ منتظم مزاج اور سخت دل۔ روز ہی کچھ نہ کچھ ہوا رہتا۔ ان بہنوں کا بولنا ابا کا مفاہمتی انداز آپا کا دبو پن۔ زندگی یوں ہی چل رہی تھی بس کہ.....

☆☆☆

عام دنوں سا دن..... سرما کی ڈھلتی شام۔ پنجاب یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھتی سکینہ عبدالقیوم کو آج گھر لوٹنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ تھکان نے جیسے رگیں کریدنے کا کام شروع کردیا ہو۔ گلی نمبر تین کی صوفیہ اور ہمسائی دوست نادیہ ہر روز کی طرح ہمراہ تھیں۔

اردو بازار یا پھر انارکلی سے ویگن پکڑ کے تینوں اکٹھی جامعہ پنجاب آتی جاتی تھیں۔ اب تو خاصی بے تکلف دوستی ہوگئی تھی تینوں میں۔ دھند نے دھرتی پہ اترتے ہی شام کا روپ لے لیا تھا۔ پرانی انارکلی سے پیدل گزرتے صوفیہ نے چٹخارے دار آہ بھری تھی۔

''کم بختوں نے دیسی گھی کے تڑکوں کی کیسی مہک پھیلا رکھی ہے۔'' روز گزرتی سکینہ نے اس دن جانے کیوں خاص توجہ سے اس قدیم مٹھائی گھر کو دیکھا۔ قدموں نے جانے کس کی اجازت سے رخ ادھر کو موڑ لیے۔

دو منزلہ عمارت رنگارنگ مٹھائیاں۔ بالائی منزل پہ سجی میز کرسیاں۔ ربڑی دودھ پیتے لاہوری۔

''اوایدر (ادھر) آیاڑ (یار) بادام والی خطائیاں تے پھڑ (پکڑ) ذرا'' جیسی صدائیں۔

سکینہ عبدالقیوم کو دیسی گھی والا گرم مٹھائی گھر جادوئی گھر لگا تھا۔

یہاں وہاں بھاگتے چھوٹے۔ مٹھائیاں بیلتے، بھونتے، تلتے حلوائی۔ شادیوں، سالگراؤں اور دیگر تقریبات کے لیے ٹوکرے تیار کرتے چست ماہر لڑکے۔ شیشے کے بنے خانوں میں مختلف ترتیب سے سجی ہر رنگ و قسم کی میٹھی سوغاتیں۔

''ہائے سارا بچپن ماں کو روتے گزر گیا اور جوانی جامعہ پنجاب کا رستہ نگل گیا۔ یہ انارکلی گلی نمبر ایک کا نعمت خانہ پچھتاوا رقم کر گیا زندگی میں۔''

سکینہ کا تبصرہ کئی لوگوں نے سنا اور مسکرائے۔ شیشے کی دیوار کے پار پڑی مٹھائیوں کے اس اور بیٹھے وجود نے ذرا جھک کے متاثر ہوئی لڑکی کو دیکھا۔

ہاں اس نے دیکھا اور نور نظر کو جالیا۔ اسے پالیا۔

''تو سن لو، زمان و مکاں میں سماعت رکھنے والو..... سکینہ عبدالقیوم شریف محل یہ قربان ہوگئی اور ان کے سوہن حلوے کو زندگی کا دوسرا عشق سمجھ بیٹھی۔''

''یہ پڑا ہے داتا دربار اور وہ پڑا تیرے ابا کا ہوٹل۔'' صوفیہ نے شیشے کے خانے پہ انگلی سے کھینچ کر نقشہ بنایا۔ جس کے شیشے پہ ناک چپکائے وہ سوہن حلوے پہ مرمر جائی۔

''یہ رہا تیرے ابا کا ہوٹل اور یہ رہا شریف محل۔ اب اتنی زور سے بولے گی تو عشق کی خبر ابا تک جا پہنچے گی۔ پھر تجھے روز یہاں کی مٹھائیاں ہی کھانے کو ملیں گی۔'' صوفیہ اپنی کہنی سکینہ کی پسلیوں میں پیوست کرتے ہوئے بولی۔ نادیہ پیسے گن رہی تھی۔

''او کوئی ہے بھائی! کوئی سو روپے کا سوہن ہی تول دو۔ سکینہ کمینی۔ دوسرا عشق تو بتا دیا پہلا کیوں اسرار کی پرتوں میں چھپائے پھرتی ہے۔''

نادیہ نے یہاں وہاں کسی بھائی کی تلاش میں دیکھتے پوچھا۔ تب شفاف مٹھائیوں سے نقش و نگار والی دیوار کے پیچھے سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے کب تک اس نے سکینہ کی چپٹی ناک اور گول ہوتی بھینگی آنکھوں سے فیض حاصل کیا تھا۔

''یہ سوہن حلوہ۔'' نادیہ بھائی نہ کہنا ہرگز نہ بھولی۔

''وہ بھی دیکھ لیتے ہیں، پہلے آپ کے سوال کا جواب تو سن لیں۔'' کیسی جرات، کیا اطمینان تھا کہنے والے کے ہر ہر انداز میں۔

دستِ مسیحا
گلِ بہیرا
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

''اللہ مرتضیٰ بھائی۔آپ سن رہے تھے۔'' صوفیہ کی باچھیں مخالف سمتوں میں چر گئیں۔ وہ نگاہیں سکینہ پہ رکھ کے بھول گیا ہو جیسے۔

''ہو گیا اب نکلیں؟'' سکینہ نے تندی سے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔

عصیلی گھبراہٹ، ہچکچاہٹ کے گھیرے میں آ گئی تھی وہ۔ مخالف کی آنکھیں پیغام دیتی روشنائی ہو جیسے۔ سکینہ عبدالقیوم کو اپنی بائیس سالہ زندگی میں کسی نگاہ نے یوں محتاط نہ کیا تھا۔ وہ نادیہ کا ہاتھ جکڑ کے باہر کی طرف بڑھی۔

''تجسس نے آدم کو جنت سے بے دخل کروا دیا تھا۔ یہ آپ کا پہلا عشق جاننے کا تجسس مجھے میرے نامہ اعمال کی نیکیاں بڑی عزیز ہیں محترمہ۔''

طلسم کدے کے جادوگر نے جاتے جاتے بھی منتر پھونک دیا تھا۔

''کم بخت میری زندگی میں آنے والا پہلا شخص نظر باز اور اول درجے کا ڈھیٹ ہے۔'' سکینہ نے چادر کا پلو سنبھالتے۔ سانس متوازن کرتے تبصرہ کیا تھا۔

''ارے نہیں بھئی میری گلی کے چنندہ خوبرو اور اعلیٰ نصب لڑکوں میں سے اول نمبر ہیں مرتضیٰ بھائی!'' صوفیہ کی جھنجھلائی۔

''تو بڑا اس حلوائی کی اولاد کا نسب جانتی ہے ناں۔ نہ شرم نہ لحاظ، نہ کوئی جھجک۔ یہ بھلا کیا طریقہ ہے کسی کی ذاتی گفتگو میں مخل ہونے کا۔ ٹھیک ہے سکینہ جوش میں تھوڑا اول فول بک گئی پر وہ تو پکڑ کے بیٹھ گیا بات کا پلو، جیسے سکینہ پہلا عشق اسے ہی کہنے کو تہید باندھ رہی ہو'' نادیہ کو جانے کون سے قلق اٹھ رہے تھے۔ سکینہ مسکرائی۔ چھوٹا لڑکا پیچھے سے بھاگتا آیا۔

''صوفیہ باجی۔ مرتضیٰ بھائی کہتے ہیں، یہ سوہن حلوہ تو لے لو۔ باقی باتیں پھر کبھی کر لیں گے۔'' نادیہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ سکینہ کا دل ہاں وہ بے ترتیب ہوا۔

''ناں مجھے ایک بات تو بتا۔ یہ کیا کھاتا ہے تیرا مرتضیٰ بھائی ہیں؟ کیسا ابن ڈھیٹ ہے۔ آیا بڑا شوخا۔ منہ تڑوائے گا سکینہ سے چل بھاگ کوئی پیسے نہیں۔''

سکینہ، نادیہ کے ہاتھ سے پیسے چھین کے دینے لگی۔

''اپنے مرتضیٰ بھائی سے کہنا۔ مانا کہ شریف محل سے تازہ تازہ عشق ہوا ہے مجھے۔ مگر وہ اس عشق کے جہیز میں نہیں ملا مجھے جو برداشت کیے جاؤں گی۔'' چھوٹا الفاظ رٹتا واپس ہو لیا۔

سوہن حلوہ کھاتے، مغلوں کی نگری کی گلیاں ماپتے، تپی بیٹھی سائرہ کو ہنس ہنس کے قصہ سناتے وہ مخالف کے اٹل ہونے میں بے خبر تھی۔ وہ آنے والے دنوں کے پرفریب ہونے کے بارے میں بے خبر تھی۔ وہ قطعی بے خبر تھی کہ.....

جامعہ پنجاب واپس لوٹتی وہ تین لڑکیاں خوفناک ہڑبڑاہٹ کا شکار ہوئیں۔ جب شریف محل کے باہر لگے تختے پر پڑھا۔

''اپنا پہلا عشق بتائیں مفت سوہن حلوہ پائیں۔''

''توبہ ہے..... یہ جرثومے کی اولاد کیا چاند چڑھانا چاہتا ہے بھلا۔'' نادیہ تشویش سے بولی۔ سکینہ نے قدموں کی رفتار طوفانی کر لی۔

''سکینہ احتیاط ہو جا بہن..... یہ سر پھرا تو خودکشی کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔'' سائرہ کا تبصرہ۔ اگلے دن تشویش سہ گنا ہو گئی۔

''جامعہ پنجاب سے تھکے ماندے لوٹنے والوں کے لیے خاص پیشکش۔'' انہیں تو خاصا پرہجوم لگا شریف محل۔ وہ قہر کی لگامیں تھامے شریف محل میں گھسی۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تم ضرورت سے..... کافی زیادہ جرات اور رفتار دکھا رہے ہو بنا مقابل کا مزاج جانے۔''

لہجہ بے لچک، آنکھیں سرد، کاؤنٹر پہ بیٹھے

مرتضیٰ شریف نے کیلکولیٹر پہ لکھے حرف بٹن دبا کے مٹائے۔ اس کے لیے سنجیدہ ہونے کے سوا چارہ نہ رہا۔

''اور کوئی راہ بھی تو نہیں۔'' کیا کوئی ہے؟'' والی نگاہ سے دیکھتے وہ بولا۔

''میرے پاس تو ہے۔ جامعہ پنجاب کو اور بھی بہت سی راہیں جاتی ہیں۔''

''اور میں ہمیشہ اس کاؤنٹر کے پار بیٹھ کے تمہیں آتے جاتے بس دیکھنے والا تو ہرگز نہیں۔ جرات تو کافی زیادہ ہے مجھ میں۔ ہے ناں؟'' وہ قلاقندسی ہوگئی۔

''تو یہ جرات لاہوری ہوٹل کے کاؤنٹر پہ بیٹھتے میرے ابا کو بھی دکھا آنا۔ ساری جرات کاٹ کے بھون دیں گے۔ ایسا ٹرکا لگائیں گے ناں کہ تمہارے ابا ساری عمر وہ میٹھا ہی ڈھونڈتے رہیں گے جس سے تمہاری مرچیں کم کرسکیں۔'' سکینہ کا جواب برجستہ تھا تو مرتضیٰ کا قہقہہ۔

''چل پھر ملتا ہوں تیرے ابا سے۔ کیا پتا تیرے پہلے عشق کی بھنک انہیں بھی ہو۔'' وہ آتش فشاں سی باہر آئی تھی۔ سہیلیاں گنگ..... سکینہ بے بس۔ منحوس شریف محل۔

☆☆☆

''جنید کو بتاؤں؟'' جنید شفیق اس کی خالہ اور تایا کا اکلوتا بیٹا، دوست بھائی، سائرہ جنید کی دشمن اول۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں..... تاکہ وہ لونڈوں کولے کے پہنچ جائے مٹھائی گھر اور پورا محلہ اور خاندان بھی اس واقعہ سے مستفید ہوجائیں۔'' پیسہ کی قاش منہ میں رکھتے مزید بولی۔ ''ابھی تو ایسی کوئی خاص بات نہیں کی اس نے جو اتنا ہنگامہ کھڑا ہوجائے۔''

''خاص بات میں ڈرنے لگی ہوں اس سے۔ دوستیں اب شریف محل دیکھتے ہی ہنسنے لگتی ہیں متجسس ہونے لگتی ہیں۔'' وہ یہ بتانے سے ڈر گئی تھی کہ وہ خود سے ڈرنے لگی ہے۔ یہ مرد ممنوعہ پھل جیسا تھا مہلک، مگر ترغیب دلاتا۔

اندرون لاہور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے جاتا۔ لنڈے کے عطا کردہ رنگی برنگی اون کے لبادے، ٹوپے مفلر۔

''ہم ٹھہرے ان کے لیے عصری غلام۔ کھانا خود ہے سوغاتیں بیٹیوں کو اور ہم پاگل پن کے عارضے میں مبتلا ہیں ناں، بیس بیس کلوگا جریں کش کرو۔ گھنٹوں چولہے کے سامنے کھڑے کفگیر چلاؤ اور خالہ ڈونگہ بھر حلوہ دے کے ہمارا چل چلاؤ کریں۔'' سائرہ کی بڑبڑاہٹیں ناکام احتجاج تھیں۔

سارا دن خالہ کا حلوہ لے اڑا۔ شدید دھند نے شام کو ڈھیٹ رات میں بدل دیا تو وہ حلوے کا ڈونگہ لیے باہر نکلی اور..... دل چاہا واپس مڑ جائے۔

کندھوں پہ شال اوڑھے، سن ہاتھوں کو رگڑتا وہ جیسے مودب ہوا۔ بولا

''اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' برہم سا شکوہ۔ سکینہ عبدالقیوم کیے قدم غدار نکلے۔

''آج چھٹا دن ہے سکینہ عبدالقیوم! مجھے برف ہوتے۔ تمہارا بوسیدہ کھدر کا بیگ، گھسا کینوس کا جوتا اور سیاہ سے سرمئی ہوتی شال..... ملک الموت کی قسم میں ترس گیا ہوں۔'' مرتضیٰ شریف کا برف سا چہرہ بخار زدہ سا لگتا۔

''ملک الموت کے رب کی قسم! میں ڈر گئی ہوں تجھ سے۔ دوسرا عشق تو جہاں شروع ہوا وہیں مر گیا تھا پہلا بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انارکلی سے نہیں لوئر مال سے رکشہ پکڑتی ہوں اب۔ اللہ تنگ کردینے والوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔''

وہ جھٹکے سے مڑا تھا۔ بات ختم رات شروع ہوئی تھی۔

☆☆☆

سکینہ کی زندگی پھر پرانے دن اوڑھ کے اینٹھ گئی۔ جامعہ پنجاب سے گلی نمبر 1 اور گلی نمبر 1 سے خالہ کا گھر بین الاقوامی تعلقات پہ بحثیں ذوبیلہ یا

شنیلہ کی آسودہ حالی پہ گفتگو، ابا کے ہوٹل کے پر مسالے دار کھانے۔ سب پرانی چیزیں، بوسیدہ راہیں۔ سائرہ پوچھتی۔

''سکینہ، وہ مٹھائی گھر والا کافی دن ہوئے چپ ہے کیوں؟'' وہ زبان کو روکے رکھتی۔ صوفیہ کے تجزیے یوں کہ.....

''مرتضیٰ بھائی تو اب محلے میں کرکٹ بھی نہیں کھیلتے۔ سامنے والے خواجہ صاحب نے نیا فریج لیا۔ سب کے پوچھنے پہ بولے، اب کھڑکیاں سنکھے تو ٹوٹتے نہیں۔ مرمت میں جو بچت لگتی تھی بیٹی کے لیے فریج خرید لیا اس کا۔ مرتضیٰ بھائی کی امی کل میری اماں کو بتا رہی تھیں کہ پہلے مرتضیٰ سبزیاں نہیں کھاتا تھا اب تو کچھ بھی نہیں کھاتا۔ ڈیڑھ ہفتے سے یونیورسٹی نہیں گیا اور دوست الگ ہمارا دروازہ توڑنے کو ہیں۔ میری اماں نے انہیں گڑھی شاہو کے ایک بزرگ کا بتایا ہے۔ کوئی ردبلا کا تعویذ وغیرہ دیتے ہیں۔''

نادیہ مشکوک ہوتی۔

''سکینہ! کہیں وہ تجھے اغوا تو نہیں کروانے والا۔ تیزاب گردی بھی.....''

ایسے موقعوں پہ صوفیہ اور نادیہ کی جھڑپ سارا راستہ طویل تر کر دیتی۔ پھر ایک دن.....

اس دن دھند نے سرد ہواؤں کو اپنا جانشین کیا تھا۔ صوفیہ چھٹی پہ تھی اور نادیہ کی کلاس ساڑھے گیارہ بجے تھی۔ لوئر مال سے وہ رکشہ لیتی تھی۔ داتا دربار کے سامنے سے اس نے رکشہ روکا۔

''بھائی جامعہ پنجاب۔'' بتا کے پیچھے کو چلی۔

''جامعہ گورنمنٹ کالج۔'' بتا کے بیٹھ بھی گیا۔

''اس رکشے پہ میں جا رہی تھی پہلے۔'' وہ کچکچائی۔

''ہاں تو تم بھی بیٹھ جاؤ..... بھائی جلدی کر یار! آج منہ سے آگ نکالنے والے پروفیسر کی کلاس ہے۔'' نظر انداز یوں کیا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

''بھائی..... اتارو اسے۔ میں پہلے آئی تھی۔'' بچوں سی ضد تھی۔

''تم چلو یار! مجھے ناصر باغ اتار دو۔ پیسے جامعہ پنجاب کے لے لینا۔'' فائل ترتیب میں کیے گیا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے۔ رکشہ میں نے روکا اور اب بیٹھ کے کوئی اور جا رہا ہے۔ بلے۔ اترو نیچے فوراً۔'' وہ رکشے پر لکھے مغلظات رٹتی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

''تمہارا دل نہیں ہے محترمہ! جو شرافت دکھا جاؤں۔ تم چل کیوں نہیں رہے یار۔''

وہ بے بس سی ہو گئی۔ رکشے والا بیزار۔

''باجی! جانا تے سی وی ادھر ہی ہے۔ راستے وچ پڑتا ہے ناصر باغ باؤ کو ادھرا تار دیں گے۔ لڑائی کیوں کر دے او۔''

''یہی تو بات ہے بھائی۔ یہ راستے میں بات کرتا چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے۔ میں اب کے ہرجانہ نہ بھروں گی۔'' ناراضی سے بولی۔ وہ سانس بھر کے بولا۔

''یہی تو بات ہے رکشہ چلا نہیں، میں ابھی بھاگا نہیں، ہرجانے کی فکر ابھی سے ہو گئی۔ بھاگ جانے اور ہرجانے کی دہائیاں پہلے ہی شروع۔''

شکایتیں تو ادھر بھی تھیں۔ رکشے والا آنکھیں میچے دونوں کو پرکھنے لگا۔

''باجی! بیٹھو نیں تو دوسرا رکشہ پکڑ لو۔'' رکشے والے نے للکارا۔ وہ پھولے منہ سے سوار ہوئی۔ کچھ دیر گزری۔

''میں اس دن بھاگا نہیں تھا۔ احتیاط کی تھی۔ کوئی گلی میں آ رہا تھا۔'' سیدھ میں دیکھتا وضاحت کرنے لگا۔

''اور اس کوئی کے ڈر سے آٹھ دن کسی غار میں چھپے بیٹھے تھے؟'' دوبدو کہا۔ سکینہ چپ رہ۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو سمجھایا بھی۔

وہ مسکرایا۔ ناصر باغ آ گیا۔ وہ اتر گیا۔ وہ اسے بھاگتے، سڑک پار کرتے لڑکوں سے مصافحہ کرتے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کے نئے مناظر نے جگہ لے لی۔ گیٹ نمبر 2 پر اتر کے کرایہ دینے لگی.....

''ہوگیا ہے باجی۔ مرتضیٰ بھائی دے گئے۔''
اسے لگا کہ طالب علموں سے بھری شاہراہ پر ہر ایک نے رک کے اسے دیکھا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے؟'' وہ بے تحاشا گھبرائی۔

''کون مرتضیٰ بھائی! میں کسی کو نہیں جانتی۔'' دوپٹا ماتھے تک پھیلاتے ہوئے وہ محتاط سا ادھر ادھر دیکھتی ہوئے بولی۔

''یہ پکڑو اپنا کرایہ اور آئندہ اگر مجھے کہیں دیکھو بھی تو رکشہ روکنے کی جرأت نہ کرنا۔ تمہارے مرتضیٰ بھائی کی بھائی گیری تو میں پوری کرتی ہوں۔'' وہ تاشقند کا آلو بخارہ ہوئی جاتی۔

''باجی! بھائی نے یہ بھی دیا ہے۔'' وہ تہ شدہ کاغذ لہراتے بولا۔

''خط.....'' کیا یہ خط تھا۔ اللہ..... وہ واقعی خط تھا سکینہ عبدالقیوم اپنی بائیس سال سات ماہ کی عمر میں کبھی ایسی صورت حال سے نہ گزری تھی۔ بہادر تھی۔ نڈر بھی مگر بے باک نہیں۔ خوف جیسے ہر مسام سے پھوٹ پڑا۔ جنوری کی یخ صبح میں وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

''منحوس..... کمینہ..... زہر ہو گیا ہے میرے لیے شیرہ ہوتے ہوتے۔ ہمت تھی تو خود دیتا۔ دفع ہو جاؤ اس کاغذ سمیت.....'' وہ طیش سے مڑی۔ چند قدم پھر واپس آئی۔

''یہ..... کاغذ۔ ادھر دو مجھے۔ کیا بھروسا کس کس کو پڑھاتے پھرو اور وہ غالب کا نواسا جانے کون کون سی حکایتیں لکھتا رہا ہے۔ دو ادھر۔ نظر مت آنا منحوس! ورنہ ڈاکیا گیری کرنے پہ تمہارا حشر خراب ہونے والا ہے۔'' کھوکھلا لہجہ' بے ربط دھمکیاں۔ گیٹ سے ڈپارٹمنٹ اور کلاس روم تک اسے مبالغہ تریسٹھ ٹھوکریں لگیں۔ دو لڑکیوں سے تصادم ہوا اور ایک لڑکے کا پیر کچلا گیا۔ زرد لب سے سر ٹکراتی مکھی دکھتی وہ۔ جامعہ پنجاب کے ٹنڈ منڈ ہوئے درخت اس پر قہقہے لگاتے اور اسے روہانسا کیے جاتے۔

''سکینہ! یہ واقعی خط ہے۔'' اندر سے اندیشوں کی آواز دہلاتی۔

''ہائے سکینہ! مرتضیٰ جیسے لڑکے کا خط..... کمینی ایسا کیا ہے تجھ میں۔ پڑھ کے دیکھو تو۔''

اس آواز سے نا آشنا تھی وہ۔ لذت میں مبتلا کرتی۔ خوش فہم کرتی حتیٰ کہ فہم سے ماورا کرتی آواز.....

''خالہ کی زوبیلہ کو بھی خط ملا کرتے تھے ناں۔'' مخفی سی پیشن گوئیاں۔

''کہاں زوبیلہ کے عامیانہ عشق اور کہاں سکینہ کا تغافل۔''

یہ آواز کپکپاہٹ' گھبراہٹ' ملامت کو مات دیے جاتی۔ وہ دھندا اترنے سے پہلے گھر لوٹ آئی مگر گھر میں.....

☆☆☆

''گڑھی شاہو میں ایک ملنگ بیٹھتا ہے آپا! ایک تعویذ لیتے ہیں ساس کے لیے' دوسرا مجاہد بھائی کے لیے پھر دیکھنا'' یہ سائرہ تھی۔

''تعویذ تو ہے میرے پاس۔ محبت کا' خدمت گزاری کا۔ اماں نے دیا تھا۔ میں بے نصیب اسے دبا بیٹھی ہوں رسوئی میں۔ ساس کی پالتی اور شوہر کی چاکری میں۔ نتیجہ بھی مل ہی جائے گا۔'' یہ ثریا آپا تھیں۔

''آپا! اسے دبانا نہیں تھا ناں..... دینے سے تو وہ سمجھوتے کا آسیب بن جاتا ہے۔ تم اسے صحن میں اگاتیں۔ ساس کی بیٹیوں میں لگاتیں اور شوہر کی آنکھوں میں سجاتیں۔ نتیجہ تمہیں حیران کر دیتا۔''

یہ سکینہ تھی امید پسند، بلند عزائم، کھدر کے بیگ کو کبھی الماری میں رکھتی کبھی سنگھار میز کی دراز میں۔ سائرہ اسے جانچ رہی تھی۔

''یوں کرو بیگ اجلال کے منہ میں رکھ دو۔ ناں یہ کبھی منہ کھولے گا نہ بیگ میں موجود بلی باہر آئے گی۔'' اجلال کو گدگداتی سائرہ کا عام سا لہجہ سکینہ کو ساکت کر گیا۔ تخت پہ لیٹی آپا سر اٹھا کے دیکھنے لگیں۔ اجلال گھبرایا تھا۔ منہ میں بلی۔

''السلام علیکم عبدالقیوم کی مہارانیوں۔'' خالہ اپنے گوشت بھرے وجود کو گھسیٹ کر آتے ہوئے پھولے سانس سمیت بولیں۔ سکینہ اور آپا فوراً آگے بڑھیں۔

''ناں ثریا! میری تو آج تک تجھ سے گرمی سردی نہ ہوئی کبھی۔ تو نے ہمیشہ عزت کی اور میں نے بھی ماں بننے میں کسر نہ چھوڑی مگر یہ! تو بتا بہنوں سے ملنے ہفتہ وار آسکتی ہے تو ماں جائی کا دو بالشت دور کا مکان کیا تیری یادداشت سے محو ہو چکا ہے جو دو ماہ ہوئے ادھر کا رخ نہ کیا تو نے۔ آج تو مجھ رہا نہ گیا۔ جنید نے بتایا کہ تو آئی ہے تو اس سے کہا سکوٹر ہر پرلا دمجھے۔ آج خبر لاتی ہوں ثریا بانو کی۔''

''اماں! ثریا باجی تو سیرالی جھیلے نبٹاتی آتی ہیں۔ بھول سکتی ہیں یا پھر الزام تھکن کو بھی دیا جا سکتا ہے مگر یہ اپنی سائرہ بانو کا بے سبب تغافل تو دیکھیے یہ کالج آتی جاتی ہمارے گھر کے سامنے سے یوں گزرتی ہے جیسے نو دولتیے اپنے پرانے رشتے داروں کے قریب سے۔''

جنید سائرہ کو بس دیکھتا، الفاظ نہ سوچتا۔ سائرہ دبا دبا سا پیچتی۔

سہ پہر نے شام کے بعد رات کی چادر اوڑھ لی۔ خاندان، آباؤں کے سسرال، موسم، مہنگائی، سیاست، بچوں کی تعلیم و تربیت۔ چائے پیتے، پیٹھے کا حلوہ کھاتے مونگ پھلیاں ٹونگتے یہ سارے موضوعات سیر حاصل گفتگو کا موجب بنے۔ خالہ اور آپا اپنے گھروں کو لوٹیں تو خاموشی سارے میں لوٹنے لگی۔ سائرہ کا ریڈیو سننے کا وقت ہوا تو وہ جھٹ کھدر کے گھسے بیگ کی طرف لپکی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے شدید اضطراب سے مڑمڑ دیکھتی۔ ''کرلو، کرلو، بھی نہیں اب کروبس۔'' جیسی ہدایات اور دعوتیں۔ چھت پورے لاہور سی یخ اور روشن تھی۔

برآمدے کے سامنے ایستادہ لوکاٹ کے درخت نے ٹنڈ منڈ شاخیں بانہوں سی پھیلا رکھی تھیں۔ وہ شہر زندہ دلان کو دیکھتی رہی۔ ہوائیں سکینہ عبدالقیوم کے پیتل سے گالوں، روئیں سے بالوں کو فرط اشتیاق سے اور شور مچاتی گلی نمبر تین کی ایک بانکے کے کانوں تک راز پہنچاتیں۔

غلامان عشق معشوق کا حسن قتل یوسف نہیں چاہتے
غلامان عشق چاہتے ہیں زلیخا سی توبہ و وفا

اس نے خط کھولا، مجھو نامہ اعمال کا نیا صفحہ کھول دیا۔ خط سے مرتضیٰ امجد شریف جھانکنے لگا سکینہ عبدالقیوم کی آنکھوں میں۔ وہ سامنے ہی تو تھا۔ ہونٹ کا کونا دبائے بولتا۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے انگریزی بلاک میں منحنی سا کامران وٹو ہوتا ہے۔ شکل اتنی ناقابل بھروسا کہ کوئی سوڈا بوتل نہ پلائی مگر اس کا طوطا..... خاصا شہرہ ہے اس طوطے کا۔ کل ملا کے تینتالیس مرید ہو گئے ہیں وٹو صاحب کے..... یا پھر شاید طوطے کے۔ چند ماہ پہلے مجھے جانے کیا سوجھی، طوطے کی فال کچھ یوں تھی۔

میں کیا آدھا گورنمنٹ کالج تنہا تھا۔ خیر تب تلک کسی نے تسخیر جو نہ کیا تھا۔

میرے چچا کہا کرتے تھے۔ محبت کے بغیر مرد کسی پہاڑی سلسلے سے منسلک غیر اہم چٹان ہے۔ پاک ہوتی ہیں ایسی چٹانیں بے شکن آسودہ۔

محبت مرد کو پہاڑ بنا دیتی ہے۔ جسے روندا جاتا ہے۔ سر کرنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ کیل ٹھونکے جاتے ہیں۔ باندھا جاتا ہے۔ سفر کرنے والے سر پر کھڑے ہو کر کامیابی کا جھنڈا لہراتے ہیں اور پھر واپس۔ میلا کر دیتا ہے پہاڑ ہونا۔ پرشکن، ناآسودہ۔ میں چچا کا ایسا شیدائی کہ اس بات کو کان میں بولیا۔ اپنی چوبیس سالہ زندگی میں چٹان بنے اور چٹان ہی ہوا۔ خود کو پہاڑ نہیں ہونے دیا۔

کل رات میں نے قانون کی کتابیں بند کر کے ابا جی کا کھاتے والا رجسٹر کھولا۔ خاندان، برادری، محلے دار، دوست احباب جن لڑکیوں کو جانتا تھا ان کا نام لکھا۔ یونیورسٹی فیلوز دوستوں کی بہنیں، ابا جی کے دوستوں کی بیٹیاں کچھ یہاں وہاں سے۔ میں

جانا کہ میں اٹھارہ سے تیس سال کی کم از کم ایک سو اٹھ لڑکیوں کو جانتا ہوں۔ کچھ کو کم..... کچھ کو زیادہ۔ کچھ کو باقاعدہ دلچسپی ہے مجھ میں اور کچھ کو بے قاعدہ۔ ملک الموت کی قسم مجھے کبھی کوئی موتی مالا میں اچھی نہ لگی۔ بھینگی آنکھوں اور چپٹی ناک میں تو۔ لکھتے لکھتے ہاتھ ٹھٹک گیا۔

تو لب لباب یہ سکینہ عبدالقیوم مجھے تم سے محبت نامی مرض لگ گیا ہے۔ اتنا سچا..... اتنا کھرا کہ میں اس پہ کوئی شرط نہیں لگاتا۔ نہ اہل کوہ قاف سی صورت کی نہ اہل عرش سی معصومیت کی۔ اس محبت کو نہ تو بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی درکار ہے نہ ہیروں کے تاجر کی دختر۔ حد تو یہ ہے صاحب کہ کوئی حد بھی نہیں لگاتا۔ بلا شرط اور بے حد محبت ہوگئی ہے تم سے واقعی یہ ہے۔''

لوکاٹ کی کسی شاخ نے خاموشی سے چیں بہ جبیں ہوتے اس کے بازو کو سہلایا تو وہ چونکی۔ یہ کیا تھا؟ آپ بیتی یا پھر روداد میری پہلی محبت کی۔ وہ چٹخی۔ نہ اس کے حسن میں قصیدہ خوانی۔ نہ عشق پر سوز کی بے تابیاں وارفتگیاں۔ وہ پیر پٹختی نیچے آئی تھی۔ ہاں مگر لحاف میں گھستے اسے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ نیند میں جاتے آخری خیال بھی یہی تھا۔ وہ مونچھوں کو بل دیتا کہہ رہا تھا۔

''محبت ہوگئی ہے بس۔ شرط کوئی نہیں اور حد بھی.....''

☆☆☆

آنکھ کھلنے کی وجہ سائرہ کا تشدد تھا۔ پاؤں کا انگوٹھا بڑی حد تک موڑ دیا تھا اس نے۔

''تمہیں بد دعا لگے گی مجھ بن ماں کی۔'' خط لہراتے وہ دھاڑی۔ سکینہ کی آنکھیں نیند کو چت کر کے سینے پہ چڑھ بیٹھیں۔

''میرا نہیں یہ میرا نہیں ہے۔'' بچکانہ بوکھلاہٹ تھی۔

''اچھا پھر ابا کا ہوگا۔'' اداکاری کی انتہا تھی۔ سکینہ نے موقع دیکھتے ہی جھپٹی ماری۔

''کم بخت اٹھتے ہی کیا مروڑ اٹھا تمہیں تلاشی لینے کا۔ خبردار جو قریب آئیں۔ میں سالم نگل جاؤں گی۔ ثبوت ہی ختم۔ ابا کو بتایا تو رو رو کے وہ کوسنے دوں گی تمہیں کہ ابا کو مانتے ہی بنے گی۔'' جنوری کی کڑکتی سردی میں سکینہ کا ماتھا، ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں تھے۔ سائرہ کو ڈھیروں ہنسی آئی۔

''کیا، کیا سوچ رہی ہے؟ ابا کو کون بتائے گا۔ ہے یہ تو ترپ کا پتا ہے۔ یونہی میں پھینک دوں گی کیا؟ خیر چھوڑ مجھے بڑا مزا آیا ہے پڑھ کے قسم سے۔ پہلی ہی جھلکی میں بندے نے تجھے بارودی سرنگ پہ بیٹھا دیا ہے اور سمجھا دیا ہے کہ دیکھو، جہاں اور بھی ہیں۔ زیادہ اڑنے کی کوشش کی تو اڑ جاؤ گی۔''

''بندہ..... ہونہہ تیتی خورہ..... بدذوق ایسے لکھتے ہیں محبوبہ کو خط؟ نہ سر نہ پیر۔ نہ الفاظ اچھوتے نہ انداز۔ منہ سنبھال رکھے اپنا۔ سوچے بھی نہ کہ گلی نمبر 3 کو کبھی تاکوں بھی میں۔ صوفیہ کو پکڑاتی ہوں واپس یہ الف لیلوی پہیلی۔ سچی بڑا دل کٹا ہے میرا۔ خط ملا بھی تو.....'' وہ منصوبے بناتی، تخمینے لگاتی رہی۔ تیسرے دن صوفیہ چہک چہک کے بول رہی تھی۔

''سکینہ میری سہیلی، مجھے پونے دو سال تیرے ساتھ ویکنوں، رکشوں پہ خوار ہوتے بھی خبر ہی نہ ہو سکی کہ گلستان میں پہلا ثمر میرے ہی ہاتھوں لگنے والا ہے۔''

''مرتضیٰ بھائی جب سے یہ خط مجھے دے کر گئے تب سے میں ساعتیں ٹاپ رہی تھی۔ بس یہ پکڑ۔ میرا خیال ہے آتے ہوتے ناصر باغ جاتے ہیں وہیں تو ہمیں یہ پڑھ کے سنانا۔'' سکینہ نے خط جھپٹا۔

''کمینی تجھے بڑا لطف آ رہا ہے اس لین دین کی کڑی بنتے۔ حیا کر کچھ، تو بھی ایک لڑکی ہے آخر کو۔ اگر یونہی کوئی تجھے کسی کا خط پکڑائے تو؟''

خط ملنا خاصا نایاب ہو رہا ہے لڑکی۔ اب کہاں ملتے ہیں مرتضیٰ امجد جیسے لڑکے۔'' الٹا صوفیہ اس سے لڑکوں کی کم یابی کا رونا رونے لگی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ نادیہ ساتھ نہ تھی آج۔

یوں دوسرا خط اس نے پنجاب یونیورسٹی شعبہ

سیاسیات کی سیڑھیوں پہ بیٹھے، کتاب میں چھپائے پڑھا مگر ہائے یہ نہ چھپتی مسکراہٹ ..... چونکا دیتی آنکھوں کی لو..... فکر میں مبتلا کر دیتی ہاتھوں کی لرزش۔ متن کچھ یوں تھا۔

''مالک جاں کی قسم سچ کہا تھا..... محبت مشروط نہیں میری۔ ہرگز نہیں۔'' جذبے بمعہ شرط برابر ہوتے ہیں سوداگری کے۔ سمجھوطے پاتا ہے تم میری محبت لے لو، میں تمہاری توجہ، مستقبل وغیرہ۔ مجھے خوش رکھو گی تو تمہیں خوش ہونے سے کوئی نہ روک پائے گا۔ دیکھو پوری ناپ تول کر تم پانچ سیر دوگی میں پانچ سیر سے رتی کم نہ کروں گا اونچ نیچ کی تو میرا ذمہ توش پوش..... مانا کہ مجھ سے اسی ہلکے درجے کی محبت نہیں ہوتی۔ تم گالیاں دو، اعزاز لگتا ہے۔ منہ دھو رکھو، کہو تو مدح سرائی۔ محبت نہ بھی کرو تو میں ہوں ناں قربان شیدائی۔ سلامت رہے اس عاشق کی یک طرفہ محبت۔

سب کے باوجود مجھے انتظار رہا۔ جاں گسل سا انتظار۔ روح نوچتا۔ دل بھنبھوڑتا، لگنے لگا ہے معشوق محبت میں مبتلا نہ ہو تو کوسنے دینے کے عارضے میں مبتلا ضرور ہو۔ اور کیا ہوتا ہے رابطے کا ذریعہ قائم رہتا ہے۔ تو سکینہ عبدالقیوم پچھلے تین دن سے میں نے بصارتوں، سماعتوں اور دل کو حکم دے رکھا ہے کہ چوکنا مت۔ محبوبہ کا پیغام آئے اور غیر کی نظر بھی پڑے۔ بدشگونی نہ ہو جائے۔ آہ خط ہنوز ندارد است۔ سنو مایوسیاں روشنی نگل جاتی ہیں۔'' وہ فقط مسکراتی رہی۔

''دوسرے ہی خط میں خاصی بہتری دکھائی ہے محترم نے۔ زبان دان نہ سہی، محبت دان لگا ہے مجھے۔ یوں جیسے پچھلے خط میں جو کوتاہیاں تھیں اب کے سدھار دیں۔ پورا وکیل ہے بہنا..... کیسے دلائل دیے لامشروط محبت کے۔'' سائرہ کو جیسے مشغلہ مل گیا۔ وہ آتی تو پہلے فائل بیگ کتابیں چھانتی۔ خط پڑھتی پھر بے لاگ تبصرے۔ سکینہ ناخن کترتی رہی۔ لکھوں؟ نہ لکھوں؟

رات سوتے سے اٹھ بیٹھی۔ ٹھٹھرتے ہاتھوں اور تمتماتے گالوں سے کاغذ، قلم سنبھالا۔ دل تو یوں بھی آج تیز گام سا چلتا تھا۔ لکھنا کیا چاہتی تھی لکھتی کیا رہی۔

☆☆☆

تین جمعرات ہوئے اسے نیاز کا زردہ بانٹتے۔ سرخ اینٹوں والے دھلے دھلائے شفاف صحن کے وسط میں وہ سیاہ رنگ لباس میں کھڑا، انگلیوں سے بال جماتا، بہنوں سے جان چھڑاتا۔

''مجھے نہیں کھانا بتول خالہ کی بہو کے ہاتھ کا ہریسا۔ یہ کیسی دہشت گردی ہے بھئی۔ میں نے ایک چاند ہوا منت مانی ہے جمعرات کی شام زردہ بانٹنا ہے جاؤں؟''

اماں رنگ ڈھنگ نوٹ کیے جاتیں۔ بہنیں جو ہر ٹاؤن میں بستی خالہ کے گھر جانے کو بضد۔ صوفیہ لپکتی جھپکتی آئی۔ بھرا صحن دیکھ کے سٹپٹائی۔

''السلام علیکم خالہ اماں نے درس رکھا ہے۔ روما، سوما وغیرہ کو بھیجنا۔''

چھ بہنوں میں گھرا مرتضیٰ امجد صوفیہ کو دہلا گیا۔ کیسی درگت بنائیں گی یہ ماں بیٹیاں میری اگر جو انہیں خبر ہو میری ڈاکیا گیری کی۔ جھرجھری سی آئی۔

''مرتضیٰ بھائی کدھر کا رستہ ناپنے چلے ہیں؟'' بتانے پہ بولی۔

''کمال ہو گیا تیسری جمعرات ہی عرض پوری ہو گئی مرتضیٰ! بھائی اب تو مٹھائی بانٹ لیں بس۔'' ابرو نچائی صوفیہ، جمیلہ امجد کو زہر لگی۔

''اے جھلی کیسے لچک لچک کے بات کرتی ہے۔ کیسی عرض؟ کون سی منت؟'' بیٹا صوفیہ کے پیچھے لپکتا دیکھ کے وہ تلملائیں۔

''پیڑا غرق..... یہ کہاں اڑا لے گئی مرتضیٰ کو بھائی کی فکر لو کرو، ہریسہ لیپو گی گرڈائن ہیرا لے اڑی۔''

سدا کی وہمی اماں ـــ گھبرو بیٹا یونہی ہولائے رکھتا۔ اکلوتا ہونے کی تلوار تھی جو لٹکتی رہتی۔ ''جو کوئی لے اڑی تو.....'' بیٹیاں ماں کی ہم خیال۔ محاذ خاصا

گنجلک تھا۔

☆☆☆

مرتضیٰ امجد اندرون لاہور کی گلیاں دھمک دار قدموں سے ناپتا۔ یوں جیسے نادرشاہ کے سپاہی دہلی کی گلیوں میں چلتے ہوں گے۔ فتح اور وحشت کو پیشانی سے دبوچے۔

دنیا سے غافل فقیر کے پہلو میں بیٹھتے مرتضیٰ نے قمیص کی جیب سے خط نکالا جو صوفیہ نے تھمایا تھا۔ اس لمحے کرہ زمین کا کوئی بھی جی دار مرتضیٰ امجد کو دیکھ لیتا تو اسیری لازم ہو جاتی۔ تحریر ہونٹوں پہ انگلیاں جمائے پڑھتا۔ سکینہ نے موتی پروئے تھے۔

غلامان عشق کچھ اور نہیں ہوتے ماسوائے لمحہ سکوں کے غلامان عشق قابل ہوتے ہیں فقط چاہے جانے کے

''میرا قصہ کچھ یوں ہے کہ ابا یوں تو خاصے مرنجان مرنج ہیں مگر ایک ضد کر بیٹھے چھوٹی خالہ سے محبت۔ اماں بھنگی تھیں۔ صابر، سلیقہ مند۔ دادی کو اماں بھا گئیں اور شوخ و حاضر جواب الفت خالہ ابا کو۔ ابا کی شرافت نے دادی کو جتوا دیا مگر ان کی بے دلی میری ماں کو کھا گئی۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے..... مجھے اس آسیب سے ڈر لگتا ہے جو ابا کو لگا تھا۔ میں نے دیکھا ہے اپنی محبت کو برتتی اپنی اماں کو ابا کی پٹڑی پہ چلتی ریل جیسی بے رونق زندگی۔ خالہ صبح ساتھ بجے اٹھتیں..... اماں چار بجے۔ ابا کی آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے گھر چمکاتیں، بچے سنوارتیں۔ پھر نیلی شیشے کی ڈبیا اٹھاتیں، گالوں پہ رگڑتیں۔ بال ہونٹ، ناخن تک سجاتیں۔ ابا اٹھتے کچھ کھاتے اور یہ جا، وہ جا اماں کی کریم باسی ہو کے رنگ بدلتی۔ ہونٹ سرخ سے زرد۔

شام ڈھلنے کو آتی تو اماں پھر سے وہی عشق دہراتیں۔ آٹے دودھ کے لیپ۔ چوڑیوں کے بدلتے رنگ۔ سارے جتن کر لیتیں پر ابا، وہی بے حس، غیر متوجہ، اماں تھک جاتیں تو ملنے جاتیں چھوٹی خالہ کو پنڈی خالہ۔ کو دیکھتیں۔ گھر آ کر نقالی کرتیں مجھے اپنی ماں پہ ترس آتا۔ وفاداری، صبر، سلیقہ کافی نہیں کیا؟

پھر ایک دن اماں مر گئیں۔ ابا کو کچھ نہ ہوا۔ رسوئی ویران ہو گئی ہماری۔ صحن بے رونق، سمسالوں میں پھپھوندی لگ گئی۔ مرتبانوں کے پیندے سوکھ گئے۔ مرتضیٰ امجد میں تلوار کی انی حلق میں دابے کھڑی ہوں۔

''محبت کروں تو کہیں ابا نہ بن جاؤں۔'' محبت نہیں ملتی تو.....

''محبت نہ کروں تو اماں نہ رہ جاؤں۔ (کسی ایک کی محبت سے پیٹ بھرا ہو تو کسی دوسرے کا دیا خالی پیالہ چاٹنا سہل ہو جاتا ہے)

دل کہتا ہے ناشکری نہ بن..... دماغ کہتا ہے پاگل۔ خط کی طلب بھی رہتی ہے اور اس سے منسلک ببول بھی تناور ہوتے جاتے ہیں۔ ڈر کے سوا اور کچھ نہیں میرے پاس۔''

وہ سر نیہواڑے بیٹھا کبوتر دیکھتا۔ لاجواب..... ناامید۔ وہ جو کچھ نہ رہا تھا، اب اس کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ دامن جھٹک کے آگے بڑھ جانا اسے تھکا دینے جیسے لگا۔ وہ یونانی فاتح کا سپاہی دکھتا تھکا ماندہ..... پاسیت بھرا۔ وہ فقیر جو رخ موڑے اس کی کاغذ کے ٹکڑے کے لیے عقیدت پرکھتا تھا۔ آنکھیں میچ کے خود کلامی میں بولا تھا۔

غلامان عشق بتلا کیے جاتے ہیں سان پر تیز کیے آلہ کی آزمائش میں غلامان عشق معشوق کے تحفہ ناسور کو بھی حرز جاں رکھتے ہیں

وہ مسکرا اٹھا۔ ''سکینہ عبدالقیوم تم وہ ہرگز نہیں کہ جسے مرتضیٰ امجد نادانی گردان جائے۔''

☆☆☆

سکینہ عبدالقیوم کو جواب کچھ یوں ملا۔

غلامان عشق یک طرفہ ہو جانے کو سہل جانتے ہیں غلامان عشق جانتے ہیں دو طرفہ کو منافقت

''پہلا خط یوں رہا کہ تمہاری گھبراہٹیں، شرماہٹیں منہ چھپائے پھرتی ہیں اور تم بنی رہتی ہو قصہ گو۔ کیا بتاؤں کیا حالت رہی۔ پہلے تو خط چھونے کی جگہ متعین نہ ہو۔ کس سیدھ میں پکڑوں۔ کس رخ پہ تھاموں..... کہیں رکھنے کو جگہ نہ ملے۔ فائلیں، جیبیں، انگیٹھیاں، تلپٹ کر دیا ان الفاظ کے اجتماع نے۔

بہر حال..... پہلا عشق کہیں اماں تو نہیں؟ ویسے تمہاری اماں تو میرے قبیلے کی لگیں۔ خدارا اپنے جیسا نہ بننا۔ محبت چاہے کونے میں رکھ چھوڑنا مگر پنڈال..... تغافل کو مت دینا۔ نظر اندازی بڑی بے وقعت کر دینے والی چابک ہے۔ اپنی اماں کا بڑا لاڈلا ہوں میں۔ سنو! سارے لاڈ تمہارے ہوئے۔ میں ہوں تو بے مصرف، مصروفیت نہ ہو۔ آنکھوں کی بے مہر، بے لچک سرد مہری..... ابرو کی ناگواری، گردن کا بے توقیر کر دینے والا جھٹکا نہ ہو۔ پھر چاہے محبت بھی نہ ہو صاحبہ!''

رکشے کے بے تحاشا جھٹکوں کے دوران سکینہ نے مرتضیٰ کے خط پہ لکیریں کھینچیں۔ پھر اسی کے نیچے چند سطریں لکھیں۔

''ثابت ہوا کہ شرط وہ پائیدان ہے، جس پہ چڑھ کے..... رک کے محبت کے منتر پڑھے جاتے ہیں اور تسخیر کیا جاتا ہے۔ منتر سنتے ہوؤں کو وہ پائیدان نظر ہی نہیں آتا۔ اگر تم نے لاشرط محبت کی خصوصیات و اجزائے ترکیبی رٹوا نہ دیئے ہوتے تو آج جواب طلبی نہ ہو رہی ہوتی حلوائی صاحب کی۔''

انارکلی سے گزرتے شریف محل کے چھوٹے کو وہ کاغذ تھماتے، سکینہ غیر متزلزل لگی۔ نادیہ کا واویلا بھی خاموشی نہ توڑ سکا۔ وہ صوفیہ کو کوسے جاتی۔ سکینہ کو ڈرائے۔ سہہ پہر کو سائرہ نے سوتے سے جھنجھوڑا۔

''کیا قیامت آ گئی ہے، مصیبت۔'' وہ جھنجلائی اٹھی۔

''بہن خط کا جواب آ گیا ہے۔ یہ کس دیو کا بچہ ہے بھئی مرتضیٰ امجد۔ دروازہ بجا کے، خط تھما گیا ہے۔ توبہ سارے محلے کے شیطان کرکٹ کھیل رہے تھے باہر۔ یہ مروائے گا قسم سے۔''

سائرہ بڑبڑائی۔ سکینہ نے خط پر نظریں دوڑائیں۔

غلامان عشق تبت کے بھکشوؤں سے سخت جان ہوتے ہیں غلامان عشق ضدی ہوتے ہیں قدیم بابل کے جادوگروں سے ''غور اور گمبھیرتا مطلوب ہے۔ میں نے کہا تھا محبت چاہے نہ کرنا، نفرت اور بے زاری بھی منظور نہیں کہ اماں کا لاڈلا ہوں۔ یہ توجہ، خطوط، بے شرط و بے حد محبت منظور نہیں تو سیدھے بولنا۔ راہ الگ ہی رکھنا۔ یہ محبت کی شرائط نہ تھیں۔ طرز دنیا داری ہے۔ میری محبت، تمہاری ہاں سے مشروط نہیں۔'' وہ ناخن چبانے بیٹھ گئی۔

رات کو ابا آئے تو ساتھ دو کلو سوہن حلوہ بھی تھا۔

''یہ شریف حلوائیوں کا لڑکا دے گیا۔ کہتا تھا منت مانی تھی۔ میں نے کہا بھی چھوٹے کو کہہ سب کو دے، بھول گیا شاید۔'' سائرہ نے معنی خیز سا گھورا۔

''ہائے ابا۔ پتا بھی ہے کتنا مہنگا ہے شریف محل والوں کا سوہن حلوہ۔ یہ لمبی قطاریں ہوتی ہیں خریداروں کی۔'' سائرہ نے سر دھنتے ہوئے کیا کمرے میں آ کے سکینہ سے بولی۔

''سر پھرا ہے ناں۔ لڑکی نے کھری کھری سنائیں اور وہ..... کیا ارادہ ہے سکینہ؟ سچ بتا۔''

''سچ کہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، نہ ہاں ہے نہ پوری ناں۔ کچھ وقت گزرے تو شاید بہتر فیصلہ ہو سکے۔'' گیہوں کا بنا وہ حلوہ اسے دنیا کی خوش ذائقہ ترین شے لگا تھا۔

☆☆☆

وقت مستقل مزاجی سے گزرتا رہا۔ بہار اتر آئی لاہور پر۔ موسم کے تیور نرم پڑ گئے۔

مرتضیٰ امجد بڑا سخت جان نکلا۔ جانے سکینہ عبدالقیوم کے نصیب کن پروازوں پر تھے، جب مرتضیٰ امجد کی نگاہوں نے اسے پایا تھا۔ وہ جامعہ نہ جاتی تو مرنے کو ہو جاتا۔ جی داری سے گلی میں آ کھڑا ہوتا۔ کسی بچے کو برتی تھماتا اور وہ سکینہ کا دروازہ بجاتا۔ وہ دروازہ کھول دیتی۔ مرتضیٰ دیکھ لیتا۔ سانس لے لیتا پھر مڑ جاتا۔ جامعہ جاتی تو رستوں پہ آنکھیں نصب کر دیتا، شریف محل کی اینٹ اینٹ اشتہاروں سے رنگوا دی۔ جامعہ پنجاب والوں کے لیے لالچ سے بھری ترغیبات، وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے

گزرتی۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی ہر زاویے سے خود کو پرکھتی۔ ''عام..... فقط عام'' کا جواب آتا۔

مرتضیٰ سے پوچھ لیتی تو وہ کبھی بتا نہ پاتا کہ سکینہ کیا ہے۔ وہ ایک خط کا جواب لکھتی۔ وہ چار خطوں میں جواب لکھتا۔

وہ رکشے میں سوار ہوئی ہی تھی کہ وہ ساتھ آ کے بیٹھ گیا۔ گھبرائی۔

''میں اتر جاؤں گی قسم سے۔'' وہ ہنسا۔

''کچھ نہیں کہتا..... بات کرنی تھی بس۔'' وہ بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اماں سیدھی سادی ہیں۔ ابا پکے حلوائی۔ تہبند اور شیرہ بس۔ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ سر پر ابا کے خواب، کندھوں پہ اماں کے مان اور پہلو میں بہنوں کی فرمائشیں لیے چلتا ہوں۔ کچھ عرصے سے پریشان کر رکھا ہے اپنے خاندان کو۔ مجھے لگتی گھن ماں بہنوں کو نظر تو آ گئی ہوگی۔ اماں کے وظیفے بڑھ گئے ہیں۔ بہنوں کے شکوک اور میرا لطف بھی۔ اب تو ابا بھی کھانا گھر پر کھانے لگے ہیں۔ مجھے بغور دیکھتے ہیں۔ میری وکالت کے دو درجے رہ گئے ہیں بس۔ اماں کو خبردار کر دینا مناسب لگتا ہے کہ میری پھوپھی جان کے چکر روز لگنے لگے ہیں۔ ادھر خالہ بھی واری صدقے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟''

وہ بس اپنی فائل دیکھے گئی۔

''اگر تم نے کبھی سبھاؤ سے راہ چنی ہوتی تو میں بیٹھا تم سے اجات نامہ نہ لکھوا رہا ہوتا۔ کہو تو بات چلاؤں؟''

''دیکھو، میں بہت ہی عام لڑکی ہوں۔ ڈھنگ کی ہانڈی تک بنانی نہیں آتی۔ یہ جو کلف لگے کپڑے پہنتے ہو تم، مجھے تو کلف پکانی تک نہیں آتی۔ دبتا رنگ ہے میرا۔ بال تھوڑے کھردرے سے۔ ہاتھوں کے ناخن بڑھتے ہی نہیں اور نیل پالش لگاتے اتنا کانپتے ہیں کہ ہاتھ اور بھدے لگنے لگتے ہیں۔ ابا پتا نہیں مانیں نہ مانیں۔ پھر تمہاری اماں کو پسند آ بھی گئی تو چھ بہنوں کے معیار..... تم ملو گے نہیں۔ تحقیر سود سمیت مل جائے گی۔''

مرتضیٰ امجد کو اتنے سچ کی امید نہ تھی۔ پہلے چپ ہوا پھر بے ساختہ ہنسا۔ جامعہ پنجاب کی گیٹ نمبر چار پہ اترتے بھی وہ اسے آنکھ کا پانی جھٹکے دیکھتی رہی۔ وہ ہنس رہا۔ یہ ناراض ہوگئی۔

☆☆☆

جامعہ کے لیے نکلا تھا ان ہی قدموں گھر واپس آ گیا۔ بڑی بہنیں کاموں میں مصروف..... چھوٹی اسکول و کالج۔ اماں محلے میں گئی تھیں۔ وہ فائل رکھ کر ٹہلنے لگا۔ سوما، اماں کو بلا لائی۔ اماں بیٹے کا چہرہ دیکھتے دہل گئیں۔

''سوما، بھائی کے لیے پانی لا۔ واپس آ گیا میرا شیر۔ اللہ خیر کرے۔'' سوما کا پانی مرتضیٰ نے دیکھا تک نہیں۔ آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''اماں گلی نمبر ایک کی سکینہ پسند ہے مجھے۔''

اماں سکینہ کو خاک جانیں مگر وہ اسے گلی نمبر ایک کی لڑکی کبھی نہ کہتا۔

''پسند کیا..... بس وہی چاہیے زندگی بھر کے لیے۔ ابا سے بات کرو۔ اسی ہفتے رشتہ لے کر جاؤ میرا'' اماں کے ہونٹ سفید پڑ گئے۔

''سوما! پانی.....''

عام سی ہے لوگوں کے لیے۔ مگر کردار، شرافت، اطوار کی قسم میں کھاتا ہوں۔

میرے لیے..... وفاداری، صبر اور استقامت ہی کافی ہے۔ بس..... لے جاؤ رشتہ۔''

فائل تھامے باہر نکل گیا اور اماں..... سرد ہو گئی تھیں۔ ''کوئی ان کا لال لے اڑی تھی۔ یہ بغل میں گلی نمبر ایک کی سکینہ.....'' وہ بڑبڑانے لگیں۔

☆☆☆

جب سکینہ نے اس چٹ پہ لکھا دیکھا تھا۔

''اماں سے کہہ دیا ہے۔ اس ہفتے گھر اچھا سا صاف کر لینا۔ چہرہ ایسا ہی بھلا۔ نیل پالش تو بالکل نہ لگانا۔'' وہ ہنس دی یقیناً لکھتے ہوئے وہ بھی مسکرایا تھا۔

پڑھا تب وہ گھر میں داخل ہوا۔

بہنوں کی جماعت باورچی خانے کی کھڑکی سے چپکی کھڑی تھی۔ نیم کے پیڑ تلے رکھی چارپائی پہ وہ کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ اماں کھانا لے گئیں۔ خاموشی سے اس کو کھاتے دیکھتی رہیں۔ برتن ربیعہ کو تھما کے مڑیں۔ پیار سے بیٹے کے بال سہلائے۔ پیشانی چومی۔

''میرا بچہ..... میرا شیر..... میری آنکھوں کا نور۔'' وہ مسکرایا۔

''تیرے ہوتے کبھی دوسرے بیٹے کی خواہش نہ کی، میں نے کہ رب کو شکوہ برا نہ لگ جائے۔ تیری نظر توڑ کے تعویذ گھر کے ہر کونے میں دابے ہیں۔ سیروں مرچیں پھونک ڈالیں۔ کوئی دربار، مزار..... کوئی تہجد نہ چھوڑی کبھی۔ یہ کیا بول گیا ہے تو سویرے مجھے، بہنیں الگ رو ہانسی ہوگئی ہیں میری جان۔'' ماں کے ہاتھ تھامے اور بولا۔

''یہ میرا بچپنا نہیں ہے اماں۔ نہ ہی میری جوانی مذاق ہے۔ ایک بار دیکھ لو، ہل لو۔''

''تیری پھپھی راجیہ کو تیار کیے بیٹھی ہے۔ ادھر بتول کی روداد بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ جگہ نہیں نکلتی بچہ۔ لڑکی دیکھی آج جا کے میں نے۔ شکل تو ہماری بچیوں جیسی ہے، اچھی ہے۔ پر بچہ نہ سر پہ ماں..... نہ ذمہ دار باپ۔ تایا زاد بہنوں کے قصے پورے محلے میں مشہور۔ باپ کے ہوٹل کے کھانوں پہ پلی ہیں لڑکیاں۔ سلیقہ تو سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر سب سے بڑی بات جب بہتر رشتے موجود ہوں تو.....''

''جس دن جانا ہو، سکینہ کے ہاں، بتا دیجیے گا۔''

وہ اماں کی پھرتی پہ حیران ہوا تھا۔ اسی قسم کے مباحثوں کی توقع تھی اسے۔ ارادے چٹان کر رکھے تھے اس نے۔ اماں نے تاسف سے بیٹے کی پشت کو دیکھا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھ گئیں۔ لڑکیاں ماں سے پوچھنے بھاگی آئیں۔ منگولوں سی سختی اتر آئی تھی ان سب کی آنکھوں میں۔

☆☆☆

''تانی! تیرا بھائی بیمار ہے کیا؟ آج مجھے ہمیشہ جیسا نہیں لگا۔'' ام ثانی سب سے چھوٹی بہن تھی مرتضیٰ کی۔ دسویں جماعت کی طالبہ۔ دو تین اس کے بھائی پہ بڑی نثار تھیں۔

''بیمار نہیں ہیں، تھکے ہوئے ہیں۔ جنگ لڑ رہے ہیں گھر میں۔ کسی کو بتانا مت۔ وہ گلی نمبر ایک کی سکینہ عبدالقیوم.....''

ثانی نے سب کہہ سنایا۔ مقابل زبان داب گئی کہ وہ ہمسائی تھی سکینہ کی۔

''تم لوگوں نے خود دیکھے تھے وہ خطوط۔''

''ہاں ناں۔ اماں نے بھائی کا کمرہ چھانا تھا پہلے دن ہی۔ یہی کوئی تین چار خط تھے اس کے۔ ادھر اُدھر کی باتیں لکھی تھیں، بچپن کے قصے، مٹھائیوں کی ترکیبیں۔'' وہ ہاتھ ہلاتی، چاٹ کھاتی جاتی۔ جبکہ سکینہ کی ہمسائی چٹخارے لیے جاتی پھر کیا تھا، رات ہونے تک محلے کے تین گھروں کو خبر ہو چکی تھی۔ اب کنڈلیاں کھلنے لگیں۔

''کبھی ''شریف محل'' والوں کا لڑکا کچھ عرصے سے آنے لگا تھا محلے میں.....''

''ارے سر پہ مائیں نہ ہوں تو.....''

''بھئی مجھے تو یقین نہیں۔ خاصی سمجھ دار لڑکیاں ہیں وہ۔''

اماں چپ تھیں۔ مگر ابا بھڑک اٹھے تھے۔ مرتضیٰ نے سرسری سا گھر والوں کی مزاحمت کا بتایا تھا اسے بس۔

''مجھے بیٹیاں بھی بیاہنی ہیں۔ ہوش کرو بیٹا جی۔ کون لے گا ایک عاشق کی بہنیں۔ پھر آپا تو وٹہ سٹہ پر بھی مانتی ہیں تیرے لیے۔''

''آپ مجھے عاشق نہ بنائیں، شوہر بنا دیں۔ مسئلہ ہی ختم۔ بہنوں میں کیا کمی ہے جو میرے بدلے میں کوئی انہیں مانگے۔ مجھے اپنی بہنوں کو محرومیاں نہیں دینی جہیز میں۔''

بحث برائے بحث ہوتی۔ کوئی جیتتا نہ تھی بس فاصلے چھیدوں پر قبضہ کیے جاتے۔

☆☆☆

ادھر بات خالہ تک پہنچ گئی۔ پہلا تیر ادھر سے ہی چلا۔ سائرہ ان کے گھر آئی تھی، کسی رشتے دار کی بیٹیوں کے رشتے زیر بحث تھے۔

''زمانہ نسوار نہیں لیتا بنو! رشتہ آنے سے پہلے بدنامیاں محلوں میں آجائیں تو لڑکیوں کے نصیب پہ مہریں لگا جاتے ہیں۔'' وہ گھٹی۔ خالہ کا لہجہ..... اور سائرہ کا کہنا۔

''کوئی نہیں خالہ! ماں زندہ ہونی چاہیے بس..... مہریں چاہے جیسی بھی ہوں، مائیں کھول ہی دیتی ہیں۔'' خالہ زہر زہر ہوگئیں۔

''ہونہہ..... یہ ذوبیلہ! کیسے دھواں دار خطوط لکھا کرتی تھی زبیر کو اور اب خالہ کی فلاسفیاں تو دیکھو۔''

واپسی پہ آتے سائرہ کلستی رہی۔ سکینہ کا سکون اس دن ختم ہوگیا۔

پھر کسی دن سکینہ سبزی لینے نکلی تو.....

''سکینہ! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ اللہ بخشے تیری ماں سے بڑا بہناپا تھا میرا۔ ہر بات میں، ہر کام میں ہمارا ایکا ہی ہوتا۔ تم لوگ تو پڑھائیوں میں ایسی مصروف ہوئیں۔ خیر..... میری ثمن کی سہیلی ہے، یہ شریف محل والوں کی چھوٹی لڑکی۔ جانے کیا کیا بول رہی تھی اس دن اسکول میں اپنے بھائی کو لے کر۔ میں نے تو کہہ دیا ثمن کو، خبردار جو قریب گئیں اس لڑکی کے۔ سکینہ، سائرہ پہ تو سارا محلہ فخر کرتا ہے کہ ماں مرگئی، بڑی بہن سترہ سال کی عمر میں ہی بیاہی گئی۔ کیسا گھر سنبھال رکھا ہے دونوں نے اور باپ کو تو ہر طرح سے ٹھنڈ ہے، بکواس کرتے ہیں لوگ.....''

سکینہ دروازے پہ گونگ ہوگئی۔ خالدہ خاتون بول بال یہ جا وہ جا..... مرتضیٰ کا خط آیا تو سکینہ نے کھول کر نہیں دیکھا۔ بین الاقوامی تعلقات کی کتابیں ہل ہل کر پڑھتے بھی وہ بے سکونی کو اپنے اردگرد پاؤں سہارتے دیکھتی رہی۔

سائرہ مثالیں ڈھونڈتی رہی۔

''یہ خالدہ خالہ اتنا وعظ سنا رہی تھیں۔ یہ عظمیٰ کو ہر میلاد میں، ہر تقریب میں اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ بہانے بہانے سے مردان خانوں میں دھکیلتی ہیں اور لڑکوں کی باؤں کو پانی، سلاد کھیر، فرنی اپنی بیٹی کے ہاتھوں پہنچواتی ہے۔ یہ کرتے شرم نہیں آتی تو بیٹی کی سہیلی کی بات پہ بھاگی آئیں احوال پوچھنے۔'' سکینہ لب کاٹتی رہی۔

اگلے دن ثریا آپا آگئیں۔

''سانس گھٹ رہا تھا۔ اتنے دن ہوگئے تھے، سوچا مل آؤں۔''

وہ مصروف رہی۔ شام کو جیلہ، ذوبیلہ آگئیں۔ باتیں، قہقہے، کھانوں میں وقت اچھا گزرا۔ آپا بولیں۔

''جنید آتا ہے تو شریف والوں کا گاجر کا حلوہ منگواتے ہیں۔''

''ارے نہیں بھئی، بڑے مہنگے ہیں یہ لوگ۔'' سکینہ نے لاپروائی سے کہا۔

''چھوڑو بھئی۔ اب کاہے کے مہنگے۔ آج کل تو بڑی دھوم مچی ہے ہر طرف۔'' ذوبیلہ نے آنکھ دبائی۔ جیلہ کی کہنی نے ذوبیلہ کو تنبیہہ کرائی اور سکینہ جامد ہوگئی۔

کیا تھا اس عام سے عمل میں۔ تحقیر اڑاتا مذاق..... پشیمان کردیتے اشارے..... بے توقیر کردیتے جملے..... سکینہ عبدالقیوم تھی وہ..... بس ہوگئی اس کی۔ سب گھروں کو لوٹ آئیں۔

فروری کی وہ شام سائبریا سی عادات لیے اتری۔ ابا سائیکل پہ واپس آئے۔ مونچھیں، بھنویں، داڑھی..... کہر سے ہلکی سفیدی سی ہورہی تھیں۔ سائرہ سوگئی تھی مگر وہ معمول کی طرح ابا کا انتظار کرتی۔ ابا سردی سے شل ہورہے تھے۔ کپکپی نہ رکتی تھی۔ اسے ابا کمزور اور بوڑھے لگے۔

''ابا اب روز مت جایا کریں ہوٹل۔ کسی کے حوالے کردیں۔ کبھی کبھار چکر لگالیا۔''

''کوئی بیٹا ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ دو بن بیاہی بیٹیاں ہیں میری۔ محنت کروں گا تو ہی لوگوں کی

فرمائشیں اور بیٹیوں کے ارمان پورے کروں گا ناں۔ ثریا بانو کا دکھ مجھے ادھ موا کرتا ہے۔ تم لوگوں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالوں گا۔ آگے تم لوگوں کی قسمت۔ بڑی نیک بیٹیاں ہو میری۔ ہوٹل جاؤں تو گھر کی فکر نہیں ہوتی۔ گھر میں ہوں تو تالے لگانے کی فکر نہیں ہوتی۔ تمہاری ماں کا بڑا دین دار ہوں میں ہر معاملے میں۔''

وہ نادم سی ابا کو سنتی رہی۔ اگر ابا کو پتا چلے کہ میں..... گردن میں گلٹی ابھرتی۔ دل بیٹھ جاتا۔ یہ کیا ہوگیا مجھ سے..... بستر پہ لیٹی تو.....

''جب اس سے محبت کا دعوا نہیں، شادی کروانے کا جنون بھی نہیں تو پھر چار خط لکھ کر لوگوں کو کون سا ثبوت تھما دیا میں نے۔'' خود پہ حیران ہوئی۔

وہ ناقابل بیان سی کیفیت..... خط لینے سے لے کر پڑھنے اور پھر لکھنے تک کی۔

یہ گلی کے لوگ جن کے نام تک پورے نہیں آتے مجھے۔ آج یہ لوگ مجھے آتے جاتے دیکھ کے اشارے کرتے ہیں۔ کل اپنی بیٹیوں کو ہمارے گھر نہ آنے دیں گے۔ ذوبیلہ میٹرک فیل لڑکی کیسے کہا کرے گی۔

''ارے کوئی ضرورت نہیں لڑکیوں کو پڑھانے کی۔ پڑھ لکھ کر بھی تو انہوں نے خط ہی لکھنے ہیں۔ کیا کرلیا سکینہ عبدالقیوم کے ایم۔ اے سیاسیات نے۔''

شدید ٹھنڈ میں بھی سکینہ بستر سے ننگے پاؤں نکل آئی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتی، گردن سہلاتی۔

لوگوں کی کتابوں میں میرے نام کے آگے معاشقے لڑانے والی لکھا گیا اور میں ان کاغذ میں لکھے لفظوں کے فریب کو نہ سمجھ سکی۔

یہ سامنے کے نتائج مجھے نظر کیوں نہ آئے۔ میرے خدایا۔

میرے ابا..... پڑھی لکھی، شریف، سمجھ دار بیٹیوں کے ابا..... یقین کرنے والے۔

''ارے ماں تو مرگئی ان کی۔ کیا باپ اندھا ہے؟ اسے اپنی بیٹی کے بدلتے رنگ ڈھنگ نظر نہ آئے۔ لوگ یقیناً میرے ابا کو تو یہی کہتے ہوں گے۔

کھڑکی سے باہر پورا لاہور سیاب تالاب بنا بیٹھا تھا۔ اندر بیٹھی سکینہ اپنے لکھے خط ذہن میں کھنگالتی۔

''کسی ایک میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اس سے محبت یا اس جیسا کچھ ہے۔''

کوئی رومانوی جملہ، اکساتا خیالا..... لبھاتی ادا کچھ بھی نہیں تھا ان میں..... بس باتیں، یادیں، وہ اس کا سامع تھا بس۔

پھر رات نے کھڑکی کے جھروکے سے لگ کر دیکھا کہ سکینہ عبدالقیوم نے کاغذ کے وسط میں لکیر کھینچی۔ جیسے دل کے دو حصے کردیے ہوں۔ وہ لکھنے لگی، فوائد کے خانے میں۔ یہ تعلق توڑ دینے کے فوائد، کچھ یوں تھے فوائد۔

''خالہ! میرے نصیب کو مہر زدہ نہ کہہ سکیں گی۔ ذوبیلہ کو فخر کرنے کو کچھ نہ ملے گا اور بجیلہ کو کہنی مارنے کو۔ میرے ابا کو دیکھ کے کوئی اشارہ نہ کرے گا۔ اچھا یہ ہے عبدالقیوم اس لڑکی کا باپ۔ میں ابا کے سامنے نظر اٹھا کے پھر سے باتیں کیا کروں گی۔ ذوبیلہ، بجیلہ کو دیکھ کے میرے ہونٹ خشک نہ ہوا کریں گے۔ سبزی لینے جاؤں گی تو کوئی روک کے تفتیش نہ کرسکے گا۔ محلے والوں کی چٹخارے لینے کی جرأت نہ ہوگی۔ جو کوئی بھی نصیب میں ہوگا اسے سینہ پھلا کے کہوں گی کہ پہلی محبت سے آخری شراکت داری صرف تم سے ہے۔ اپنی اولاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے انہیں بے راہ روی سے روک سکوں گی۔ انہیں کوئی نہ کہہ سکے گا کہ ''جا تیری تو اپنی ماں.....'' میں فخر سے لوگوں کو کہہ سکوں گی کہ بیٹیوں کو تعلیم دلاؤ کہ تعلیم ہی بدلاؤ کی طرف پہلا قدم ہے۔''

فوائد کے بعد خسارے کا خانہ دیکھا تو صرف ایک خسارہ نکلا۔ فیصلہ ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ ضمیر کی اس عدالت میں ہر شے کا فیصلہ دل کے خلاف تھا۔ دل پہلے بودے دلائل دیتا رہا پھر چپ ہوگیا۔ عدالت کے فیصلے میں با آواز بلند کہا گیا۔

☆☆☆

غلامان عشق گھونپتے ہیں خنجر اپنے ہی پہلو میں
غلامان عشق دیتے ہیں فوقیت عزت کو، محبت پہ

اخیر فروری کا چمکتا سا دن تھا وہ۔ سکینہ عبدالقیوم نے مرتضیٰ امجد کے خطوط گنے۔ تیرہ خطوط کو لفافے میں ڈالا۔ سائرہ کو بے خبر رکھا۔ پھر نکلی وہ اپنے دوسرے عشق کے رستے پہ۔ شریف محل سامنے کھڑا تھا۔ کاؤنٹر پار امجد شریف صاحب تھے۔

''مرتضیٰ امجد ہیں تو انہیں بلا دیں۔''

مرتضیٰ کے باپ نے تحیر سے اس لڑکی کو دیکھا۔ بالائی منزل پہ مصروف مرتضیٰ ہولے سے ذرا ہی کم رفتار میں نیچے آیا۔ دلکش سا مسکرایا۔ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ نہ مسکرائی، بات شروع کی۔ امجد شریف اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئے۔

''سوہن حلوہ میٹھا ہے آپ کا۔'' چھوٹا مرتضیٰ کے اشارے پر سوہن حلوے کی ٹرے اٹھا لایا تو وہ شروع ہوئی۔ ''بہت میٹھا..... اتنا کہ اس پر بھنبھناہٹیں ہونے لگی ہیں۔ ماں نہیں ہے میری۔ ابا مان کرتے ہیں ہم پر۔ دنیا جلد باز ہے..... رائی دیکھتی، پہاڑ گھڑ لیتی ہے۔ میں چونکہ لڑکی ہوں تو مجھے محبت ہو نہیں سکتی۔ ہونی نہیں چاہیے ناں..... بس شادی ہونی چاہیے۔ خط آنے کے بجائے رشتہ آنا چاہیے، مجھے پہلے خط آ گیا۔ اس الٹی ترتیب نے ہر اچھائی کو گناہ میں بدل دیا۔ بہتان باندھتی سرگوشیاں شاید..... میں اہل نہیں ہوں انہیں سننے کی۔ تو..... میں نے رات دو خانے بنائے، فوائد اور خسارے کی فہرست بنائی۔ حیرانی مجھے کھا گئی کہ فوائد بے انت نکلے اور نقصان صرف ایک۔''

''اکلوتا نقصان کیا ہے۔'' مرتضیٰ امجد نے انہونیوں کی سرگوشی پالی۔

''اس لین دین کو چھوڑ دینے کا نقصان یہ کہ بس تم نہ ہو گے، کہیں بھی نہ ہو گے۔''

''بس.....'' وہ بے بس ہو گیا۔ امجد شریف کے ہونٹ چپک گئے۔ چپ.....

''چلو میں دو خانے بناتا ہوں۔'' مخالفت پر اترتا اپنا بیٹا انہیں دیوانہ لگا۔ ''فائدہ کوئی نہ..... کائنات کی کوکھ کا ہر خسارہ میرا۔''

ابا کے حساب کتاب کے رجسٹر پر لکیریں لگی۔ وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے حساب میں مرتضیٰ کب تھا۔ فقط وہ خود ہی تھی۔

''چلو، ترتیب بدل دیتا ہوں۔ رشتہ بھیج دیتا ہوں۔ خط بعد میں۔'' وہ اپنے خطوط والا لفافہ ہاتھ میں لیتا ہوا بولا، سکینہ چیخ گئی۔

''پھر ہر شے بدل دو۔ میرا ضمیر، میرا باپ..... اپنی بہن کی سہیلی، معاشرے کی سوچ۔ مرتضیٰ! وقت گزرے گا تو ہر فہرست نئی بن جائے گی۔ نئے لوگ، نئی فہرست۔ تمہیں نہ چھوڑا تو میرا نامۂ اعمال بدل جائے گا۔ میری غلطی ہے، گناہ نہیں بنانا اسے میں نے۔ مجھ سے میرا باپ نہیں دیکھا جاتا۔ ان کی سفید داڑھی..... جھکے کندھے۔ مرتضیٰ امجد! میرا باپ میرا پہلا عشق ہے۔ کہا تھا ناں کہ میں اپنی ماں جیسی ہوں۔ مجھے کل رات یقین آ گیا کہ جن بیٹیوں کو باپ کے چہرے کی لکیریں گننے اور ان لکیروں سے محبت کرنے کی عادت پڑ جائے وہ محبت کے لیے انتہائی ناموزوں ہوتی ہیں۔''

وہ رکی پھر دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی۔

''خدارا یہ مقناطیس ہٹا دو مجھ پر سے۔ مت کھینچو ان الفاظ کے بل پہ مجھے۔''

وہ بیانیہ پڑھتی غیر ملکی سفیر دکھتی۔ سپاٹ، سرد، مضبوط۔

مرتضیٰ امجد اس سورج کے نکلنے کو ملامت کرتا یا دنیا کے رواں رہنے پر بین۔

بہر حال فروری کا وہ دن اس کی محبت نگل گیا۔ وہ تیرہ خطوط ہاتھ میں تھامے سکینہ عبدالقیوم کی اٹھی، بے لچک گردن کو دیکھتا رہا۔ عجب سناٹا تھا جب وہ اٹھ کے گئی۔ سوہن حلوے کی ٹرے گرنا، چھوٹے کا بھاگنا،

ابا کا چلانا، وہ وحشی سناٹا نگلتا گیا ہر زندہ شے کو۔
اب جو دل آواز سے چلتا تھا، سناٹے کی زد پہ تھا۔

☆☆☆

رستہ تھا کہ فرعون مصر کی بنائی بھول بھلیاں۔ وہ بھٹک بھٹک جاتی۔ گلی نمبر دو رستہ مڑ جاتی اور گلی نمبر چار میں جا نکلتی۔ وہاں سے چلتی تو واپس انارکلی۔
''اے ضد پہ اتر آنے والے راستو! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ اس جرأت کو میرے لیے سوختہ جاں بنانے پر کیوں تل گئے ہو۔ مجھے واپس جانے دو خدارا..... واپس جانے دو۔'' بڑبڑائی جاتی۔
گھر آ کے منہ چھپانے کو لحاف ہی میسر تھا۔ سائرہ کو بتایا تو وہ بلا مبالغہ دو گھنٹے بولی سکینہ کے فیصلے کے خلاف۔ وہ لوگوں کی مثالیں ڈھونڈ لانے میں کمال رکھتی تھی۔ خاندان، برادری، محلہ، سہیلیاں..... وہ ہر طرف سے مثال لائی۔ بالآخر وہ بولی۔
''سائرہ ..... ذوبیلہ اس کی ماں زندہ تھی۔ ماؤں کی اوڑھنیوں میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ زمانے کے تیر اوڑھنیاں چھید کر اولاد کو نہیں پا سکتے۔ ماؤں کا بس چلے تو کراماً کاتبین کا حساب بدل دیں۔ منکر نکیر کے ہر سوال کا جواب اولاد کو رٹوا دیں۔ میری ماں نہ تھی۔ میرے نصیب میں یہ تفریح نہ تھی بس۔''
پھر شرمساری بولی۔
''ذوبیلہ کے خط..... مہک کی ملاقاتیں..... سجیلہ کی محبت کی شادی..... خدارا بند کرو یہ مثالیں لانا۔ اللہ کو بری لگتی ہے عیب جوئی والی گفتگو۔ ہم تو اچھی لڑکیاں تھیں..... پھر مجھے کیا ہو گیا؟ اللہ نے کسی ایسے ہی چٹخارے کے بدلے میں پکڑ کی ہے میری۔ بیٹھے بٹھائے، ڈیڑھ ماہ کے اندر محلے میں، خاندان میں مشکوک ہو گئی ہوں میں۔ نظریں اٹھاتے اٹھاتے بھی سالوں لگ جائیں گے حالانکہ تم گواہ ہو کہ کیسے خط لکھے تھے میں نے۔ پکڑ ہوئی ہے میری۔ ایسی گفتگو ہماری زبانیں پھر کبھی نہ دہرائیں۔ توبہ لازم ہو گئی ہے۔''
آنکھوں کی آبشاریں یکا یک پرجوش ہو گئیں۔
سکینہ عبدالقیوم ڈھائی گھنٹے روئی تھی اور بس مرتضیٰ امجد کا عکس دھل دھلا گیا۔
مرتضیٰ چھوٹ گیا تھا۔ لاہور یونہی ہنستا تھا۔ چلتا رہتا تھا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ چلنے لگی۔ ایک دن.....
کوئی تین ماہ بعد داتا دربار کی پچھلی گلی میں آتے، اسے نظر آیا تھا وہ..... مفلوک الحال..... خواب آلودہ شکستہ شخص۔
پھر مرتضیٰ کو وہ نظر آئی تھی سپاٹ و بے رونق عورت۔ وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھنے لگا۔
''کہاں جاؤں۔'' والی افراتفری یکا یک پیچھے مڑا اور بھاگتے قدموں سے چلنے لگا۔ جدھر سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔
دوسری اور آخری بار سکینہ کو ویگن میں ملا۔ ناصر باغ سے طلبہ کا ہجوم سوار ہوا تو وہ بھی ہمراہ تھا۔ چلتی ویگن پہ بھاگ کے سوار ہوا۔ پہلی نظر ہی سکینہ پر پڑی۔ چلتی سے ہی اتر گیا۔
کنڈیکٹر نے موٹی موٹی گالیوں سے نوازا۔ کئی ایک نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ سکینہ ساکت رہ گئی۔ گویا دکھ ختم شد..... نفرت درآمد است..... پھر اس نے کبھی مرتضیٰ امجد شریف کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

لوگوں کا ''انصاف'' نہ ماضی کی پاک بازی دیکھتا ہے، نہ مستقبل کی توبہ۔
سکینہ عبدالقیوم نے اچھا اور نیک بننے کو ایک فیصلہ کیا..... قائم رہی۔ لوگوں نے اور کچھ ڈھونڈنے کی بھرپور کوششیں کر ڈالیں اور مایوس ٹھہرے۔
ذوبیلہ بڑے فخر سے کہتی۔
''خیر..... اس دنیا میں اتنا پاک دامن تو کوئی بھی نہیں۔'' سکینہ کا دل کٹا جاتا۔
''اور کتنے پاک دامن ہوں تو دنیا مانے؟'' سائرہ کہتی۔
''اب بیٹھی رہو کنواری ساری عمر۔ خالہ کو ہماری عمریں نظر نہیں آتیں، بس اپنے گھٹنوں کا درد پیارا

ہے۔ ابا کو ویسے بڑی شرم آتی ہے کسی کو کہتے۔ عام سی شکل، اوسط درجے کا گھرانہ..... وہ مرتضیٰ امجد ہی تھا جو کوہ قاف سے راستہ بھٹک کے گلی نمبر ایک کی سکینہ پر مرمٹا تھا۔''

☆☆☆

سکینہ کا ماسٹرز مکمل ہوا۔ لیکچرار کا امتحان پاس کرلیا۔ کوئن میری کالج میں پڑھانے لگی۔ عمر ہوگئی پچیس..... پھر چھبیس۔ ان ہی دنوں قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے ایم۔فل سیاسیات کی ڈگری کا اعلان کیا۔ لاہور کی رواں زندگی سے نالاں سکینہ کو نئی روشنی مل گئی۔

ایم۔فل نے مفتوح کرلیے سکینہ کے حواس۔ ارادے اور خوف بھی۔ ڈگری لیتے لیتے ڈھائی سال مزید بیت گئے اور وہ ہوگئی ساڑھے اٹھائیس کی۔ اب ابا بھی فکرمند نظر آنے لگے تھے۔

تایا اور خالہ آئے۔ سائرہ کو انگوٹھی پہنا گئے۔ پھر شادی پر زور شروع ہوا تو ابا مزید ہونق ہوگئے۔ سر پر نکلے چار سفید بالوں نے سکینہ کو ہولائے رکھا اور پھر.....

''انگریزی زبان ہے سر! ذہانت ماپنے کا آلہ نہیں۔ علم کو انگریزی میں رٹنے سے اس کی اثر پذیری متاثر ہوتی ہے تو فقط اتنی کہ لاہور کی پچھتر فیصد آبادی جو آپ کی بات سمجھنے کی اہل ہے۔ قطعی بے بہرہ ہوجائے گی اپنے وراثتی علم سے۔ یہ پچھتر فیصد آبادی اس زبان کو سیکھنے میں اتنی محو ہوجائے گی کہ علم کی اصل روح مردہ ہوجائے گی۔ اس لیے درخواست ہے کہ اپنے اساتذہ کو اس احساس کمتری سے نکالیے کہ انگریزی کو سیکھنا ان کے طلبا کے لیے کامیابی کی کنجی ہے۔'' پنجاب یونیورسٹی میں ہونے والے مباحثے میں وہ چیخ چیخ کے بولتی۔ تیسری قطار میں بے زاری سے بیٹھے شخص نے دلچسپی سے اس سادہ سی لڑکی کو دیکھا۔

''ایچی سن میں کیمسٹری پڑھاتا ہوں۔ شاید ہی کوئی لفظ اردو کا کبھی بولا ہو۔ اردو سننا تو اب پشتو خبریں سننے جیسا لگتا ہے۔ آج مزا آیا ہے۔ اچھا لگتا ہے اپنی زبان کو فخر سے آگے لانا۔ دراصل مجھے اچھا لگے گا آپ سے رابطہ رکھنا۔ آپ سے دوستی نیک مطلوب چاہتا ہوں۔''

سکینہ بے ساختہ ہنسی۔ خاور شیر زمان اس ہنسی کا دیوانہ ہوا۔

''آپ کی اردو پر تو محنت کرنی ہوگی۔ دوست سے زیادہ استاد بننا ہوگا۔'' وہ دامن بچا گئی۔

پھر کتنے ہی دنوں بعد خاور شیر زمان کی ڈاکٹر بھابھی کے رشتہ لانے پر وہ دنگ رہ گئی۔

''اچھا..... وہ خاور شیر زمان..... یاد آ گیا۔''

اور پھر وہ سکینہ خاور شیر زمان بن گئی۔

☆☆☆

غلامان عشق آزمودہ نسلوں کے تسلسل وقار میں غلامان عشق گھپاؤں میں رستہ بتاتے ابا بیل ہیں

خاور شیر زمان معاشرے کے اونچے ترین طبقے کا پروردہ تھا۔ جدیدیت کا دلدادہ، روشن خیال اور بلند عزم۔ سکینہ کو اکثر کہتا۔

''جانے وہ کیا شے تھی جس نے مجھے تم سے شادی پر مجبور کیا۔'' وہ مزید نثار ہوجاتی۔

لاہور کا مہنگا ترین رہائشی علاقہ، مہنگا ترین گھر، بہترین لباس۔ سائرہ اور ثریا آپا قسمت کی یاوری پر حیران ہوتیں۔ خالہ نے سائرہ اور جنید کو شادی کے بعد ابا کے گھر ہی رہنے دیا۔ پھر گھروں کے درمیان کی دیوار گرادی تو سب کو آسانی ہوگئی۔

فقط دو ماہ میں سکینہ کو خاور سے محبت ہوگئی تھی۔ لامشروط نہ سہی۔ بے حد محبت ضرور۔ خاور کے لباس کی خوشبو، ابرو اٹھانا..... بالوں کو انگلیوں سے جمانا، وہ مرمٹی تھی۔ وہ جو عام سی لڑکی تھی، لاہور کی شاید سب سے دلکش لڑکی دکھتی۔

خاور کی اعلا تعلیم، روشن ترین مستقبل اور خاندانی امارت سکینہ کو تفکر میں مبتلا کرتی۔ پھر پہلو میں سوئے شخص کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد وہ مطمئن بھی ہو ہی جاتی۔

ابا شاد تھے..... پرسکون۔ شادی کے چوتھے ماہ بیمار پڑ گئے اور سکینہ کی قسمت نے بے سکون کر دینے والی کروٹ لے لی۔ ابا کو جگر کا کینسر تھا، آخری مرحلے میں۔

رات دن نے شکلیں بدل لیں۔ گھپ اندھیروں سی زندگی..... سرد قبروں سا انتظار۔ وہ گھر چھوڑ، کالج چھوڑ ابا کی پائنتی سے لگ گئی۔ ابا خون اگلنے لگے اور سکینہ کا مرتا ''پہلا عشق'' دنیا کی ہر روشنی پہ سیاہ رنگ پھیرنے لگا۔

''تو پاگل ہو جائے گی سکینہ! گھر کا چکر لگا لے۔ خاور بھائی کیا سوچتے ہوں گے۔''

خاور پہلے پہل خاموش رہا۔ پھر غصیل ہونے لگا اور ابا کی موت تک شانت ہو گیا۔

''کوئی نہیں، مجھے مشکل تو ہے مگر تم دیکھ لو۔ جیسا مناسب سمجھو۔'' وہ کہتا۔

''سکینہ! اللہ تجھ سے راضی ہو گیا ہے پتری۔'' وہ آلودگی صاف کرتی تو ابا رونے لگتے۔

''میں کیوں کہوں کہ رب مجھے بیٹا نواز دیتا۔ اللہ کا شکر واجب ہو گیا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے۔

''رونا مت کہ شیدائی ہو جاؤ۔ بہنوں کو سنبھال لینا۔ اپنا گھر دیکھنا کہ خاصا نظر انداز ہو گیا ہے۔'' نصیحتیں کرنے لگتے اور پھر ابا چلے گئے۔ سکینہ کا دل اجڑ گیا اور نصیب بھی.....

☆☆☆

گلبرگ فیز ٹو کا وہ بنگلہ جیسے اپنے مدار سے سکینہ کو خارج کیے بیٹھا تھا۔ اسے ہفتہ بھر خود کو سمجھاتے لگا۔ نویں دن یکا یک اسے یہ وہم آن لگا کہ خاور کی مصروفیات اسے سکینہ سے غافل کیے دے رہی ہیں۔ وہ ہوشیار ہوئی۔ نرگیسیتا کو ابا کی تصویروں والے البم میں بند کیا۔ خود پہ توجہ کی۔ گھر پہ بھی۔ خاور متوجہ ہوا۔ نیا نیا موبائل فون آیا تھا۔ خاور کے پاس پہلے بھی تھا مگر اب تو صرف موبائل فون ہی تھا۔

''مصروفیات کچھ طویل ہو گئی ہیں حضور کی۔'' سکینہ کی ازلی دلکش مسکراہٹ۔

''تمہارا سوگ بھی تو جوان ہے۔'' ترخ سے جواب آیا۔

''فطری بات ہے۔'' اسے صاف نظر آنے لگی تھیں خالی جگہیں۔

''خالی جگہوں کا بھر جانا فطری بات ہے۔'' وہ دیر تک ایک ہی زاویے میں بیٹھی رہی۔

پھر غیر حاضری بھی شروع ہو گئی۔

''رات دوست کی طرف رکوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ سرد سا دیکھتا بس۔

اسے عادت نہ تھی تنہائی کی، نظر انداز ہونے کی۔

ایک رات بارش بہت تھی۔ ابا کو گئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ وہ بلا ناغہ روتی۔ خاور کے ڈر سے چھپ چھپ کے مگر اس رات بارش کی تڑتڑاہٹ اور بجلی کا نہ ہونا، دونوں نے اس کے حواس پہ خوف کو چڑھا دیا۔ وہ لینڈ لائن سے بار بار خاور کا نمبر ملاتی۔ ملاتی..... نہ ملتا وہ پھر سے ملاتی..... روتی جاتی اور نمبر گھماتی جاتی۔

پھر فون اٹھایا گیا اور طوفانِ نوح مرکزی دروازے سے اندر گھس آیا۔ سب بہہ گیا۔ کیا تھا وہ سب جیسے.....

''ہیلو..... خاور.....'' وہ سسکی۔

''جان چھوڑ دو خاور کی۔ منحوس عورت۔ میرا بھی کچھ لگتا ہے یہ۔ خبردار جو مزید ایک بھی ٹھلٹی سنائی دی مجھے..... خبردار۔'' کوئی عورت تھی۔ مصری دور کے فرعونی جلاد سے لہجے والی۔ سکینہ کو کچھ سجھائی ہی نہ دیا۔ وہ دن کے پیدا ہونے کی دعا کرنے لگی۔ پھر اپنے خواب سے اٹھ جانے کی۔

''آپا ہوں گی' کوئی پھوپھو..... کوئی بھی.....''

رات خدشے پیدا کیے جاتی۔ امید ہولے ہولے دور ہوتی جاتی، پھر صبح ہو گئی..... کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ سوئی ہو گی؟

صبح کی سہ پہر ہو گئی اور خاور شیر زمان گھر کو لوٹ آیا۔ تر و تازہ..... لاتعلق۔ وہ کسی ماں کی طرح اسے چائے پیتے دیکھتی رہی کپ خالی ہوا تو وہ کہنے لگی۔

''کل رات..... کل رات طوفان تھا بہت۔ تمہارا نمبر ملایا تھا میں نے..... ایا کو گئے دو ماہ ہوئے ہیں اور ان دو ماہ میں، میں نے تمہیں محسوس تک نہیں کیا۔ تو کل وہ عورت.....''

یہ عورت بھی ناں..... کسی دوسری، تیسری عورت کا ذکر کیسا جاں کش لگتا ہے ناں عورت کو۔ اکیسویں صدی کے عجائبات دیکھو اور اس صدی کی عورت کے خوف دیکھو..... وہی بوسیدہ لرزے اور اوہام۔

خاور جیسے تیار تھا، ابرو اٹھا کے بولا۔

''سکینہ جانتی ہو تم سے شادی کیوں کی میں نے؟ تم سکینت ہو۔ سکون ہو..... تمہاری ٹھنڈک تھی جس نے میری زندگی کا الاؤ لاجواب کر دیا تھا۔'' وہ رکا۔ پھر نقطے پر آیا۔

''میں ڈراما نہیں چاہتا..... رونا دھونا..... واویلا۔ مجھے خلجان ہوتا ہے کوسنوں اور دہائیوں سے۔ فرزین بیوی ہے میری۔ پہلی بیوی..... ماڈل ہے۔ شادی کا اعلان اس کا کیریئر اور میرا سماجی رتبہ تباہ کر دیتا تو ہم نے ابھی تک خفیہ رکھا ہے۔ بیٹا ہے میرا۔ عمار شیر زمان۔ تم مجھے موزوں لگی تھیں اپنے تعلیمی پس منظر اور منطقی سوچ کو لے کر۔ فرزین کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور بس..... تم سوچ لو۔ میری زندگی بس ایسی ہی ہے۔ تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے منظور ہوگا۔''

یہ بہانیہ سنتے سکینہ کو یوں لگا کہ وہ گلی نمبر ایک پرانی انارکلی کے ایک مٹھائی والے کے گھر میں کھڑی ہے مگر کاؤنٹر کے پار اور خاور تیرہ خطوط اس کے منہ پر مارنے آیا ہے۔ وہ کیا کرتی؟ شور..... واویلا..... بین..... کوسنے..... بددعائیں..... وہ کیا کرتی؟

☆☆☆

بن ماں باپ کی سکینہ عبدالقیوم کچھ نہ کر سکی تو روئی۔ اتنا روئی کہ عرش کی گھاس بھی نم ہوگئی۔ اتنا روئی کہ بینائی کو ختم ہو جانے کے واہمے لگ گئے۔ اتنا روئی کہ پہلو پتھر ہو گئے۔ دیکھا تو رات دن میں ڈھلنے کو تھی۔ وہ گاڑی نکال کر اس گھر سے نکل آئی۔ گڑھی شاہو کا میاں میر صاحب قبرستان اسے ویران ہرگز نہ لگا۔ یقیناً بانیے پوری کائنات سکینہ کی ویرانی کے آگے خس تھی۔ وہ بے بصارت ہوئی اپنے ماں، باپ کے ٹھکانوں کو ڈھونڈتی۔ اس رات..... اس نگل جانے والے اندھیرے میں سکینہ نے یہ بھی سیکھ لیا کہ زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب شہر خموشاں ماں کی کوکھ سے بھی وفادار معلوم ہوتا ہے۔ جو چوس لیتا ہے اپنی خامشی میں..... ہر کرلاہٹ۔

''ابا! اب کیا کروں؟ میں تو اماں بن گئی ہوں۔ ایم۔فل سیاسیات۔ اسسٹنٹ پروفیسر۔ اماں..... اب کیا کروں؟'' وہ روتی ہرگز نہ تھی۔ ابا، اماں کے درمیان بیٹھے جب وہ قبروں کی مٹی سہلاتی تو اماں یقیناً پہلو بدلتی ہوں گی۔

''اماں! میں کیا کروں گی؟'' اماں سے سوال مختلف تھا۔

''تم کیسے نکالتی تھیں وہ سوئیاں خود میں سے، نیلا کر دیتی سوئیاں۔ ماضی خواب، حال بھیانک اور مستقبل لاغر کر دیتی سوئیاں۔''

غیر عورت کے نام پر دم کی، تعویذ شدہ سوئیاں..... مجھے خاور سے کبھی خوشبو نہ آسکے گی۔ میری ہر آرائش کو زنگ لگ جائے گا۔ ہر ملکیت پہ غلامی کا ٹھپہ..... پھر میں کیا کروں گی اماں! کاش اماں! مجھے پہلے پتا ہوتا..... دوسری عورت کا غم ایسا ہے تو میں تمہارے مرنے پہ اپنا بچپن رہن نہ رکھتی۔ میں کھلکھلاہٹوں کو اپنے صحن میں لگے سکھ چین سے باندھ لیتی۔'' اماں، ابا بھی اس کی سنتے سنتے اونگھ گئے ہوں گے، جب وہ لوٹی۔ جاتے ہوئے جو ناسور پلو سے باندھے گڑھی شاہو گئی تھی، ابا کے قدموں کی مٹی میں داب آئی۔ آتے ہوئے پلو میں باغی جذبے بھر لائی۔

انارکلی گلی نمبر ایک کا مٹھائی گھر اسے جشن مناتا محسوس ہوا۔ ایسا روشن اور پررونق۔ وہ جائے گی اور مرتضیٰ امجد سے تیرہ خطوط واپس مانگ لے گی اور بس..... وہ مٹھائی گھر سے کچھ فرلانگ پر کھڑی سوچتی۔ مرتضیٰ کی محبت تو بے شرط ہے، پھر کیسا

خوف.....وہ گاڑی سے اترنے لگی۔

''خطوط واپس کرنا آسان تھا، مستقبل تاریک نہ تھا تب۔ چھوڑ دیا ایک لڑکے کو کہ دنیا لڑکوں سے بھری تھی تب..... آسان تھا وہ سب.....تو کیا اتنی آسانی سے بن گئیں تم اچھی بیٹی۔ معاشرے کی نیک بازعورت۔ شوہر راہ رو نکلا تو نکل پڑیں پرانے رستوں پہ سکون ڈھونڈنے۔'' ابا جیسے کھڑکی پہ ہاتھ مار کے کہہ گئے ہوں، وہ ساکت رہ گئی۔

''میں ہوتی تو بھلا کیا کہتی میری بچی۔'' اماں نے دوسری طرف والی کھڑکی بجائی۔

''جسے خدا کی پسندیدگی مطلوب ہو، وہ ترک کردہ گناہ طلب نہیں کرتے پھر۔''

''اماں! میں کب تک اپنی بند سانس سے جیوں گی۔'' وہ کرلائی پھر ڈائری نکالی۔ فائدے اور خسارے.....

''محبت تو اب نایاب ہوئی۔ طلاق کے بعد طعنوں سمیت برتا ہوا مرد ہی ملے گا۔ سائرہ کا گھر..... جو پہلے ہمارا گھر تھا.....اگر تنگ پڑ گیا تو؟ کسی کا خط آنا لوگوں کے لاتعداد سوال نامے لایا تھا تو طلاق نامہ کیسا ہوتا۔''

ایسے ہی بے شمار دلائل اور وہ جیت ہوگئی۔ صبح صادق وہ سائرہ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''میں ابا، اماں سے ملنے آئی تھی۔'' سکینہ نظریں دوسرے پلنگ پہ گاڑ کے بولی۔

''خاور بھائی تمہیں پاگل سمجھیں گے، نکل آؤ ابا کے عشق سے باہر۔'' سائرہ تڑخی۔

''خاور تو خود پہلی بیوی کے عشق میں ہے۔'' وہ رونے جیسا ہنسی۔ سائرہ پہلی مرتبہ گنگ ہوئی۔

''آپا کو مت بتانا۔ بلاوجہ کا رونا دھونا مچائیں گی اور اب کے میرا دل پھٹ جائے گا اپنی بدبختی کے نالے سن کر۔''

آٹھ بجے سائرہ کے گھر سے نکلی تو تاکید کرتی آئی اور یوں سکینہ عبدالقیوم چھ ماہ میں ہی ''بیوہ'' اور ''طلاق یافتہ'' ہوگئی۔ لاہور پھر بھی چلتا رہا۔ ہنستا رہا اور بستا بھی۔

☆☆☆

وہ گھر لوٹی تو خاور شیر زمان نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی تاریخی فاتح، مفتوح ریاست کے باغ گزار شہنشاہ کو دیکھتا ہوگا۔ محبت سے پیٹ بھرا تھا اس کا..... خالی پیالہ چاٹنا، تازیانے سے مہلک لگا اسے۔

پھر وہ اعتماد سے سمجھوتے کی سیڑھیاں چڑھتی آگے بڑھ گئی۔ ایسے میں اسے لگا کسی نے تیز دھار آلے سے دل چیرا، کاٹا اور پھر کھول دیا۔ اک سہ مونہہ کا ناعین وسط میں پیوست کیا اور ٹانکوں سے چھپا دیا۔

☆☆☆

خاور شیر زمان، سکینہ عبدالقیوم سے پہلے پہل لا تعلق ہوا۔

کمرہ الگ ہوگیا..... کھانے کی میز خاموش، سکینہ کا لباس پرشکن ہوا اور بال سلجھاؤ مانگتے۔ منگل و بدھ وہ گھر آتا۔ ملازموں کو شکل دکھاتا۔ کھاتا، سوتا اور واپس لوٹ جاتا۔ معلوم ہوا فرزین ماڈل نہ تھی کمرشل تھیٹر اداکارہ تھی۔ سکینہ مزید ہلکی ہوگئی۔ خاک سی.....دھول سی۔

لاتعلقی نے بے زاری کو جنم دے ڈالا۔

''وہ فون کرتی تو.....'' تمہیں بے وقت فون کرنے میں کیا لطف آتا ہے؟

سچ سنو رجاتی تو.....'' خدارا یہ نوٹنکی بند کرو۔ اس قماش کی عورت کے ساتھ ہوتا ہوں چار دن..... رنگ چبھتے ہیں مجھے۔''

''کھانا بنا لیتی تو.....'' میرے دل کا کوئی سوراخ معدے سے نہیں گزرتا۔ خود کو ہلکان مت کرو۔ پنجاب یونیورسٹی میں کوشش کرو سیٹ ہونے کی۔'' وہ خود غرض تھا۔ بدزبان اور بدلحاظ بھی۔

بے زار شخص نے اعتراضات کو انی بنا لیا اور سکینہ کا حلق تختہ عشق.....

''یہ جھاڑ جھنکار کبھی سلجھا ہی لیا کرو۔ نہیں تو جان چھڑاؤ ان سے۔'' خوب صورت بال کلے پیٹنے لگے اور سکینہ نے ان سے جان چھڑالی۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات کی اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئی۔

''خلیق جاوید سے دور رہنے کو کہا تھا کل جم خانہ

میں بڑا ہنس رہا تھا وہ تمہارا نام لے لے کر۔'' سکینہ کی ساری ہنسی غائب ہوگئی۔

''تمہیں معاشرتی وسماجی آداب کی کچھ کلاسیں لینی ہی چاہیے۔ نہ سلیقہ نہ تمیز..... حسن وحسن کلام کے تو کیا ہی کہنے۔'' سکینہ رونا تک بھولتی گئی..... مشین بنتی گئی۔ عمل کرتی غلام..... مناجات کرتی پجاری۔ اسے طلب کرتی دعائیں مانگتی۔ سوچتی۔

''خاور تو شرائط کا خدا بنتا جارہا ہے۔ شرطیں تو ہیں محبت پھر بھی نہیں۔'' سکینہ کو یہ بات خالی کرنے لگی۔

اعتراضات کا بھی رد ہو جانا حتیٰ کہ تعمیل پانا بھی شکوک اگانے لگا.....

''یہ کس کے ایما پر آج کل مجھے نظر انداز کرنے لگیں.....''

''نوجوان نظر آنے کے لیے محنت ..... واہ خوب'' تو کیا واقعی پچھلے چار دن گھر میں کوئی نہیں آیا۔

خاور کے اعتراض وبے زاری، شکوک اور بے عزتی اس میں حیران کن بے یقینی، دکھ، خود پرستی اور پھر بے حسی ابھارتے۔

وہ سینہ مسلتی.....

''کوئی یہ کانٹا نکال دے.....'' مرتضیٰ کو 'ناں' کہا تھا..... اللہ نے ناشکری جانا کیا؟'' وہ الجھتی۔

جانے کب اللہ نے اس بنجر زمین پر انار کا بیج بویا تھا۔ اسے پتا تب چلا جب وہ نعمت واپس لے لی گئی۔ ہسپتال کے باسی گوشت سی بو والے کمرے میں ڈھائی سال بعد روئی تھی۔

☆☆☆

غلامان عشق مبتلا رہتے ہیں زندگی کی دھولوں میں بارہا
غلامان عشق وہ زندہ، ہیں کہ موت کو چاہ نہیں انہیں مارنے کی

سائرہ کہتی.....

''اسے چھوڑ دے سکینہ..... مرتضیٰ کی جگہ کسی اور کو دی ہے تو کیسے فٹ بیٹھے وہ.....''

''یہی تو بات ہے سائرہ..... وہ مرتضیٰ نہیں کہ چھوڑنا لطیفے پر ہنس دینا جتنا آسان ہو..... ہنستے ہنستے چھوڑ دو۔ وہ خاور شیر زمان ہے جس سے محبت کی دعوے دار رہی ہوں میں۔ چار سو لوگوں میں بیاہ کے لے گیا ہے تو چھوڑے گا ساری دنیا کے سامنے۔ لوگ مجھ سے پوچھنے نہ آئیں گے کہ وہ راتیں کہاں بتاتا تھا..... وہ میری بدبختی کو بھی میرا اور مرتضیٰ کا 'چکر' سمجھیں گے۔ مجھ میں سکت نہیں میں خود کو گھسیٹ نہیں سکتی زبانوں کے کٹہرے میں۔ صبر بھی آہی جائے گا کہ اور کوئی چارہ جو نہیں بس یہ کانٹا.....'' وہ گلا مسلتی۔

''اللہ وہ لوٹ آئے۔'' اس کی دعائیں۔

☆☆☆

غلامان عشق جگر سونپ کے چھید پالتے ہیں
مگر ہو جاتے ہیں ضمانت کچھ مسکراہٹوں کی

یوں تو رات کے انداز بدلتے رہتے مگر موسم تو ایک ہی ٹھہرا تھا سکینہ کے گھر میں دعا کا موسم، اللہ وہ لوٹ آئے۔ کی دعا گھر کے ہر گل دان، ہر چوکھٹ ہر کونے کو ازبر کروائی تھی سکینہ نے..... پھر.....

اور پھر وہ لوٹ آیا۔ شادی کے چار سال بعد..... ساڑھے پانچ سالہ بچے کی انگلی تھامے وہ غصیل دکھتا نہ ہی شرمندہ۔

''فرزین کو چھوڑ دیا ہے میں نے، عیسیٰ اس کی کامیابیوں کی راہ میں رکاوٹ تھا اس لیے میں اسے لے لایا..... تم بھی بہل جاؤ گی۔''

وہ کسی عیسیٰ پر وارفتہ ہوئی یا گھر لوٹے پیار..... فیصلہ کچھ مشکل نہ تھا۔ دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ بڑبڑاتی، گھر میں قمقمے جل اٹھے۔ پھولوں نے باس دینی چاہی اور سکینہ نے آرائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ گھر میں تین وقت چولہا جلنے لگا۔ چہل پہل نظر آنے لگی۔ جون کی تپش جانے کیسے مہربان رہی سکینہ کے آشیانے پر۔ یوں دو ماہ گزر گئے اور پھر۔

''جاوید بھائی..... خاور تین دن سے گھر نہیں آئے۔'' وہ اضطراب سے انگلیاں چٹخاتی۔ فون کرتی خاور کے دوستوں کو۔

''وہ تو یونان میں ہے بھابھی..... بس اتنا معلوم ہے۔''

وہ کالج سے گھر واپس آتی ہے اور کوریئر سے

لفافہ موصول کرتی ہے۔ تصویریں دیکھتی اور جامنی ہوئی جاتی ہے۔

وہ لوٹ آئے..... وہ دعائیں مانگتی تھی۔ اور یہیں کا ہو کر رہے۔ یہ تو مانگا ہی نہیں۔ فرزین دنیا کی آخری عورت ہے اور خاور باوفا مرد..... یہ سوچ مات دے گئی تھی۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ سکینہ عبدالقیوم کا مرد۔۔۔ اپنی اوٹ میں عورتیں چھپائے، اذیت دیتا۔ رقد، ملعون

''میں نے پوری دعا نہ مانگی۔'' وہ بڑبڑائی۔ ملازم متاسف ہوئے۔

گیند کو زمین پر پٹخ کے اٹھانے کا حظ لیتا عیسیٰ اسٹور روم میں دھول ہوئی ہذیاں بکتی ''بڑھیا'' کو دیکھتے ہی چیخا اور پھر وہ سکینہ عبدالقیوم ہی تھی کہ جس کی انگلیاں عیسیٰ شیر زمان کے گالوں اور ٹھوکریں پسلیوں سے اپنا ماضی واپس مانگتے۔

وہ رات سکینہ اور عیسیٰ کے لیے یکساں دردناک تھی۔ اسی رات نے سکینہ اور عیسیٰ کو ایک ہی دائرے میں آمنے سامنے کھڑا کیا تھا۔ وہ رات تنگی کے ساتھ آسانی کا معجزہ تھی۔ دعائیں واقعی رد نہیں ہوتیں۔ دعائیں بے موقع و بے مقصد ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆

اور پھر اس رات نے سکینہ کو باغی کر دیا ہر اس راہ سے جو خاور شیر زمان تک لے جاتی تھی۔ اس رات نے روشن کر دی ہر وہ دراڑ جس کو پھلانگتے وہ عیسیٰ شیر زمان کی ماں بن گئی۔ آخری بار وہ اس رات کی صبح کو روئی تھی۔ عیسیٰ کو سینے سے چمٹائے۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔'' یہ الفاظ اس نے پہلی بار کہے تھے۔ اپنی سوتن کے بیٹے سے۔

''مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ سب سے ارفع..... خود سے ماورا محبت میرے بیٹے۔''

کیسی دھول اٹھی اس بوسیدہ جملے سے یادداشت کی الماریوں میں سب سے نچلے اور غیر استعمال شدہ خانے میں ان چھوا پڑا تھا یہ جملہ..... باپ کا مان..... دنیا کی زبان..... اسے اس جملے کی تاثیر معلوم ہی نہ تھی۔ پھر وہ کہنے لگی یہ جملہ بار بار۔

آنکھوں کی کوکھ اتنا حلتی کہ بانجھ ہونے کے درپے ہو جاتی۔ شوہر کو دیکھتی تو پسلیاں خود میں پیوست ہو ہو جاتیں باپ کا سوچتی تو تن جاتی۔

''محبت بیٹیوں کی دسترس میں ہو نہ ہو..... یہ فخر ضرور ہونا چاہیے کہ ان کے باپ کو دیکھ کر لوگوں کی زبانوں پر کبھی بیٹوں کے معاشقے نہیں آئے۔''

عیسیٰ شیر زمان نے سکینہ عبدالقیوم کی محبت تک دسترس یقینی بنا دی۔

''مما! مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔'' وہ اس کے جوتے کے تسمے باندھ رہی تھی جب وہ بولا۔

''مگر مما بہت ناخوش ہیں آپ سے..... ناراض ہیں۔'' وہ اٹھلا کے بولی۔

''تو کیا میری محبت کو فرق نہیں پڑتا۔'' انگریزی میں بولے اس جملے نے سکینہ عبدالقیوم کو قطب شمالی کا برفیلا ٹکڑا بنا دیا۔ بے شرط محبت..... تو دنیا میں مرتضیٰ اکیلا نہ تھا جو اس شے کا دعوے دار تھا۔ وہ سرسبز ہو گئی کہ اس نے اطاعت کی اور اللہ نے لوٹا دی ہر نعمت.....

اس دن عیسیٰ کی اولیول میں شاندار کامیابی پر دعوت کی گئی تھی۔ خاور نے مہمانوں سمیت دونوں ماں بیٹے کو حیران کر دیا۔

عیسیٰ کی بیرون ملک تعلیم..... کیمبرج میں داخلہ اگلے مہینے لندن روانگی۔ رات وہ پہلی بار خاور شیر زمان پر چیخی..... اور یہ آخری بار نہ تھا۔

''میں باپ ہوں اس کا تم فقط آیا۔ ماں مت بنو۔ اہل ہوتیں تو اللہ کو مجھ سے زیادہ علم ہے ہر شے کا۔'' لفظوں ولہجوں کے زہر کو تریاق نہیں ملتا۔ نیل نیل بدن کے ساتھ بچوں سے ہمکتے عیسیٰ کو خود سے جدا کیا تھا اس نے اور تم نے دیکھا سوگھا ہے ہسپتالوں کے زیر زمین بنے سرد آرام گاہوں کو..... سکینہ عبدالقیوم کا گھر وہی بن گیا تھا۔

☆☆☆

''میں پاگل ہوں خود کی ڈسی عورت کے ہاتھ میں اپنے اکلوتے وارث کی لگامیں تھما کر بے گانہ ہو جاؤں۔''

یہ سن لینے کے بعد اسے عیسیٰ کے واپس کبھی نہ

آنے کا یقین ہوگیا۔ وقت نے اپنی ریتھ کو ایڑھ لگانے سے پہلے اس یقین پر سچائی کی مہر لگائی تھی۔

وہ کبڑی، برص زدہ بڑھیا بنتی گئی۔ بدصورت، بدزبان، چڑچڑی بڑھیا۔ وقت نے خاور شیر زمان کی شخصیت کو حرص بنا دیا۔ زیادہ سے زیادہ ہوتا حرص۔

''میں کہتی ہوں کوئی آسیب ہی رہے پر میرے گھر میں کوئی رہے۔'' دوست کا جادو زدہ بنگلہ دیکھتے وہ بولی تو سب کو دکھ نے منجمد کر دیا۔

وہ سائرہ کے گھر جاتی بیٹھ کر اس کے بچوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کا بیٹا شناختی کارڈ بنوانے گیا۔

''ہماری اسیری کو انیس بیس سال ہوگئے۔'' بھولا حساب تازہ ہو۔

آپا ساس کے بعد گھر پر حکمرانی کرتیں۔ خوب صورت ذہین فطین اولاد اسجد بھائی کو ٹھنڈک دیتی۔

''اگر اولاد ہی ہوجاتی..... جو تھی وہ ہی رہ جاتی۔'' پھر سے بڑبڑاہٹیں۔

''سکینہ! یوں بڑبڑایا مت کرو۔ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔'' سائرہ رو دیتی۔

وہ چار دن بہتر ہوتی پھر وہی۔

''کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھاؤ بڑھیا۔'' خاور ہاتھ جھٹکتا۔

وہ دکھانے لگی۔ نیند کی گولیاں کچھ ورزشیں اعصاب کو سن کر دیتی دعائیں، جانے وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ بات ڈھونڈنے میں تین گھنٹے لگ جاتے۔

کبھی ثریا آپا کی مریم رہنے آجاتی۔ کھانے بنالیتی۔ صفائیاں..... سکینہ کے سر کا مساج، وہ بہل جاتی۔

''خالہ کب آئے گا تمہارے شوہر کا بیٹا جو بلا ناغہ آپ سے کہتا تھا کہ اسے محبت ہے آپ سے۔ اب تو ہمارے ماسٹرز کو بھی سال ہوگیا۔'' عیسیٰ کی ہم جماعت تھی۔

کبھی تصویریں کھول کے بیٹھ جاتی۔ نقلیں اتارتی۔

''مما یہ ڈزنی ورلڈ کی جادوگرنی ہے۔ اوگاڈ تمہیں پلے اسیشن چلانا نہیں آتا۔ تمہارے گھر جنریٹر بھی نہیں ہے۔ سیل فون ایسا ہوتا ہے۔ دیکھ لیا کبھی لے بھی لینا۔'' سکینہ خوب مسکراتی۔ وہ نقل اتارتی تو سکینہ کو لگتا عیسیٰ ہے۔

''نہیں ہیں میرے پاس اتنے پیسے کہ لاکھوں کی ٹکٹیں خرید کر دوں اس شہزادے کو تمہارے درشن کے لیے۔'' خاور جھڑکتا وہ چیختی۔

''روپے میرے پاس تم سے زیادہ ہیں۔ میں اسے بلوا سکتی ہوں مگر وہ تمہاری ناراضی کے ڈر سے نہیں آتا۔''

''میں خود چلی جاؤں گی۔'' دھمکی۔

''دیکھ لو جا کے کبھی نہیں ملے گا تم سے وہ میرا بیٹا ہے۔'' ہمت ٹوٹ جاتی۔ پھر.....

''مما! میں کچھ مصروف ہوں۔ کچھ گیسٹ آئے ہیں۔'' وہ ابھی سو کر اٹھا تھا شاید۔ سکینہ کو چمکتی اسکرین پر عیسیٰ کے کندھے کے پیچھے کسی کا برہنہ کندھا..... سکینہ کو مریم کا نیلا پڑتا رنگ سب سمجھا گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

''خون کا اثر..... بے وفائی تمہارے وجود میں پھونکی گئی ہے تربیت کیسے جیت پاتی۔ مرگئی تمہاری آپا، تمہارے لیے۔'' اس نے اسکائپ سے عیسیٰ کو بلاک کر دیا۔ ہر رابطے کا ذریعہ بند کر دیا۔ مریم اسے سنبھالتی رہی۔

''وہ واقعی خاور کا بیٹا ہے۔'' بڑبڑاتی رہی۔ مریم اس رات رک گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ سکینہ کو اپنے سینے پر سات زمینوں کا بوجھ محسوس ہوا۔ وہ سانسوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنے لگی۔ پھر اٹھ آئی۔ مریم کو دیکھنے۔ وہ گیسٹ روم کا دروازہ کھول ہی رہی تھی کہ مریم ٹھک سے اس کے ساتھ آ لگی۔ سکینہ کے دوائی زدہ سن اعصاب کچھ کچھ جاگ اٹھے اور پھر پورے جاگ گئے خاور کو مریم کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر۔ کتنی قیامتیں جھیل چکی تھی سکینہ مگر ایسی قیامت.....

اس مردہ خانے سے گھر کو جیسے کسی نے دوزخ کے سب سے گہرے گڑھے میں جھونک دیا ہو۔

وہ دیواروں سے سر ٹکراتی..... واقعی ٹکراتی۔ بین

کرتی۔ پھٹی آواز میں چیختی۔ ملازم اٹھ آئے۔ وہ جو پچھلے بیس سالوں سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس دن حقیقتاً پاگل ہی ہوگئی۔ اس سوختہ تقدیر سے منہ چھپائے مریم صرف رو رہی تھی۔ ملازم آنکھوں کے آنسو چھپاتے، خاور فرار چاہتا تھا وہ گریبان سے پکڑتی۔ وہ تباہ کر دینا چاہتی ہر شے کو۔ گل دان..... پینٹنگز وہ سامان پھینک رہی تھی اور یکا یک خاور ایک گل دان کے سامنے آرکتا ہے۔ زخمی ہو جاتا ہے۔

''تم نے کہا میں بدکردار.....تو ہاں.....ایک پاگل سے کتنا نبھاؤں میں۔''

''ہاں ہاں پاگل ہوں میں۔'' وہ اونچی آواز میں چیخنے لگی۔

''اب تو تم اپنے اصل مقام کو ضرور پہنچو گی۔''

وہ خود پر چیزیں توڑنے لگا۔ مریم گھبرا گئی۔

''خالہ چلیں یہاں سے۔'' سکینہ کو کھینچنے لگی۔ مگر دیر ہو گئی تھی۔

خاور شیر زمان اتنا مکروہ ہوگا سکینہ بیس سال میں نہ جان سکی۔

اگلے پانچ گھنٹوں میں وہ حوالات میں تھی۔ شوہر پہ قاتلانا حملہ کرنے کے جرم میں اور پھر اگلے چودہ دن میں ذہنی صحت کے ادارے میں۔

☆☆☆

''خالہ میں ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے جا رہی ہوں۔'' مریم اس سے کہہ گئی تھی۔ سیشن کورٹ میں فیصلہ سکینہ کے خلاف ہوا تھا۔ نوکری چلی گئی۔ بات میڈیا تک بھی چلی گئی۔ وہ ذہنی بحالی کے ادارے کی مستقل مریضہ بن گئی۔

''خود کو مت تھکاؤ مریم میری جان۔''

''آپ کے اسی رویے نے مجرم ثابت کر دیا تھا۔'' وہ ماں بن جاتی۔ سمجھانے لگی۔

''لوگوں کی زبانیں بند ہونی چاہئیں خالہ! وہ شخص تو سرخرو ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا ہے اسے معتبر۔''

''لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے ایک ناموزوں قدم اٹھایا تھا جوانی میں آج تک وہ قدم مجھے آگے بڑھنے نہیں دے رہا۔ پٹخیاں دے رہا ہے۔ اب کرنے دو لوگوں کو مباحثے۔''

سائرہ نے سنا تو بالآخر سالوں بعد بول اٹھی۔

''نکل آؤ اس ملال سے باہر سکینہ! کہ مرتضیٰ کو چھوڑنا ہی اس عذاب کی وجہ ہے۔ یہ ملال تمہاری آواز کھا گیا۔ وہ آواز جو خاور کے خلاف پہلے دن اٹھی ہوتی تو تم آج اس بدنامی اگلتی دلدل میں دھنسی ہی نہ ہوتیں۔

میں پاگل تھی جو تمہیں دھکیلتی تھی مرتضیٰ کی گلیوں کی طرف، سچ تو یہ ہے کہ تب اگر تم نے ابا کا اور اپنی عزت کا لحاظ طاق میں جھونک کر مرتضیٰ کو پالیا ہوتا تو آج تم بہت ہلکی ہوتیں میری نظر میں۔ ثریا آپا بھی مریم کو تمہارے گھر نہ بھیجا کرتیں۔ چاہے مرتضیٰ کی پارسائی یوم حساب سی مسلم ہی کیوں نہ ہوتی۔ اسجد بھائی، مریم کو بھی اپنی کمائی تمہارے لیے وکیلوں پر لٹانے نہ دیتے۔ اور جنید۔ جو فون کر کر کے تمہیں اپنے گھر بلاتا ہے۔ بچوں کے لیے کون سا اسکول کالج کون سی ڈگری کون سا مضمون بہتر ہوگا تک تم سے پوچھ کر کرتا ہے۔

وہ جنید بھی مجھے تم سے فون پر بھی پانچ منٹ سے زیادہ بات نہ کرنے دیتا۔ آج ہم دونوں بہنیں جو تمہارے لیے کسی بھی حد تک جا رہی ہیں۔ مرتضیٰ سے شادی کے بعد اس وقت اپنے شوہروں کو تمہارے کردار کی گواہیاں دے رہی ہوتیں۔

مانا کہ بہت برا ہوا ہے سب مگر کچھ بہت اچھا بھی ہوا ہے ناں۔ پسند کی شادی کوئی بری بات نہ تھی مگر معاملات جس رخ پر مڑ گئے تھے تمہارے شادی ایک طرح کا کورٹ میرج ہوتی۔ نازیہ رزاق کہتی ہے ناں۔

''بیٹوں کی دسترس میں محبت ہو نہ ہو..... یہ فخر ضرور ہونا چاہیے کہ ان کے باپ کے کندھے ان کی شرمندگی، بدکرداری کی وجہ سے نہیں جھکے۔''

ابا آخری سانس تک کہتے رہے۔ سکینہ اللہ تجھ سے راضی ہو گیا۔ ہمیں کہتے رہے سکینہ کو دیکھنا میرے بعد۔

تمہارے پاس یہ فخر ہے کہ لوگ دیکھ کے کہتے ہیں بیٹیوں کو پڑھاؤ کہ وہ اتنی مضبوط ہو سکیں! خدارا لڑو خود کے لیے ورنہ زندگی سراب نکلے گی۔ کس راہ پہ نکلی

تمہیں اور کس منزل کو جانکلیں، جیسے ملال تمہیں مرض الموت کے جیسے چمٹ جائیں گے۔ ہمارے لیے بولو۔ اپنے بیٹے کے لیے بولو۔

سکینہ عبدالقیوم کی بے اثر دوائیاں حیران رہ گئیں اور سائرہ عبدالقیوم کی پھپکی کام کر گئی۔

☆☆☆

موسموں کی ڈھیٹ رنگ دار چرخی گھومی اور بہار کی گود میں حکم آ گرا۔ مریم خاصی پرامید تھی۔ آخری تاریخ سننے کو اور اپنے حق میں بولنے کو وہ عدالت آئی۔ پہلے بھی آئی تھی مگر اس بار کا آنا اسے گونگا کر گیا۔ مریم اسے بتاتی کہ شیرزمان خاندان جج بدلنے کی درخواست کر رہا ہے۔ وہ بے خبر رہتی کہ وقت کے سینے میں گرا وہ کانٹا نکلنے کو ہے۔

مرتضیٰ امجد شریف..... سینئر ہائی کورٹ جج، ایک شان دبدبے اور اصول کا نام، وہی مرتضیٰ شریف کہ جس کو کبھی سرپھری خودسر گلی نمبر 1 کی لڑکی سے لامشروط اور لامحدود محبت ہوگئی تھی۔ کچھ نہیں بہت کچھ مختلف تھا۔

فاضل جج کی کرسی پر بیٹھا وہ مغل شہنشاہوں کا جانشین دکھتا تو وہ پناہ لینے آئی ملک بدر روبدبخت۔ وہ وکیل کے دماغ کے ذلت میں لتھڑے الزامات گھٹتی سانسوں سے سنتی جبکہ اونچی مسند والا پرشوق دکھتا۔

دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوا تو اسے جج صاحب کے سامنے لے جایا گیا جو منہمک سا ہڈی گوشت کھاتا اور سکینہ عبدالقیوم کو کھڑا رکھتا۔ بیٹھنے کو نہ کہنا۔

''ابا کی اچھی بیٹی..... بہنوں کی اچھی بہن..... پڑھی لکھی باعزم..... دلوں کو جوتی کے تلووں سے دابتی سکینہ عبدالقیوم کس حال میں ہے آج؟''

''نئے لوگ آنے سے نئی فہرستیں بن جاتی ہیں..... منافع..... خسارے..... تمہارا تو ہر حساب تمہارے منہ پر پڑ گیا گلی نمبر 1 کی لڑکی۔''

سکینہ کو پہلی بار وہ بے حال لگا۔ شان سے بیٹھا مفلس شخص۔ وہ بیس سال بعد مسکرائی تھی۔

''ابا کو مرے بیس سال ہوگئے۔ شکر ہے یہ سب ان کے نصیب میں نہ ہوا۔ زندہ بھی ہوتے تو طلاق کے دھبے کو ڈھانپ لیتے۔'' بیٹیوں کے باپ، بیٹیوں کے نصیب کی سیاہی سے لڑ لیتے ہیں مگر کردار کی سیاہی ان کی عاقبت تک نیلی کر دیتی ہے۔ اب تو سمجھ ہی گئے ہوگے۔ بیٹی کے باپ جو بن گئے ہو۔''

مرتضیٰ امجد کو لگا کہ وہ کانٹا..... سہ مونہہ جو کسی رخ چین نہ لینے دیتا تھا۔ آج پانی بن کر رگوں میں گھل گیا ہے کہ وہ واقعی بیٹی کا باپ تھا۔ جوان بیٹی کا باپ۔

وقفے کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو جیسے یکایک فیصلہ سکینہ کے حق میں ہوگیا۔ کیونکہ گواہوں کے کٹہرے میں اس کا بیٹا کھڑا تھا۔ سوجی آنکھوں، متورم پلکوں اور غیر متزلزل آواز و لہجے والا عیسیٰ شیر زمان، وہ خاور کی آنکھوں میں دیکھ کے کہنے لگا۔

''اگر یہ عورت بدکردار ہے تو یقین مانیں دنیا میں وفاداری ناپید ہے۔ اگر یہ مرد بے گناہ ہے تو مجھے کسی نیکی پر بھروسا نہ رہا۔''

دو ملازم بھی ہمت دکھا کے ڈٹ کے بولے اور وہ آزاد ہوگئی۔ ہر الزام، ہر ملال۔ ہر حسرت سے۔

☆☆☆

''مما! قسم سے وہ سیم کی دوست تھی اور میں اس رات بارش کی وجہ سے وہاں رک گیا تھا۔''

جھنجلاتی آوازیں۔ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ کا پررونق منظر کہ جس میں میکرونی ابالی جاتی۔ سبزیاں ''حلال'' کی جاتیں۔

''چلیں ٹھیک ہے پھر..... اس دفعہ مت جانے دیں مجھے۔ باندھ لیں کسی اندرون لاہور کی کھونٹی سے۔ سبزیاں کاٹتی چھری رکی پھر بیٹے کے سینے پر تن گئی۔ بالکونی کے پردوں نے ہل ہل کے یہ قہقہے لگاتا مرد اور بے ساختہ ہنستی عورت آسمان کو دکھائی۔

''تم دونوں بہت گھنے ہو۔ میں ہی سب سے نزدیک اور زیادہ بے خبر بھی۔'' سکینہ مسکراتی کہتی۔ گھڑی کی سوئیاں ہندسوں سے سر ٹکراتی بڑھتی رہتیں۔ غلامان عشق نکالتے ہیں وقت کے بدن سے جادوئی سوئیاں پھر آن لیتی ہے ان کو فنا پذیری..... غلامان عشق مرجاتے ہیں

☆☆

شمیم زاہدی

سزا

میں نے اس گھر کا دروازہ بجایا۔ اندر سے آواز آئی ''کون ہے؟''

ایک سیمیں رخ نے دروازے کھولا۔ ایک معصوم سی آواز یوں جیسے کوئی گنگن بج اٹھے۔ میں نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ کیا کوئی اس قدر بھی حسین ہوسکتا ہے۔ میں نے خود سے پوچھا؟

''بشیر صاحب گھر پر ہیں؟''

''جی ہاں ماموں گھر پر ہی ہیں۔''

''آؤ یار! اندر آجاؤ، کیوں بے گانوں کی طرح باہر کھڑے ہو؟''

بشیر کی آواز آئی۔

میں اندر چلا گیا۔ بشیر سے ہاتھ ملایا۔ بھابی کو سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تمہارا اپنا گھر ہے تکلف مت کیا کرو۔'' بھابی نے کہا۔

''بہت دنوں سے نظر نہیں آرہے تھے میں تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔'' میں نے بشیر سے کہا۔

''کچھ مصروفیات ایسی تھیں کہ تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔'' بشیر نے کہا۔

کچھ دیر بیٹھ کر میں گھر واپس آگیا۔ میرے دل میں اس حسینہ کو دیکھنے کی خواہش نے پھر انگڑائی لی، میں اس ساحرہ سے ملنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ میرا نام تبریز احمد ہے میری عمر 30 سال ہے۔ بی اے کرنے کے بعد بابا نے مجھے کپڑے کی بہت بڑی دُکان کھول دی۔ ایک وفا شعار بیوی، سات سالہ بیٹے اور بابا کے ساتھ زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ کپڑے کی دُکان بھی خوب چلتی تھی۔ میری بیوی نماز پابندی سے ادا کرتی، میری اور بابا کی خدمت ثواب سمجھ کر کرتی۔ مجھے اللہ سے اور کیا چاہیے تھا۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا اس حسینہ سے ملنے کے بہانے کا۔ آخر میں نے ایک بہانہ گھڑ لیا کہ مجھے شیر شاہ میں ضروری کام یاد آگیا۔

''میں کل تک واپس آجاؤں گا۔'' میری بیوی نے مجھے دعائیں دے کر رخصت کیا۔

میں ملتان سے شیر شاہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ معصوم سی لڑکی چھم سے میرے اندر آبیٹھی تھی۔ اگر بشیر (میرا دوست) اس وقت میرے دل کی کیفیت جان جاتا تو اپنی سچی اور بے لوث دوستی کو بھلا کیا نام دیتا۔ کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے وہی میرے ساتھ ہوا میں نے بشیر سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔

بشیر نے بتایا کہ یہ میری بھانجی ہے بی اے کی اسٹوڈنٹ ہے پڑھنے کے لیے میرے پاس آئی ہے۔ اسے کالج میں داخلہ دلوانا ہے۔ بچی یتیم ہے۔

ہم دونوں دوست باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔

''شہر بانو! بیٹا چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔'' بشیر نے اپنی بھانجی کو آواز دی شہر بانو چائے بنا کر لائی۔ میں تو یک لخت بے خود ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں شہر بانو کے آگے دل ہار بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے بشیر کی فیملی کے ساتھ میں کھانا کھایا۔

''جیسے تم اپنی خوش قسمتی سمجھ رہے ہو یہ تمہاری بدقسمتی ہے تم گھر لوٹ جاؤ یہاں کبھی مت آنا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میرا جنون کم ہونے کے

بجائے بڑھنے لگا۔

میرے آگے ایک رنگین دنیا تھی مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اپنی اس بدلتی کیفیت پر پریشان تھا۔ مجھے لگا جیسے میں ایک بے رنگ تصویر تھا کوئی آہستہ آہستہ اس میں رنگ بھر رہا ہے۔ شہر بانو کے ساتھ خوش گپیوں کے دوران مجھے بانو قدسیہ کی ایک سنہری تحریر یاد آگئی۔

انہوں نے لکھا تھا ''سارے شاعر حسین و جمیل اور خوب صورت محبوبہ کی شان میں شاعری کرتے ہیں۔ کبھی کسی نے گھر کے کاموں سے تھکی ہاری بچوں کے مسائل سے پریشان الجھے بالوں والی بیوی کے بارے میں کچھ کہا؟ جو نہ مل سکا اس پر شاعری جو مل جائے اس پر لطیفے، عجیب نفسیات ہے۔'' میں بانو قدسیہ کی تحریر یاد آنے پر شرمندہ ہوا مگر صرف پل بھر کے لیے۔

شہر بانو نے پلکیں اوپر اٹھائیں ان خوب

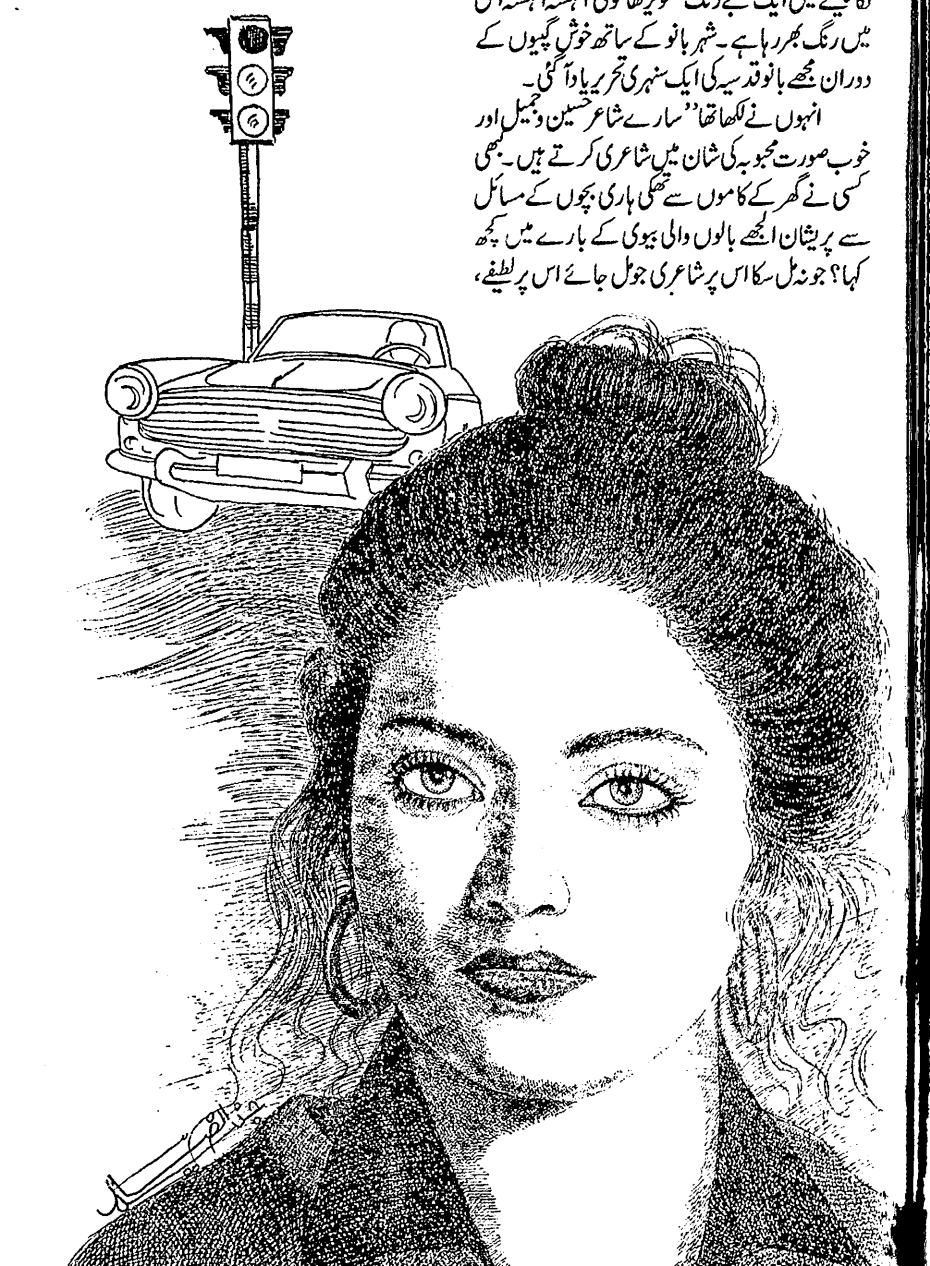

صورت آنکھوں نے ایک لمحے میں میرے دل کی دھڑکنیں مرتعش کردیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال بار بار گلابی ہورہے تھے۔ ہم سب کھانے کے دوران خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن میں گھر واپس آگیا۔ ''تم نسرین (میری بیوی) کے ساتھ بے وفائی کررہے ہو تبریز احمد۔''

میرے ضمیر نے دوبارہ مجھے لہولہان کردیا؟ اس بے کیف اور بے رنگ زندگی میں خوب صورت رنگ کہیں سے آرہے ہیں تو آنے دوں؟ میں انکار کیوں کروں۔ میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبادیا۔ میں اور شہر بانو فون پر رابطے میں تھے۔

میں نے شہر بانو سے کہہ رکھا تھا کہ مجھے صرف دُکان پر فون کرنا۔ رات کو جب میں گھر ہوتا ہوں مجھے فون مت کرنا۔ میری بیوی ہنگامہ کرسکتی ہے۔ میں نسرین (میری بیوی) سے ڈرتا نہ تھا بلکہ اس سے سخت شرمندہ تھا۔ میں شام کو اس طرح آتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ نسرین بسم اللہ کہہ کر میرا استقبال کرتی۔ میں نسرین سے سخت شرمندہ تھا میرا ضمیر مجھے قدم قدم پر شرمندہ کرتا رہتا۔

☆☆☆

میں اور شہر بانو شادی کے خواہش مند تھے۔ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے، میں نسرین سے کوئی زیادتی نہیں کررہا۔ میں نے اپنے ضمیر کو یہ دلیل دے کر چپ کروادیا۔ ہمارے اس رنگین تعلق کو دو برس بیت گئے۔ کاروبار توجہ نہ دینے کی وجہ سے زوال کی طرف جارہا تھا۔ سارا پیسہ میں نے شہر بانو کے ناز نخروں پر لٹادیا اور گھر میں اپنی فیملی کو کہتا کہ کاروبار خسارے میں جارہا ہے۔ میری بیوی نے بہت سی اپنی ضروریات کو محدود کرلیا۔ یہاں تک کہ عید پر بھی کپڑے صرف بچے کے بنتے۔ عید پر میں شہر بانو کو خوب شاپنگ کرواتا۔ اور گھر میں شور کرتا کہ کاروبار تباہ ہوچکا ہے۔

میری بیوی اس حالت میں مجھ سے کیا مانگتی؟ بس مجھے تسلی ہی دیتی۔ میری خوراک پر زیادہ توجہ دینے لگی بلکہ اپنے حصے کا دودھ بھی مجھے دینے لگی کہ کہیں میں کمزور نہ ہوجاؤں۔ وہ میرا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ میں نے گھر میں کھانا بہت کم کردیا۔ کھانا نہ کھانے کے ہزار بہانے میرے پاس تھے۔ دو برس میں کاروبار تباہی کے قریب پہنچ گیا۔

ایک دن شہر بانو نے فون پر مجھ سے کہا کہ تبریز احمد ہم شادی کررہے ہیں؟ میں نے گھر والوں سے بات کرلی ہے۔

''بشیر نے مجھے کہا کہ تمہارا روز یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں تم اپنا ایک الگ گھر بناؤ شہر بانو کو اپنی بیوی سے الگ رکھنا یہ ہماری پہلی شرط ہے۔ اور گھر شہر بانو کے نام کردو۔ ان کو میری مالی حالت کا اندازہ نہ تھا۔ وہ مجھے مالی طور پر خوش حال سمجھتے تھے۔ میں مکمل طور پر تباہ ہوچکا تھا مقروض بھی۔ میں ان کی کوئی شرط پوری کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

میں نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے شہر بانو کا فون اٹھانا چھوڑ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں شہر بانو کو اپنی مالی حالت بتاؤں۔ بیوی سے بے وفائی کا دکھ، شہر بانو کی جدائی کا دکھ، کاروبار تباہ ہوجانے کا دکھ، ایک دن ان سب دکھوں نے مل کر مجھے بیمار کردیا۔ دُکان پر مجھے دل کا دورہ پڑا، مجھے اسپتال لے جایا گیا۔ میں نے گھر والوں کو کوئی اطلاع نہیں دی۔ تیسرے دن میں گھر آیا۔ اُجڑا ہوا اور برباد۔

اس رنگین کھیل میں اگر میرے ہاتھ کچھ آیا تو وہ شہر بانو کی چند تصاویر تھیں وہ میں نے چھپا کر الماری میں رکھ دیں۔ ایک دن بدقسمتی سے وہ تصاویر میری بیوی کے ہاتھ لگ گئیں۔ تصاویر دیکھ کر اسے سب معلوم ہوگیا کہ کاروبار کی بربادی اور میری تباہی کیسے ہوئی میری بیماری اور مالی بدحالی کو دیکھتے ہوئے اس نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ میں اب کسی کے کپڑے کی دُکان پر کام کرتا ہوں۔

میں جب شام کو گھر آتا ہوں تو میرا استقبال نہیں کرتی کام پر جاتے ہوئے دعا نہیں دیتی۔ مسکرا کر مجھ سے بات نہیں کرتی۔ میرے لیے اتنی سزا ہی کافی ہے۔

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے
ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 00100000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA00100000015680030'' کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/7000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/8000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آرڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

اُمِّ طیبہ نور

منصار

صحن میں انتہائی خاموشی چھائی تھی جیسے کوئی سوگ سا چھایا ہو۔ بڑے اور موٹے موٹے پایوں والی چارپائی پر ابا جی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی پائینتی کی جانب اور سامنے موڑھے پر مونچھوں کو استہزائیہ تاؤ دیتا ڈاکیا تشریف فرما تھا۔ جس نے ابھی کچھ دیر پہلے ابا جی کو شیر دل کا نامۂ اعمال پکڑایا تھا۔

بس کچھ پل ہی گزرے تھے کہ چاچا کمالا بھی شوق اور جوش سے تمتماتا چہرہ لیے حاضر ہو گیا اور ابا جی کی پشت پر بیٹھ کر ان کے کندھے دبانے کے بہانے اچک اچک کر ان کے ہاتھ میں تھاما شیر دل کا رزلٹ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور ان تینوں کے بالکل سامنے چھ فٹ لمبا، چوڑی کاٹھی والا شیر دل کسی مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ ابا جی نے ایک اور غصیلی نگاہ رپورٹ کارڈ پر ڈالی اور ہنکارا بھرتے ہوئے شیر دل سے مخاطب ہوئے۔

''فیل۔ تیسری بار بھی ایف اے میں فیل۔ صدقے جاؤں میں تیرے۔'' طنز سے بھرا صدقے جانا شیر دل کو سر جھکانے پر مجبور کر گیا۔ پھر بھی ہمت کر کے بولا۔

''وہ ابا جی! کسی استاد کو میرے ساتھ دشمنی ہے جی۔ وہی فیل کرتا ہے۔''

''پتر تم سب ہی میں فیل ہو، کیا سب ہی استادوں کو تم سے دشمنی ہے۔''

''میں کیا بتاؤں ابا جی۔ بولا تھا، بولا تھا آپ کو کہ میں نے نہیں پڑھنا آگے۔ ککھ پلے نہیں پڑتا میرے سبق۔ پھر بھی آپ نے زبردستی کی تھی جی۔ یہی انجام ہونا تھا نا۔''

مکمل ناول

''بنتی اتار کے تیرے سر پہ ماروں گا میں۔ خلیق خبیث۔ تُو ہے ہی اپنے چاچے پر عقل کے معاملے میں۔''

اور چاچا کمالا جو اس کی بنتی درگت کے مزے لے رہا تھا، پہلو بدل کر رہ گیا۔ پہلو تو بے بے نے بھی بدلا لیکن اباجی کے شیر دل کے لیے سخت لہجے پر۔

''اوپر سے بشیرے کو تڑیاں بھی لگا آیا کہ تیرا رزلٹ گھر نہ آنے دے۔ وہ تو چنگا ہوا کہ مجھے بتا دیا اس نے ورنہ تُو نے تو باہر سے ہی نکل لینا تھا اپنا کرتوت نامہ۔'' اباجی نے بشیر ڈاکیے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ شیر دل نے انتقامی نگاہ اور بشیر ڈاکیے نے چڑاتی نگاہ ایک دوسرے پر ڈالی۔

''میں تو کہتا ہوں چوہدری صاب! منڈے کا ویاہ کر دو۔ سیٹ ہو جائے گا۔'' ڈاکیا بشیر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

شیر دل کے دل کی گھنٹی بجی۔ لیکن اس گھنٹی کی آواز دباتے ہوئے تیکھے چتون لیے بولا۔

''مجھے کوئی مجبور نہ کرے جی ویاہ کے لیے۔ میں ابھی آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ سنگل (زنجیر) نہیں ڈالنا میں نے پیروں میں۔''

''سنگل تو ڈالوں گا تیرے گلے میں جو بوہتی ٹین ٹیں کی۔'' ساتھ ہی بشیر ڈاکیے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ویاہ والی حرکتیں ہیں بشیرے! اس کی۔ کام کاج کچھ کرتا نہیں، ویاہ کرا کے سر اوکھلی میں دے لوں میں اپنا۔''

شیر دل اباجی کی بات سے مایوس ہوا لیکن پینترا بدل کر بولا۔

''چلیں کوئی نہیں۔ کرا دیں ویاہ۔ کرا لوں گا۔ میں نے کب ضد باندھی ہے آپ لوگوں کی خواہش کے آگے۔ کرا لوں گا۔ پھر کیا ہے۔''

بے بے نے محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا اور اباجی کو ٹہوکا دیتے ہوئے بولیں۔

''کتنا فرماں بردار لعل ہے میرا۔ پھر کیا ہوا جو نہیں آئے نمبر۔ ویاہ کرا دو جی اس کا۔ اپنے بچوں کو خوب سارا پڑھا لے گا۔''

''لے بے بے۔ پوچھ ہی نا۔'' شیر دل بڑے جوش سے آگے بڑھا اور بے بے کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''بچوں کے لیے میرے بڑے پلینز ہیں۔ ایک کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ ایک کو فوج میں بھرتی کرا دوں گا۔ ایک کو کاروبار کراؤں گا۔ ایک میرے ساتھ وائی بیجی (کھیتی باڑی) کرلے گا۔ ایک۔''

اباجی سیدھے ہوئے اور نیچے جھک کر اپنا کھسہ اٹھایا۔ ان کا ارادہ بھانپ کر شیر دل اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا حویلی کے پھاٹک کی جانب بھاگا۔ پیچھے چاچا کمالا بھی تھا کیونکہ اباجی کو غصہ آتا تو کوئی بھی بندہ سامنے آجاتا، کھسہ برسا دیتے تھے۔

''جاؤ دفع ہو جاؤ ہڈ حرامو! بچوں کی لائن لگانے کا کتنا پتا ہے بے غیرت کو۔ کراتا ہوں تیرا ویاہ۔ تجھے تو میں اگلے چار سال نہ بیاہوں۔ کرتوتیں نکے کی اور باتیں جائے سے باہر نکل کر کرتا ہے۔ آ اب گھر۔ اج تو تیری چھترول لازمی کروں گا۔ یہیں بیٹھا ہوں میں۔''

اباجی ہاتھ سے کھسہ فرش پر پٹختے ہوئے بولے۔ بے بے لمبی سانس خارج کرتی اپنی جگہ سے اٹھیں اور دودھ پتی بنانے چل دیں۔ اس ٹھنڈ میں گرم گرم دودھ پتی اباجی کے مزاج پر اچھا اثر ڈالتی تھی۔ ویسے بھی ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا تھا اور پھر شیر دل کے لیے تو زیادہ دیر ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔

آج ذرا اس نے رات واپسی میں دیر لگائی تھی تو اباجی نے خود ہی اسے لانے کے لیے حویلی سے نکل پڑنا تھا۔ شیر دل ہی تو پوری حویلی کی رونق تھا۔ دونوں بوڑھوں کی ہر خوشی اسی سے وابستہ تھی۔

☆☆☆

جاڑا پورے جوبن پر تھا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی شیر دل نے بستر چھوڑا اور چھت پر چلا آیا تھا۔ دھند کی دبیز تہہ میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتا اپنی چھت کی منڈیر تک آیا

اور اس پر سوکھنے کے لیے ڈالی سرمئی رنگ کی جرسی ہاتھ میں تھام کر چیک کی۔

''او بیڑہ ای غرق۔ یہ بھلا ایسی ترپل (اوس) میں کہاں سوکھنا تھا۔ بڑا کمینہ ہے بودی تُو۔ میں بھی دیکھوں گا بچُو تو کیسے اسکول نہیں جاتا۔''

اس نے جرسی منڈیر سے کھینچی اور الٹے قدموں ٹھٹھرتا ہوا اسی طرح گرم چادر کی بکل مارے نیچے چلا آیا۔

چوبارے کے نیچے بے بے نے چولہا تپا لیا تھا۔ پاس ہی کچھ فاصلے پر پیڑھیوں کے پاس انگیٹھی بھی جل رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ایک پیڑھی پر آبیٹھا اور جرسی چادر کے نیچے سے نکال کر انگیٹھی کی گرمائش سے سکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بے بے پراٹھے کے لیے پیڑے بناتے ہوئے اسے بھی دیکھ رہی تھیں۔ وہ جھلایا ہوا تھا۔ جرسی سکھانے کے لیے وہ اسے بار بار لہرائے بھی جا رہا تھا جس سے ٹھنڈی یخ ہوا کا تھپیڑا پیچھے بیٹھی بے بے کو ہنٹر کی طرح لگتا۔ ناچار بے بے نے پکڑا چمٹا اور مارا اس کی کمر پر۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔ جرسی ہاتھ سے چھوٹ کر انگیٹھی کے اوپر گرتے گرتے بچی۔

''او بے بے! نکلی ہوئی ہے کیا۔ ٹھنڈے پنڈے پر مارا ہے۔ چار دیہاڑے (دن) لگ جانے ہیں نیل جاتے۔ کیا مصیبت آئی تھی بے بے۔'' وہ پیچھے کمر پر ہاتھ لے جانے کے چکر میں دہرا ہوتا ہوا منمنایا۔

''پہلے ہی پالے سے گوڈے گٹوں کا گودا بھی جما ہوا ہے۔ کس طرح سے تڑکے اٹھ کر چار پروٹھے تھوپتی ہوں، مجھے پتا ہے۔ کانپ کانپ کر ہڈیاں بھی کڑک جاتی ہیں میری۔ بڈھی میری جان ہے اور تُو کم عقل جرسی کو ہونٹے (جھولا) دلا دلا کے میرا چولہا بجھا رہا ہے ساتھ سیلی سیلی ہوا مجھے بھی دے رہا ہے۔'' بے بے نے پراٹھا بیل کر توے پر ڈالا۔

''او یار یے بے۔ بودی کی جرسی ہے۔ کل شام کو چھت پر ڈالی تھی دھو کے۔ ابھی تک نہیں سوکھی۔ اوپر سے اسکول کا ٹیم بھی ہونے والا ہے۔''

''کتنی بار ی بولا ہے تجھے، مجھے یار نہ کہا کر۔ دند (دانت) توڑ دینے ہیں میں نے تیرے۔ رات تیرے ابا جی کا غصہ کس مشکل سے ٹھنڈا کیا ہے، مجھے پتا ہے۔ دھیان کر شیر واب کام کی طرف۔''

بے بے نے پہلے سے چنگیر میں رکھا گرم پراٹھا اس کے آگے کیا۔ دیسی گھی میں تر بتر پراٹھے کی اشتہا انگیز خوشبو اور گرمائش نے اسے سکون پہنچایا۔ وہ جرسی بھول کر پراٹھے پر اچار رکھ کر کھانے لگا۔ بے بے نے رات کے بچے دیسی مرغ کے سالن کی کٹوری بھی اس کے آگے دھری۔

''اور بودی کے اسکول جانے کی تجھے کیوں اتنی فکریں ہیں۔ کھسماں نو کھا کھائے اس کا اسکول۔ اس کے ماں پیو کو ہوش نہیں، تجھے سیاپے پڑے ہیں۔ پتا نہیں کس سیانے نے بولا ہے کہ اتنی سویرے اٹھ کر اسے اسکول چھوڑنے جا۔ اپنی باری تو موت پڑ جاتی تھی اسکول جاتے۔ رو رو کے دسویں پڑھی۔ اور ایف اے میں تین باری فیل۔''

دانت میں وہ زخمی نظروں سے بے بے کو دیکھ کر رہ گیا۔

''کر لے مخول بے بے، تُو بھی کر لے۔ ایسے ہی مجھے اکیلا کر دیا کر۔ ابا جی کے سامنے تو میری بڑی طرف داریاں کرتی ہے۔''

چل ناشتہ کر اب۔ زیادہ باتیں نہ بنا۔''

بے بے نے دوسری چنگیر میں اوپر تلے دو پراٹھے تل کر رکھے ہی تھے کہ پھاٹک کھلا اور چوہدری حق نواز اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی برآمدے کے ستون کے پاس رکھے حقے کی نے منہ میں دبالی۔

''لے آگئے تیرے ابا جی۔ جب دیکھو حقے کی جان کو چمٹے رہتے ہیں۔ ساری عمر سوکن کی کمی نہ ہونے دی انہوں نے۔ حقہ ہی بہتیرا ہے مجھے۔'' بے بے نے چنگیر پر گرم گرم سالن کی کٹوری اور اچار کی پیالی سجاتے ہوئے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

''بول۔ شاوا بولی جا۔ تیرے بولنے سے کون

سامیرا حقہ بجھ جاتا ہے۔''

چوہدری صاحب نے برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی ٹانگیں اوپر چڑھا کر پائینتی پر دھری رضائی بھی اردگرد لپیٹ لی۔ اس بڑھاپے اور غضب کی سردی میں بھی وہ فجر مسجد میں جا کر پڑھتے تھے۔ بے بے نے پاس آ کر چنگیر آگے رکھی اور بولیں۔

''ہزار باری کہا ہے کہ حقہ لے کر رضائی میں نہ گھس جایا کرو مگر اثر تو لیتا ہی نہیں نا۔ کسی دن آگ لگ گئی نا تو ہلا بھی نہیں جانا۔''

''اوجا اوجا۔ آگ لگ گئی۔'' چوہدری صاحب نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ ''آج بھی ایک چھڑا پی (چھلانگ) ماروں نا تو دیوار پھلانگ سکتا ہوں۔ انہوں نے بے بے کی کٹیلی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ جھلایا تو چولہے کے پاس بیٹھا شیر دل دبی دبی ہنسی ہنس دیا۔ آواز چوہدری صاحب کے کانوں میں گئی اور اس کے بھی لتے لینے شروع ہوئے۔

''ہنس رہا ہے بے غیرت۔ ڈوب کے مرجا۔ فجر پڑھنے نہیں آیا نا۔ بندہ بن جا بندہ۔ ورنہ کٹ کھا لے گا میرے سے تو۔''

اور اس نے فوراً گھٹنوں میں سر دے کر پراٹھے کے بڑے بڑے نوالے نگلنے شروع کیے۔ شیطان ایسا حاوی ہوتا تھا کہ روز فجر میں اٹھ کر بھی کسی ناہنجار کام میں دھیان لگ جاتا تھا اور نماز گول ہو جاتی تھی۔ روز خود سے عہد کرتا تھا اور توڑتا تھا۔ چوہدری صاحب روزانہ کی بنیاد پر صلواتیں سنایا کرتے تھے۔

بے بے نے مٹی کے پیالوں میں دودھ پتی انڈیلی اور ایک پیالہ شیر دل کے آگے رکھ کر دوسرا انہیں دینے اٹھیں تو کہے بنا نہیں رہیں۔

''جوان جہان میرا منڈا ہے۔ جسے ہر وقت چنگا مندا بولتے رہتے۔ سارے جگ کے دادے دیکھے پر آپ جیسا نہ دیکھا کوئی۔ پوتے پر جان دیتے دادے پرنا جی۔ یہاں ذرا فرق نہیں پڑتا۔''

''بیڑہ غرق کر دیا تیری ان باتوں نے اس کا۔ مشٹنڈا بنا سارے پنڈ میں لٹو کی طرح گھومتا رہتا۔ ایف اے تک تو پاس کر نہیں سکا۔ نہ زمینوں ہوش نہ فصلوں کی خبر۔''

''میں کہتی ہوں جی۔'' بے بے پیالہ ہاتھ میں لیے وہیں چارپائی پر ٹک گئیں۔ آواز قدرے آہستہ کر لی۔ ''شیر دکا ویاہ کر دو۔ آنے والی خود سارے کس بل نکال دے گی۔''

شادی کی بات پر شیر دل کے کان شکاری کی طرح کھڑے ہوئے۔ یہ موضوع تو دل پسند تھا۔ نظروں میں کسی کا چہرہ گھوما تو لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کن اکھیوں سے پلٹ کر ایک نظر بے بے اور ابا جی پر ڈالی اور بظاہر بے نیاز بنا ابا جی کا جواب سننے لگا۔

''ہونہہ۔ کھے تے مٹی دیاہ کر دوں اس کا۔ نہ کمانے جوگا نہ سنبھالنے جوگا۔ لا کے اگلی بھی رلائے گا۔ پہلے عقل ٹوہ اس کی۔ اس کے بعد اس طرح کی چھیڑ ڈال۔''

شیر دل کے منہ کے زاویے ایسے بگڑے جیسے لکڑی کے بالن کا کسیلا دھواں حلق میں اتر گیا ہو۔ شادی کے نام پر جتنا سواد آتا تھا، کام دھندے سے اتنی ہی جان جاتی تھی۔ اچھی بھلی زمینوں کی آمدن آتی تھی۔ کام کرنے کے لیے ایک سو ایک بندہ تھا مگر چوہدری صاحب کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر فصلوں میں دفعان ہو جایا کرے۔ دودھ پتی کے بڑے بڑے گھونٹ بھر کر اس نے پیالہ رکھا اور جرسی کو چادر کی بکل کے اندر کر کے، باتیں کرتے بے بے اور ابا جی کو سلام کرتا حویلی کے پھاٹک سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

وہ چاچے کمالے کے گھر میں داخل ہوا تو سارا صحن ویران پڑا تھا۔ چاچی سویرے اٹھنے کی چور تھی۔ اور چاچا کمالا اس کے نخرے اٹھانے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ جیسی مرضی تباہی دنیا میں آجائے، گاؤں سارا سیلاب کی نذر ہو یا گھر کے اکلوتے بچے

کا سر پھٹے، چاچے کو بس چاچی کی خوشی مقصود تھی۔ پچھلے مہینے لہاروں کے ہاں موت ہوگئی۔ چاچی نے وہاں دیکھا دیکھی روتے ہوئے سینے پر دو ہتڑ مارے اور بنا آنسوؤں کے بلک بلک کر رونے لگی۔ آس پاس بیٹھی کتنی ہی عورتوں نے روتے سے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ باہر سے چاچا کمالا بھاگا آیا اور چاچی کے پاس پیروں کے بل بیٹھ کر اپنے کرتے کے دامن سے ہوا جھلتے ہوئے بولا۔

''نا فریدہ۔ چپ کر۔ باؤلی ہوئی ہے کیا۔ بس کر۔ اتنا روئے گی تو ماجو اٹھ ہی نا جائے کہیں۔ تیری ٹوموں (جھمکے) کے لیے اس سے پیسے جو ادھار لیے تھے، وہ واپس نہیں کیے ابھی۔ چپکی ہو جا فریدہ۔''

اور چاچی ایسی سپاٹ ہوئی جیسے نیند سے جاگی ہو۔

''چل جا کمالے باہر۔ ایویں سانس اوکھا کرا دیا میرا۔ سوڈے کی بوتل لا دے ایک۔ کلیجہ منہ کو آرہا ہے میرا۔''

اور چاچا کمالا خوش ہو کر باہر کو دوڑا۔ ایک ہی اولاد تھی بدرالدین۔ جسے پیار سے تو نہیں مگر حسب دستور بگاڑ کر بودی بلایا جاتا تھا۔ آٹھ سال کا ہوا تو بے بے کی لعن طعن پر اسکول داخل کرایا گیا مگر مجال ہے کہ جو ہفتے میں چار دن بھی باقاعدگی سے اسکول جاتا ہو۔ چاچی کو جاگ ہی نہ آئی اور اگر جو آئی بھی تو چاچا پچکار کے سلا دیتا کہ ''جانے دے۔ کل چلا جائے گا۔ تو نیند پوری کر۔ ساری دیہاڑی کام ہی نہیں ختم ہونے تیرے۔''

بس گلو خلاصی ہوئی۔ بودی سرکار لحاف میں دبکے کے دبکے رہ جاتے۔ اور پھر ایک ایسی تبدیلی آئی جس نے شیر دل کو اسکول کی راہ دکھا دی۔ یعنی شیر دل کو اسکول جانے کا ہوکا ہو گیا۔ بودی کو بلا ناغہ اسکول لے کر جانا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا۔ دو مہینے پہلے مامے رحیم کی نواسی شہر سے آئی تھی۔ روزینہ نام تھا۔ شہر میں اس کے ماں باپ آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہو گئے تو بھائی بھابیوں نے اس کا اور اس نے ان کا جینا محال کر کے رکھ دیا۔

ماما رحیم نواسی کی لترلتر چلتی زبان کو نظر انداز کر کے اس کے بھائیوں کو لتر مار کر اسے پنڈ لے آیا۔ روزینہ بھی دو اٹیچی بھر کر بھائیوں کو الوداع کہہ آئی۔ تب سے یہاں ماموں کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔

نانا نانی کی لاڈلی کو وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں کیونکہ ماما رحیم کوئی معمولی شے نہیں تھا۔ ابھی بھی زمینوں کا سارا حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ بیٹے بھی باپ کے آگے ہتھیلی پھیلاتے تھے سو روزینہ کو کوئی کچھ کہہ کر تو دکھاتا۔ وقت گزاری کے لیے روزینہ نے پنڈ کے پرائمری اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ خود جان جوکھوں میں ڈال کر ایف اے کیا تھا مگر یہاں والوں کے لیے یہی بہت تھا کہ شہر کی طرح دار لڑکی استانی بن کر ان کے ڈنگر نما بچوں کو پڑھائے گی پھر رحیم داد کی نواسی ہونے کا ٹہکہ الگ تھا۔

بس اب روزینہ صبح بن ٹھن کر اسکول پڑھانے نکلتی تو پنڈ کے ویلے نکموں کے دل مچل مچل جاتے۔ سب کے لیے اس میں اور پنڈ کی دیگر لڑکیوں میں وہی فرق تھا جو کھوئے والی قلفی اور چاک بار آئس کریم میں ہوتا ہے۔ شیر دل بھی ان ہی میں سے ایک تھا جنہوں نے کھٹ سے روزینہ کو ایک نگاہ دیکھا اور پٹ سے دل دے دیا۔

اب یہ اس کی سنہری قسمت کہ روزینہ کو وہ بھا گیا کیونکہ ظاہری حلیے اور خدوخال میں وہ باقی سب سے ممتاز تھا۔ اونچے چوڑے قد کاٹھ، صاف رنگت اور تیکھے نقوش کا مالک پھر چوہدری حق نواز کا پوتا تھا۔ جو رشتے میں مامے رحیم کا بہنوئی لگتا تھا۔ تو روزینہ نے خوب سوچ بچار کے بعد دل اس کی پھیلی جھولی میں جھاڑ ہی دیا۔ اسی لیے شیر دل بودی پر سختی کرنے لگی جو اسی سکول میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہفتے میں دو دن جانے والے بودی کی پورا ہفتہ حاضری لگنے لگا گئی تھی تو یہ شیر دل کا کمال تھا۔

چاچی فریدہ کے تو وارے نیارے ہو گئے تھے۔ بودی کے لیے جو صبح تڑکے اٹھنا پڑتا تھا، اس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ اب شیر دل وقت کے وقت آتا اسے تیار کراتا اور بستہ تھما کر اپنے گھر لے جاتا جہاں بے بے نے بودی کے لیے پراٹھا بنا کر رکھ چھوڑا ہوتا تھا، بودی

مزے سے کھاتا کیونکہ اپنی ماں تو کبھی بھی ناشتہ بنا کر نہیں دیتی تھی، رات کی باسی روٹی کو چینی لگا کر کھانے کا کہہ دیتی اور غڑاپ سے بستر میں۔ یہاں بے بے اگر شیر دل کی دادی تھی تو بودی کی بھی تھی۔

فریدہ کی حرکتوں کی وجہ سے ہی اسے الگ کیا تھا مگر اس میں تو رتی فرق نہیں آیا تھا الٹا پوتا کملایا کملایا لگنے لگا۔ تب سے دادی نے اس کی بھی روٹی پانی کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔

شیر دل نے بودی کی نیم گیلی جرسی بغل سے نکالی اور دبے پاؤں اس کے کمرے کی جانب بڑھا۔ کل اسکول سے واپسی پر چھلانگ لگاتے ہوئے کیچڑ میں جا گرا تھا، سارے کپڑے غرق کر ڈالے تھے۔ شیر دل گھر چھوڑنے آیا تو فریدہ چاچی سستی سے جھاڑو لگا رہی تھی صحن میں۔ جب مٹے کی یہ درگت دیکھی تو وہی جھاڑو لے اس کی جانب لپکی۔

''یہاں صفائی کرنی جان کا پھاہ بنی ہوتی ہے تو وردی کیچڑ میں بھر کر آجایا کر گھر۔''

''او چاچی۔ گر گیا تھا بے چارہ۔ شکر کر چوٹ شوٹ نہیں آئی۔ وردی ذرا مل دے، کیا جاتا ہے۔ ایویں رولا کیوں ڈال دیتی ہے۔''

''تو تو چپ ہی کر جا شیرو۔ یہ روز روز اسکول لے جانے کا وخت تُو نے ہی اس کی جان کو ڈالا ہے۔ اچھا بھلا دو دن جاتا تھا تو وردی بھی دو ہفتے چل جاتی تھی۔ اب ہر روز گندی کرلاتا ہے کمینہ۔ مجھ سے نہیں دھلتی وردی اتنے پالے میں۔ اندر دوسری پڑی ہے وہ پہن لے گا صبح، بس بوجے (جیب سے) سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ جرسی کے نیچے چھپ جائے گی۔''

''تو جرسی تو دھو دو نا چاچی۔'' شیرو نے اس طرف دھیان دلایا۔

''لے دس۔ جرسی دھولوں تو ساری وردی نہ دھو لوں۔ بولا نا، مجھ سے نہیں دھلتی۔ تُو کل سویرے یا تو چھٹی کر یا پھر بے بے سے دھلوا لے۔''

ناچار شیرو جرسی گھر لے آیا تھا اور خود ہی دھو کر چھت پر ڈال دی تھی کہ ساری رات میں شاید سوکھ جائے مگر اتنی شدید سردی میں اس نے خشک ہونے کا نام نہ لیا اور چھٹی کسی صورت اس نے بودی کو کرنے نہیں دینی تھی، اس لیے گیلی گیلی ہی اتار لایا تھا۔

''اوئے بودی۔ اوئے اٹھ۔ اسکول نہیں جانا۔ اٹھ۔ جلدی کر۔'' وہ بے سدھ سوئے بودی کو دبی دبی آواز میں اٹھا رہا تھا۔ چاچی کا کمرہ ساتھ ہی تھا اور دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا جو کھلا رہتا تھا۔ اس وقت چاچا کھیتوں پر چلا جاتا تھا مگر چاچی کی نیند کا یہ انتہائی قیمتی دورانیہ ہوتا تھا۔

''اوئے اٹھ جا یار، دیر ہو جانی ہے اج پھر۔''

شیر دل نے الٹے سوئے بودی کو سیدھا کیا۔ زور سے اسے جھنجھوڑا تو وہ بے چارہ ہڑبڑا کر جاگا۔

''غرقی پھر جائے پاشیرو! تیری پڑھائیوں کو۔ کیوں آجاتا ہے صبح سویرے مجھے جگانے۔ میڈم جی کو ملنا تُو نے ہوتا ہے اور چھ کا پہاڑا مجھے یاد کرنا پڑتا ہے۔'' بودی آنکھیں مسلتا بولے جا رہا تھا۔ شیرو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا مگر پھر فوراً جھٹکے سے ہٹا لیا۔

''دیکھ بودی! میں چاہتا ہوں تُو وڈا افسر بنے۔ یہ وڈی سی گاڑی میں بیٹھے اور سارے پنڈ میں تیری ٹور بنے۔''

''میں ابے کو کہہ کر ٹریکٹر لوں گا پھر۔''

''کھوتے کا۔'' اس کے جواب پر شیرو نے زیر لب گالی دی۔

''اچھا چل۔ ابھی تو اسکول چل نا۔ ورنہ دیر ہو گئی تو وہ میڈم جی تجھے کلاس سے باہر کھڑا کر دے گی۔''

''کس نے کہا۔ مجھے کچھ بھی نہیں کہتی۔ تُو ایسا کر پاشیرو میڈم شمیم سے بھی دوستی لگا لے۔ قسمے مجھے چھ کا پہاڑا نہیں یاد ہوتا۔ تُو اس سے بھی دوستی کر لے گا نا تو وہ بھی مجھ سے سبق نہیں سنے گی۔ کر لے پاشیرو۔''

بودی کو ہنڈیا سے ڈھکن اٹھاتے دیکھ کر شیر دل نے اب کے سٹپٹاتے ہوئے اس کے منہ پر کس کے ہاتھ جما دیا تھا۔

☆☆☆

''میں کہہ رہا ہوں، واپسی پہ میں نے روٗ (گنے

کارس) پنی ہے۔ ورنہ کل چھٹی کرلوں گا میں۔''

سائیکل پر پیچھے بیٹھے بودی کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور شیر دل کے پیر۔ اسکول لگنے میں پانچ دس منٹ ہی رہ گئے تھے اور یہی ذرا سا وقت ہوتا تھا جب روزینہ اسکول کی پچھلی سائیڈ پر آکر چند باتوں کا یا پھر تحفوں کا تبادلہ کرلیا کرتی تھی۔

اس کے تحفے تحائف تو گلاب کی چند کلیاں، نانی کے ہاتھ کا کڑھا رومال یا پھر دال، چاول کی پنیاں ہوتی تھیں۔ جب کہ شیر دل کے تحائف خاصے ٹکڑے ہوا کرتے تھے۔ عشق معشوقی کی مد میں وہ اب تک سونے کی نتھلی اور بالیاں، شیشے کے کام والے پراندے، کھسے، قیمتی ملبوسات اور میک اپ کا سامان دے چکا تھا۔

یہ سب چیزیں شہر سے لانا شیر دل کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چاچے کمالے کے ساتھ ہر دوسرے دن شہر جاتا تھا۔ خود چاچا بھی چاچی کے لیے بڑا کچھ خریدتا تھا تو اسے بھی ہاتھ روکنے کو نہیں کہتا تھا بلکہ نگاہ چرالیتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ جوان کبھرو بھتیجا کہیں ٹانکا فٹ کیے بیٹھا تھا تو نخرے بھی تو اٹھائے گا نا۔ شیر دل ہر بار روزینہ کو تحفے دے کر وہیں کہیں بیٹھ کر یا کسی درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر لڈو پنیاں کھا کر سرشار سا واپس ہو لیتا۔ اور روزینہ سارا سامان جا کر فخر سے اپنی ساتھی استانیوں کو دکھاتی جو پہلے ہی روزینہ کے شہری ہونے اور ان سے زیادہ پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اس سے خار کھاتی تھیں، مزید جل بھن جاتیں۔ روزینہ چاندی کے بھاری جھمکے اور کھسے، پازیبیں پہن کر سب کے دل مسل کر رکھ دیتی۔

بودی کے اسکول کے باہر سائیکل رکی تو شیر دل نے اسکول کی پچھلی جانب دوڑ لگا دی۔ روزینہ چادر اوڑھے، شیر دل کا ہی لایا سوٹ اور پراندہ چوٹی میں ڈالے آنکھیں کجراری کیے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شیر دل کا جی خوش ہو گیا۔ روزینہ کو اپنے لیے یوں سجا بنا دیکھنا اسے بہت پسند تھا۔ شیر دل نے وہیں ایک طرف سائیکل کھڑی کی۔ ابھی تک روزینہ کی نگاہ اس پر نہیں پڑی تھی۔

وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ روزینہ نے اسے دیکھتے ہی گردن اکڑا کر منہ پھیرا۔ شیر دل کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اس کی یہی ادائیں تو گھائل کرتی تھیں۔

''او میں نے کہا روزی جی۔ سلام علیکم۔''

بڑے دل ربا انداز میں اس نے قریب آ کر لہکتے ہوئے سلام جھاڑا۔ جواباً روزینہ نے ایک بار پھر ہنکارا بھرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

''میری روزی ناراض ہو گئی، لگتا ہے۔ نا کر کرو جی، دل ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتا ہے۔ پہلے ہی بس سے باہر ہو گیا ہے۔''

دل پر ہاتھ رکھ کر جس طرح شیر دل نے نیم وا آنکھوں اور جھکے کندھوں سے کہا تھا اگر بے دیکھ لیتیں تو کلیجہ۔ تھام لیتیں اور اگر ابا جی دیکھ لیتے تو جوتی اتار کر خوب خاطر سیوا کرتے۔۔۔

''آپ کو پتا بھی ہے شیر دل جی کہ میرے پاس بڑا تھوڑا سا وقت ہوتا ہے، اوپر سے اتنا انتظار کراتے ہو جی آپ۔ استانیاں میرا مذاق بناتی ہیں کہ میڈم روزینہ ہی بھاگ بھاگ کر جاتی ہے، شیر دل کو تو پروا ہی نہیں۔''

''لے۔ ایویں پروا ہی نہیں۔ ساری دنیا سے ٹکر لے رکھی ہے شیرونے۔ اپنی روزی سے ملنے کی خاطر۔''

اچھا جی! کون سی والی ٹکر۔ کیا ابا جی کو بتا دیا میرے اور اپنے بارے یا پھر بے بے کو کہہ دیا کہ رشتہ ڈالے آ کر۔ ہونہہ۔ بڑے آئے ٹکر لے لی ہے۔'' وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھلائی۔

''ناراض کیوں ہوتی ہو روزی جی۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے پھر دیکھنا، یہ شیر دل کیسا تر فلاٹ ڈالتا سارے پنڈ میں۔''

''اس سے پہلے کہیں میرے نانا میری شادی کا تر فلاٹ نہ ڈال دیں شیر دل جی۔ ساتھ والے پنڈ سے اکٹھے دو۔ نہیں میرا خیال ہے تین رشتے آئے ہیں میرے۔'' روزینہ کو دو رشتوں سے تسلی نہیں ہوئی تو جھٹ تین بنا دیے یہ اور بات کہ ایک ہی آیا ہوا تھا اور وہ بھی آرائیوں کے لڑکے کا۔ دل سے وہ ابھی نہیں چاہتی تھی کہ شیر دل گھر میں اس کے اور اپنے متعلق کوئی بات

کرے لیکن شیر دل کو سہائے رکھنے میں مزہ تھا۔

''میں ڈکرے (ٹکڑے) نا کردوں گا جو بھی میری روزی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا۔ کتر کر رکھ دوں گا۔ بس فکر نہ کرو، کرتا ہوں آج کل میں بے بے سے بات۔ آ جائے گی رشتہ لے کر مامے رحیم کے پاس۔''

''اچھا۔ تو پھر آج ہی کر ڈالو بات۔ یہ معرکہ بھی آج سر کر ہی لو شیر دل جی۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ شیر دل کے لیے ہرگز ممکن نہیں پھر بھی جتاتے ہوئے بولی۔

''ایں..... وہ..... آج.....''

''بس پڑ گئی نا زبان میں چک۔ آپ نے کر لی شیر دل جی بات اور میں نے کسی اور کی ڈولی چڑھ جانا ہے۔''

''ناراض نہ ہو۔ اس پر بعد میں بات کرتے ہیں۔ پہلے یہ دیکھ تیرے لیے کیا لایا ہوں۔''

شیر دل نے کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر نیفے میں اڑسا ایک ڈبہ نکالا اور روزینہ کی جانب بڑھایا۔

''ہائے میں مری۔'' روزینہ کے حلق سے پرجوش آواز نکلی۔

''موبائل لے کر آئے ہو شیر دل جی۔ میرے واسطے۔ ہائے میں مر جاواں۔ کتنا جی کرتا تھا میرا آپ سے لمبی لمبی باتیں کرنے کو۔ وہ نمبر ابن سڑن جوگی کے پاس ہے موبائل تو روز اسکول میں شوخیاں مارتی ہے۔ وہ تو اس پر فیس بک بھی چلاتی ہے شیر دل جی۔ شہر میں میرے پاس بھی تھا لیکن غصے میں وہیں چھوڑ آئی میں۔''

''فیس بک۔'' شیر دل نے اچنبھے سے دوہرایا۔

''اس کا موبیل پھس پھس نہیں جاتا، فیس بک کے چلنے سے؟''

''ہیں۔'' روزینہ نے حیرانی سے منہ کھولا اور جب بات سمجھ میں آئی تو ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''آئے ہائے۔ آپ بھی کتنے ڈنگر۔ میرا مطلب بھولے ہو شیر دل جی۔'' کلاس کے بچوں کو ہر دوسرے فقرے میں ڈنگر کہہ کہہ کر زبان پر چڑھ چکا تھا۔

''فیس بک ایک ایپ ہے جو موبائل پر کھلتی ہے۔ وہاں بڑی چیزیں آتی ہیں۔ میں آج اپنے موبائل میں کھلوا لوں پھر آپ اپنا میرے پاس لانا تو اس میں بھی کھول دوں گی۔ شہر میں تھی تو ہر وقت فیس بک پر ہی ہوتی تھی میں، سارا دن سیلفیاں ڈالتی تھی اس پر۔''

وہ کہے جا رہی تھی اور شیر دل خفت سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے پاس کب سے موبائل تھا۔ وہ بھی نچ۔ چاچے کمالے نے لے کر دیا تھا مگر اس نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ اس کے کمرے کی الماری میں پڑا ہے یا بے بے کی پیٹیوں والے کمرے کی پرچھتی پر۔

پنڈ میں بہت سے لڑکوں کے پاس موبائل تھے مگر پھر بھی اس کا دھیان اس کے استعمال کی جانب نہیں آیا تھا۔ اب روزینہ نے موبائل کی فرمائش کی تو اس کے لیے شہر سے یہ سوچ کر لایا تھا کہ اپنا بھی نکال لے گا اور لمبی لمبی باتیں کیا کرے گا۔ اور مگر اب اسے اپنی کم علمی پر شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ وہ مرد تھا اسے روزینہ سے پہلے فیس بک پڑھ لینی چاہیے تھا۔

روزینہ اس سے تیز تیز باتیں کیے جا رہی تھی اور وہ دماغ لڑا رہا تھا کہ موبائل۔ بھلا گھر کے کس کونے کھدرے میں پڑا ہوگا۔

☆☆☆

''کٹ کٹ کٹ..... کٹ کٹ۔''

مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ اماں نے اسے چھت پر بھیجا تھا کہ ساری مرغیاں اور چوزے ڈربے میں کر آئے۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو اکٹھا کر رہی تھی۔ کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا بائیس تئیس مرغیاں اور چوزے ڈربے میں گھسانا مگر اس کا یہ دل پسند مشغلہ تھا۔ اماں فجر کے اور عصر کے بعد چھت پر مرغیاں کھلی چھوڑ دیتی تھی اور رکھوالی کے لیے وہیں بیٹھ رہتی یا کسی کو بٹھا دیتی تھی۔ بلیوں کا ہر دم خطرہ رہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے چوزے تو چیل بھی اچک کر لے جاتی تھی۔ وہ اپنی کتابیں لے کر چھت پر چڑھ جاتی اور پھر مغرب کی اذانوں کے ساتھ اترا کرتی تھی۔

''ہش..... ہشش..... اے نغمہ..... ششش.....'' کسی کی مسلسل ہشکار پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو شیر دل اپنی چھت کی منڈیر

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

سے لگا اسے ہی بلا رہا تھا۔ وہ فوراً ہاتھ میں تھامی مرغی ڈربے میں گھسا کر ہاتھ جھاڑتی اس کے قریب آئی۔

''آج بڑے دن بعد نظر آیا ہے تو شیر دل۔ کدھر ہوتا ہے۔ لگتا ہے میاں جی تجھے کھیتوں پر لگائے رکھتے ہیں۔'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

''شیرو بھلا جاتا ہے کھیتوں پر۔'' ''حسب معمول بھڑک ماری۔'' وہ تو میں ذرا بودی کی پڑھائی کی طرف دھیان دے رہا ہوں اج کل۔ ورنہ مجھے اور بڑے آر (کام) ہیں۔''

''آہو۔ پتا ہے مجھے تیرے، آر کا۔ اسکول کے پچھلے پاسے اکثر تو اپنے آر کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ طنز کر بیٹھی۔ وہ شیر دل کی راز دار تھی۔ اس کے یکدم کہنے پر وہ کھسیا گیا مگر پھر فوراً ہی لہجہ روکھا کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھ نغمہ۔ میرے ساتھ لاویاں (طنزیہ) نا کیا کر۔ مجھے پتا بھی ہے مجھے غصہ چڑھتا ہے۔ اور شیرو کو بھلا پروا کس کی ہے، کوئی دیکھتا ہے تو دیکھ لے۔ اب عنقریب سب کو پتا لگ ہی جانا ہے۔''

''لگ جانا نہیں، لگ چکا۔ بہتیروں نے دیکھ بھی لیا تم دونوں کو لک چھپ کے ملتے۔ بھلا ملنا ہی ہے تو اچھی تھاں (جگہ) تو دیکھو۔ نکے نکے بچے اپنی استانی کو دیکھتے ہوں گے تو کیا سوچتے ہوں گے۔ شیر دل بچے کا ذہن کچا ہوتا ہے، جس چیز کا نقش بیٹھ جائے، اس کا اثر لے لیتا ہے۔''

''میں چلتا ہوں۔''

وہ ناراضی سے مڑا تو نغمہ نے فوراً پکارا۔

''ہالا ہالا۔ اب نہیں بولتی۔ چھیتی بول کیا کرنے آیا تھا۔ اماں اڈیک (منتظر) رہی ہونی ہے نیچے مجھے۔''

''اے نغمہ۔ یہ دیکھ۔'' وہ پر جوش سا اپنے کرتے کی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے بولا۔ ''اس میں سے مجھے وہ نکال کر دے جس پر منہ بنا ہوتا ہے۔''

''منہ بنا ہوتا ہے۔'' نغمہ نے حیرانی سے آخری فقرہ دہرایا۔ ''ایسی تو کوئی شے نہیں شیرو۔''

''ہوتی ہے پاغلے۔ روزی کہہ رہی تھی۔ مطلب روزینہ کہہ رہی تھی کہ اس میں بڑی چیزیں آتی ہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی کھولے تو پھر مجھے بھی کھول دے گی مجھے اس سے پہلے ہی کھولنا ہے وہ.....''

''آئے ہائے شیر دل۔'' نغمہ نے پیشانی پر ہاتھ مار کر اس کی عقل کو سراہا۔

''تیری بھی مت پوری پوری ہے۔ اسے فیس بک کہتے ہیں۔ باسط پائین کے موبائل پر بھی ہے اس کے لیے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولنا پڑتا ہے اب میرے پاس تو ہے نہیں موبائل ورنہ سمجھا دیتی۔ ایسا کر کہ جا باسط پائین کے پاس اور ان سے سیکھ لے کہ کیسے بناتے ہیں سوکھا (آسان) ہے بس اک بار سمجھ میں آجائے۔''

''ہالا۔ میں جاتا ہوں پھر۔ ڈیرے پر ہی ہوگا پا باسط۔ ابھی جاتا ہوں۔ رات تک میں ساری دیکھ لوں گا۔ سویرے تو دیکھنا، میں خود بتاؤں گا روزینہ کو کہ کیسے کھولتے اسے۔''

وہ موبائل جلدی سے جیب میں ڈالتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا چھت سے نیچے جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ نغمہ کا چہرہ پل بھر کو تاریک ہوا مگر پھر کندھے اچکا کر پلٹنے لگی تو کچھ یاد آنے پر واپس منڈیر تک آئی۔ پر اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شیر دل جا چکا تھا۔

''ستیاناس۔ میں تو بتانا ہی بھول گئی کہ آج باسط پائین نے اسے اسکول کے باہر استانی کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ لے بھئی کھائے گا جوتے اب یہ۔''

وہ تاسف سے سر مارتی نیچے اترنے کی غرض سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ باسط اس کا بڑا بھائی تھا اور لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ باورچی خانے میں آگ گیس کا چولہا جلا کر اس پر توا رکھتے ہوئے بھی وہ مسلسل شیر دل کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

منڈی بہاؤالدین سے آگے اس گاؤں کی بود و باش آج بھی سادہ طرز کی تھی۔ بجلی کی سہولت تو پرانی تھی مگر گیس کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں آئی تھی۔ اس کے

باوجود عورتیں مٹی کے چولہوں پر لکڑیاں جلا کر یا اپلے جلا کر کھانا پکانے کو ترجیح دیتی تھیں۔ گیس سے اجنبیت ہنوز قائم تھی۔ لڑکیاں بالیاں تو حوصلہ کر لیتی تھیں کیونکہ لکڑیاں جلانے میں دھوئیں سے جو حشر ہوتا تھا، اس سے بچت ہو جاتی تھی۔ ڈائجسٹوں کی بدولت اپنا خیال رکھنے کا شعور آ گیا تھا لیکن درمیانی اور بڑی عمر کی عورتوں کے لیے گیس کا چولہا بم سے مشابہ تھا۔

لوگوں نے باقاعدہ باورچی خانے بنوا لیے تھے مگر پرچھتی کے نیچے مٹی کا چولہا بھی قائم تھا۔ شیر دل کی حویلی میں بھی یہ بڑے بڑے کمرے تھے اور باورچی خانہ بھی تھا مگر بے بے کو جو مزہ برآمدہ پار کر کے چوبارے کے نیچے بنے مٹی سے لیپ کیے چولہے پر لکڑیوں کا بالن جلا کر پکانے میں آتا تھا وہ اندر باورچی خانے میں فٹ گیس کے چولہے پر نہیں تھا۔ ڈر بے بے کو بھی لگتا تھا اس چولہے سے مگر شیر دل سے جلوا کر پکا لیتی تھیں۔ جب کہ خود گیس کے چولہے کا پکا نہیں کھاتی تھیں کہ اس میں کچا پن محسوس ہوتا تھا اسے۔

شیر دل کی خاطر چوہدری حق نواز نے حویلی میں بہت تبدیلیاں کروائی تھیں۔ دکھاتے نہیں تھے مگر لاڈ تو بہرحال اٹھاتے تھے۔ ہر سہولت گھر میں موجود تھی سوائے ٹی وی کے۔ انہیں بہت خار تھی اس سے۔ شیر دل نے بہتیری ضد کی تھی مگر چوہدری صاحب مان کر نہیں دیے۔ جب ٹی وی نہیں تھا تو ڈش کیبل کا کیا سوال، تب ہی انٹرنیٹ کی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ اسی لیے جب اس نے موبائل لیا تو نغمہ سے کہہ کر ان کے گھر کے انٹرنیٹ کا پاس ورڈ فیڈ کروا لیا۔ نغمہ کے ہاں سب ہی کچھ تھا۔ بھرا پرا بھابیوں والا گھر تھا اس لیے کیبل کی تفریح موجود تھی کیونکہ نغمہ کے بھائی گھر کی عورتوں کے ذاتی موبائل رکھنے کے حق میں نہیں تھے، اس لیے کچھ مان کر اور کچھ منوا کر گھر کا نظام اچھا چل رہا تھا۔

نغمہ نے پرائیوٹ ایف اے کیا تھا اور اب آگے بھی پرائیویٹ ہی پڑھ رہی تھی۔ گھر بھر میں سیانی مانی جاتی تھی۔ بھائی، بھابیاں ہر بات میں اس سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال اس نے بھی نہیں کیا تھا۔ شیر دل اس کے بچپن کا سنگی ساتھی تھا۔ دونوں گھروں میں رشتے داری تھی، اس لیے کسی بھی وقت کوئی بھی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چلا آتا تھا۔ بچپن بیتا اور جوانی آئی تو نغمہ اور شیر دل کی دوستی میں ان دیکھا سا تکلف آ گیا۔ اب نغمہ سب کے بیچ اس سے ہنسی مذاق نہیں کیا کرتی تھی۔ جب کہ شیر دل کے لیے آج بھی اپنی ہر بات سب سے پہلے اس کے گوش گزار کرنی لازم تھی۔

جب نغمہ نے سب کے سامنے کترانا شروع کر دیا تو وہ اسے چھت پر جا لیتا جہاں کوٹھری کی دیوار سے چارپائی لگائے وہ اکثر پڑھائی کرتی دکھائی دیتی۔

دن بھر کی اوٹ پٹانگ رودادوں سے ہوتے ہوتے ایک دن وہ بھی آیا جب شیر دل نے روزینہ کے ساتھ چلتے اپنے ''سچے اور کھرے'' پیار کی بھی اسے اطلاع دی۔ نغمہ نے پہلے پہل اس کی باتیں غیر سنجیدگی سے سنی تھیں مگر پھر جب اس کا دیوانہ پن روزینہ کے لیے بڑھتا چلا گیا تو اسے دھیان بھی دینا پڑا اور نہ چاہتے ہوئے مشورے بھی۔ بچپن سے اسے مشورے دیتی آئی تھی مگر بچپن بیت چکا تھا، جوانی چڑھ آئی تھی۔ جذبات، خیالات، حالات سب بدل گئے مگر شیر دل کا بچپنا نہ گیا۔ وہ آج بھی سارے پنڈ کا لاڈلا تھا۔ سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔

چوہدری حق نواز کی دو اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا شیراز بہت ہی سمجھ دار اور تابع دار تھا جیسے چوہدری صاحب نے چاہا وہ اس نے کیا۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر زمینوں پر ہی لگ گیا۔ محنتی بھی بلا کا تھا اور چست بھی خوب تھا۔ چھوٹا کمال اس سے بالکل الٹ۔ نہ پڑھائی میں چلا اور نہ کام میں دل لگاتا۔ بھائی کے سر پر موج کرتا تھا۔

شیراز چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے پردہ پوشی کرتا اور اس کی حرکتیں چوہدری صاحب کی نگاہوں میں آنے سے بچا لیتا۔ اسی کا فائدہ کمالا اٹھاتا اور مزید سست ہوتا چلا گیا۔

بے بے نے بیس برس کی عمر میں شیراز کا بیاہ کر دیا۔ اپنے ہی میکے سے بھتیجی لے کر آئی تھیں۔ خوش باش تھے دونوں۔ چھ مہینے گزرے اور شیراز کو گردن توڑ بخار نگل گیا۔ بیوی امید سے تھی، بستر سے لگ گئی۔ بے بے اور چوہدری صاحب کی کمر ٹوٹ گئی۔ کمالا الگ گم صم رہنے لگا۔ باپ جیسی شفقت کرنے والا بھائی تھا شیراز جو یک دم چٹ پٹ ہوا تو یقین ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مرنے نے کمالے کی طبیعت میں قدرے سدھار پیدا کر دیا۔ باپ کے جھکے کندھے اسے بھی افسردہ کرتے اور اب وہ سنجیدگی سے کام کی طرف دھیان دینے لگا تھا۔

زندگی ابھی معمول پر بھی نہ آسکی تھی کہ شیراز کی بیوی بیٹے کی پیدائش کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔ یہ دھچکا بھی بڑا شدید تھا مگر شیر دل کی وجہ سے بے بے نے خود کو سنبھالا اور شیر دل کی معصوم صورت نے باقی گھر والوں کو سمیٹ لیا۔ بے بے کے لیے شیراز ایک بار پھر سے ننھا کا بن کر آ گیا تھا۔ جی جان سے اسے پالنے لگی۔

شیر دل نے نہ ماں دیکھی تھی نہ باپ، اس لیے دادا ہی اس کے ابا جی تھے اور دادی اس کی بے بے۔ پنڈ والوں کے لیے وہ شیر دل سے لاڈلا شیرو ہو گیا۔ ہو بہو باپ ہی کا عکس تھا۔ اونچا لمبا اور صاف رنگت والا۔ بس ایک عادت چاچے کی بھی اپنالی اور وہ یہی کہ نہ پڑھائی کی جانب دھیان دیا نہ کام کاج میں جی لگتا تھا۔

رو پیٹ کر دس جماعتیں پاس کی تھیں تو چوہدری صاحب نے زبردستی شہر کے کالج میں داخلہ کروا دیا۔ رو پیٹ کر دو سال ہوسٹل میں نکالے اور ایف اے میں فیل ہو کر آ گیا واپس۔ گھر کے آرام دہ ماحول اور پنڈ کی کھلی فضاؤں میں پلنے والا شیر دل اتنی تنگی میں کہاں رہ سکتا تھا۔

چوہدری صاحب نے خوب واویلا کیا، اسے دھمکایا مگر بے بے آڑے آ گئیں۔ بن ماں باپ کا بچہ تھا۔ پھپھولا بنا کر پالا تھا۔ اب بھی شوہر کے آگے ڈٹ گئیں۔ مجبوراً چوہدری صاحب کو ماننی پڑی مگر اس شرط پر کہ شیر دل پرائیویٹ پڑھے گا۔ دوبارہ مزید کوشش کر کے بھی شیر دل ایف اے پاس نہ کر سکا۔

صبح سے شام تک یار دوستوں میں لگا رہتا اور شام کو چھت پر پتنگیں اڑاتا اور اپنی چھت پر پڑھتی نغمہ کا سر کھاتا۔ چوہدری صاحب کے سامنے بے بے پردے ڈالے رکھتیں جیسے پہلے کمالے کے ڈالے رکھتی تھیں۔ عرصہ ہوا کمالے کے بھی پرانے لچھن لوٹ آئے تھے۔ زمینوں کا رخ خال خال ہی کیا کرتا۔

بے بے کو یہی بہتر حل نظر آیا کہ اس کی شادی کر دے۔ سسرالی رشتے داروں کی بیٹی تھی فریدہ۔ شیراز کی بیوی اپنے میکے سے لائی تھیں اب کے سسرال سے لا کر حساب برابر کر دیا۔ شروع کا عرصہ نئی نویلی دلہن کے چاؤ گھر بھرنے اٹھائے۔ شیرو بھی چاچی کے آس پاس منڈلاتا۔ باتیں کر کے چاچی کا جی لگانے کی کوشش کرتا۔ کمالے کی تو پہلے دن سے سدھ بدھ فریدہ کے پاس گروی رکھی گئی تھی۔ اس نے زن مریدی کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ فریدہ کی صبح کے ساتھ اس کی صبح ہوتی اور رات کے ساتھ رات ڈھل جاتی۔ ایک فریدہ نے کمالے کو انگلیوں پر پرو رکھا تھا جیسے چاہتی ہلاتی اور چلاتی۔

چوہدری صاحب بیٹے کے کس بل ڈھیلے ہوتے دیکھ رہے تھے اور خود دن بہ دن کمزور ہو رہے تھے۔ اب ان میں ہمت نہیں تھی مزید سہنے کی۔ کمالے کو پہلے بھی وہ شیراز کی زندگی میں بھگت چکے تھے۔ وہ فطرتاً سہل پسند تھا اور پکی پکائی کھانے کا شوقین۔ ایسے میں چوہدری صاحب نے اسے الگ کر دیا۔ یہی سوچ کر کہ سر پر پڑے گی تو ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔

فریدہ کی تو چاندی ہو گئی۔ اسے شادی ہوتے ہی الگ گھر بھی مل گیا اور میاں بھی مکمل ہاتھوں میں آ گیا۔ مگر کمالے کو ہوش کے ناخن لینے پڑے جب چوہدری صاحب نے بنا ہڈیاں کھڑکائے خرچا پانی دینے سے انکار کر دیا۔

بدرالزمان کی پیدائش کے بعد مارے باندھے جیسے بھی کمالے کو باپ کے ساتھ کام پر لگنا پڑا۔ اب

روز منہ اندھیرے ہی اٹھ کر کھیتوں کا رخ کرتا تھا مگر فریدہ کے سکون و آرام میں خلل آج تک نہ آنے دیا تھا۔ بدرالزمان عرف بودی بھی آدھی پونی بے بے کی ذمہ داری ہوگیا۔

وقت اپنے حساب سے گزرنے لگا تھا۔ شیر دل اب گبھرو جوان ہوگیا تھا۔ پنڈ کی لڑکیاں ہو کے بھرنے لگی تھیں اسے دیکھ کر۔ ایک تو سوہنا اوپر سے پنڈ کے وڈے چوہدری صاحب کا پوتا۔ پورے پنڈ کی مائیں اس کی ماسی بنی پھرتی تھیں۔ بے بے کا دل بھی اس کا بیاہ کرنے کو مچلنے لگا تھا۔ مگر شیر دل کسی کام دھندے سے لگتا تب نا۔ چوہدری صاحب کی اس کے لیے بھی وہی شرط تھی جو کمالے کے لیے تھی۔

بے بے کی نگاہ تو شروع سے ہی نغمہ پر ٹھہری ہوئی تھی اور یہ بات بے بے نے نغمہ کی دادی کو اشارے کنائے میں کہہ رکھی تھی مگر یہاں آکر شیر دل نے اندر خانے روزینہ کے ساتھ ڈورے اٹکا لیے تھے۔ اس معاملے کی اب تک تو نغمہ رازدار تھی مگر شیر دل کی لاپروائی اور روزینہ کے شوخے پن نے بات کھول دی تھی۔ بے فکری سے ملنا ملانا پنڈ والوں کی نگاہوں میں آ ہی چکا تھا اور باسط جو کہ نغمہ کا منجھلا بھائی تھا، اس کے دیکھ لینے کے بعد تو کچھ بھی چھپا نہیں رہ گیا تھا۔ باسط کی شیر دل سے دوستی بھی تھی مگر بڑے ہونے کے ناتے وہ اس کا ادب بھی کرتا تھا۔ شومئی قدمت فیس بک کا اکاؤنٹ کھلوانے وہ اسی کے پاس ڈیرے پر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کچی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ کاش موبائل کو بے کار جان کر پھینک نہ رکھا ہوتا تو اب تک اسے بھی کتنا کچھ پتا ہوتا۔ کل کیسے روزینہ کی انگلیاں پھرتی سے اسکرین پر چل رہی تھیں اور وہ نا جانے کیا کیا کھول کر اسے دکھاتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی بچہ بچونگڑا ہو۔

پنڈ کا تھا، مردانگی جثے سے زیادہ دماغ میں بھری ہوئی تھی اسی لیے یہ برداشت کرنا ذرا مشکل تھا۔ ان ہی خیالوں میں وہ موبائل پر انگلی پھیرتا چلا جا رہا تھا جب سامنے سے آتی زنانہ آوازوں پر ایک دم ٹھہرا۔ دو لڑکیاں نئے فیشن کے کپڑے پہنے، آنکھوں پر کالی عینکیں چڑھائے، بالوں کو برائے نام تھوڑا تھوڑا سا دوپٹے سے ڈھکے ہاتھوں میں چھوٹے سائز کے سفری بیگ لیے چلی آ رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے ہلکی آواز میں باتوں کے ساتھ ہنسی بھی فضا کی نذر ہو رہی تھی۔

شیر دل ایک پل کو ٹھٹکا اور گردن کو جھٹکا دے کر سینہ اونچا کیا اور موبائل کان سے لگا کر دوسرے ہاتھ کو بالوں میں پھیر کر ان کے قریب آنے تک وہ آدھا پاکستان خرید چکا تھا۔

''اونیئں جی نیئں۔ جب ایک بار سودا ہو گیا تو شیر دل کبھی نہیں مکرتا۔ اب تو چم (کھال) بیچ دوں گا کام منداں نہیں ہونے دوں گا۔ دس لاکھ ایڈوانس ایویں تو نیئں دے آیا تھا جی میں۔''

دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنی مار کر شیر دل کو دیکھا اور پھر آنکھوں سے کوئی اشارہ کرتی وہیں کھڑی ہوگئیں۔

''وہ جی بات سنیں پلیز۔'' پاس سے بس گزرنے ہی والے شیر دل کو انہوں نے پکارا تو موبائل ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

''لے دیں۔ میرا دل بند کرانا ہے انہوں نے۔ پلیز تو پوری حیاتی میں نہ کہا مجھے کسی نے۔ صرف پڑھا ہی ہے بس۔'' وہ دل میں خود سے کہتا رک کر ان کی شکل دیکھنے لگا۔

''وہ جی ہم نے چوہدری رحیم داد کے گھر جانا ہے۔ ان کی جو نواسی ہے نا روزینہ۔ وہ ہماری کزن ہے۔ ہمارے چاچے کی بیٹی ہے وہ۔'' ان میں سے ایک نے خوانخواہ اپنی انگلی دانتوں میں دے کر اسے بتایا۔

''اووووووو..... اپنی روزی..... میرا مطلب ہے روزینہ میڈم۔ اچھا جی اچھا۔ مامے رحیم کا گھر تو جی اپنا ہی گھر سمجھو آپ۔ یہ شڑک (سڑک) سیدھی ٹُرتی (چلتی) جائیں جی آپ۔'' وہ انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹُرتی جائیں ٹُرتی

جائیں، اگے جی ایک پوسٹ آفس آئے گا۔ وہیں سے کھبے (بائیں) ہو جائیں۔ پھر سیدھا ٹرنی جائیں، ٹرنی جائیں تے سجے (دائیں) پاسے ہو جانا۔ بس جی ذرا سا ہور ٹرنی جائیں گی تو ناک کی سیدھ میں جو نیلا گیٹ آئے گا نا، وہ مائے رحیم کا گھار ہے جی۔'' گلابی اردو میں انہیں سمجھاتا وہ خود کو بہت معتبر سمجھ رہا تھا۔ دو شہری لڑکیاں اس سے پتا پوچھ رہی تھیں، چھوٹی بات تھی بھلا۔

''بہت مہربانی جی آپ کی۔ اب باقی ہم چلی جائیں گی۔ روزینہ سے آپ کی تعریف ضرور کریں گی ہم کہ اس کے پنڈ کے لوگ کتنے ملنسار اور مددگار ہیں جی۔''

''اوہ۔ وہ جی بس۔ روزینہ میڈم تو پہلے ہی بڑی قدر کرتی ہیں میری۔ آپ چلو جی اگے اگے۔ اگر کہو تو میں آپ کو چھڈ (چھوڑ) بھی آتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہم چلی جائیں گی۔ بہت شکریہ۔ آپ اپنے موبائل پر بات کرلو جی۔ تب سے کال چل رہی ہے آپ کی۔'' ان میں سے ایک اسے جتاتی ہوئی بولی تو اس نے بے ساختہ موبائل دیکھا جس کی سیاہ اسکرین اس کے بند ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ وہ دونوں اپنے ہاتھ میں تھامے بیگ لیے آگے چل دیں۔ کچھ فاصلے پر موڑ مڑنے سے پہلے دونوں نے پلٹ کر شیر دل کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دیں۔ شیر دل کو لگا اس نے میدان مار لیا ہے۔

''ہائے اوئے۔ مر گئیں شیر دمر گئیں۔''

وہ ہواؤں میں اڑتا باسط کے ڈیرے کی اور چل پڑا۔ باسط صبح سے شام تک وہیں ہوتا تھا۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، منگنی ہو چکی تھی۔ مگر خاصا بردبار اور مدبر مشہور تھا۔ ڈیرے پر یار دوستوں کا جمگھٹا لگائے رکھنے سے گریز کرتا تھا اور فراغت میں اکیلا رہنا پسند کرتا تھا۔ شیر دل شہری لڑکیوں سے ملاقات کا مزہ لیتا ٹہلتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ چارپائی پر چت لیٹا آنکھوں پر بازو رکھے باسط سیف الملوک گا رہا تھا۔ آواز بے سری مگر تان اونچی تھی۔ شیر دل نے کان میں انگلی گھما کر اس کی گونجدار آواز کا اثر زائل کیا اور گلا کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ وہاں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے اب کے آواز دی۔

''پائین۔ باسط پائین۔ کیا ہو رہا ہے؟''

باسط چونک کر خاموش ہوا پھر یک دم اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور شیر دل کو دیکھ کر بھنویں سکوڑیں۔ وہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو شیر دل بھی بے تکلفی سے چارپائی کی پائینتی ٹک گیا۔

''کیا حال ہے پائین۔ اک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کردو گے۔''

''ویر میرے۔ تیرے تو اج کل سارے کام ہی ضروری ہیں۔ مجھے اندازہ ہے۔'' باسط نے اس کے کندھے پر دو ہلکے ہاتھ کے دیئے مارتے ہوئے کہا۔

''بس پائین۔ ابا جی کے ساتھ سارا دن ہاتھ بٹاتا ہوں۔ یا چاچے کمالے کے ساتھ شہر چلا جاتا ہوں۔ اور کیا ضروری کام ہونے ہیں۔'' شیر دل نے کمال متانت سے جواب دیا۔ ''اچھا یہ دیکھو ذرا باسط پائین۔ یہ میرا موبائل ہے۔ کب کا بیکار پڑا ہوا تھا۔''

''تو میرے لیے لایا ہے؟'' باسط نے بات کاٹ کر بے ساختہ پوچھا۔

''نہیں نہیں پائین۔ آپ سے اچھا موبیل تو نہیں ہو سکتا نا۔ لیکن یہ ذرا پرانا شرانا ہو گیا ہے۔ آپ کو تو نیا نکور تحفے میں دے دیں گے۔ کیا یاد کرو گے آپ۔''

''جیسا روزینہ استانی کو دیا ہے۔''

باسط نے یوں اچانک کھاتہ کھولا تھا کہ شیر دل کو تھوک نگل کر گلا تر کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ وہ ہکا بکا سا منہ دیکھنے لگا۔ اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے کا سارا اعتماد اڑ چھو ہو چکا تھا۔

''کک..... کیا مطلب ہے پائین۔ روزینہ میڈم کا بھلا کیا ذکر یہاں۔ اور میں کیوں دینے لگا اسے موبائل۔''

''یہ تو تجھے پتا ہو گا شہزادے کہ اسے موبیل کیوں دیا۔ میں نے تو بس تجھے اسکول کے پچھلے پاسے چھپ کر اسے دیتے دیکھا ہے۔ میں تو بڑا بھولا بھالا سمجھتا تھا تجھے پر تُو خاصا سیانا نکلا۔''

''او پائین! وہ موبیل میں نے نہیں دیا پائین۔ اس کا اپنا موبیل تھا۔ خراب ہوگیا تھا تو بودی کے ہاتھ بھجوایا تھا کہ شہر سے ٹھیک کروا کے لا دوں۔ بس پائین وہی دیا تھا واپس۔ ورنہ میرا چکی کے نیچے ہاتھ آیا ہوا ہے جو نیا موبائل ایویں منہ اٹھا کے دے دوں۔''

''نہ کاکا۔ ہاتھ تیرا نہیں، تایا حق نواز کا آیا ہوا ہے جو ایویں منہ اٹھا کے تو اس کی کمائی کڑیوں اڑا رہا ہے۔''

برا پھنسا تھا شیر دل۔ فیس بک کا اکاؤنٹ کھلوانے آیا تھا یہاں باسط نے دوسرا ہی اکاؤنٹ کھول دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اور روزینہ کی بات اتنی پھیل گئی ہے۔ اگر ابا جی کو پتا چلا تو؟ اس کے آگے اس کی سوچ بل کھا گئی۔ ''ابا جی نے میری ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دینی ہے۔'' وہ دل میں بڑبڑایا اور اٹھنے کا قصد کیا۔

''وہ پائین۔ میں آپ کو پھر ملوں گا۔ مجھے یاد آیا کہ ابا جی نے اس وقت مجھے کھیتوں میں پانی لگانے کا کہا تھا۔ چاچا کمالا بھی میری راہ تک رہا ہو گا۔ میں پھر آؤں گا۔''

''بیٹھ جا۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ یہ موبیل پر کیا دکھانے لایا تھا۔ اب آیا ہے تو دکھاتا ہوا جا۔''

''کھڈے میں گیا موبیل۔'' اس نے مدھم آواز میں خود کلامی کی۔

''او کچھ نہیں پائین۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ موبیل تو چلتا بھی رورو کے ہے۔ آپ کیا دیکھو گے اس میں۔ میں پھر ملا تو دکھا دوں گا۔ چلتا ہوں۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ باسط نے پیچھے سے ایک دو آوازیں بھی دیں مگر وہ ان سنی کر گیا۔ اسے نئی فکر نے گھیر لیا تھا۔ اگر باسط نے کسی کو بتا دیا تو کیا بنے گا۔ روزینہ نے قسم دی تھی کہ جب تک وہ خود بے بے کو اس کے بارے میں بتا نہیں دیتا تب تک ان دونوں کی محبت کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر بات نکل گئی تو وہ لازمی اس سے ناراض ہو جائے گی۔ موبائل کو غصے سے دیکھ کر جیب میں ڈالتا وہ تیز قدموں سے گھر جا رہا تھا۔

☆☆☆

بوہڑ (برگد) کے درخت کے نیچے نسوانی قہقہوں کی گونج تھی۔ روزینہ ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی اور شیر دل کے نتھنے پھولتے پچکتے اس کے ضبط کا پتا دے رہے تھے۔ اس کا موبائل روزینہ کے ہاتھ میں تھا اور وہ اب منہ پر ہاتھ رکھ کر موبائل کو الٹ پلٹ رہی تھی۔

''تو نے اس طرح ہی ہنستے رہنا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ پہلے ہی میرا دماغ بڑا تپا ہوا ہے۔ سمجھی۔''

''ناراض نہ ہو۔ کل تو بڑی شوخیاں مار رہے تھے کہ میں کرلوں گا۔ مجھے سب پتا ہے۔ آ گئے نا لائن پر۔ اب بولو شیر دل جی۔ بناؤں اکاؤنٹ فیس بک پر؟''

''نا تو اور کیا تو تیاں واجے (بینڈ باجے) بجا رہا ہوں اتنی دیر سے۔ دیکھ روزی میں بڑا پریشان ہوں۔''

''کیوں۔ اکاؤنٹ نہیں بنانا آیا اس لیے؟''

''روزی۔'' اس نے گھرکتے ہوئے آخری وارننگ دی۔

''اچھا اچھا۔ بناتی ہوں۔ لیکن ایک شرط پر۔ مجھے آج کال نہ کرنا۔ وہ میری کزنیں آئی ہیں شہر سے۔ ہیں تو پینڈو سی مگر بنتی بہت تیز ہیں۔ انہوں نے کال پکڑ لی نا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔۔ واپس جا کر بھائیوں کو بتائیں گی اور سمجھو پھر چھٹی۔ لے جائیں گے آ کر مجھے وہ۔''

شیر دل کے دماغ کے پردے پر کل والی دونوں لڑکیوں کا عکس لہرایا تو اس نے چور نظروں سے روزینہ کو دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ویسے یہ جو کزنیں ہیں تیری۔ کہہ تو نہیں رہی تھیں کل تجھ سے۔''

''نہیں۔ کچھ خاص نہیں۔ بس اتنا بتایا تھا کہ انہیں جس نے گھر کا پتا بتایا تھا اس سے کی بو آ رہی تھی۔'' روزینہ موبائل میں مصروف تھی اور اسی مصروفیت میں جواب دیا۔

شیر دل یک دم سٹپٹایا اور نگاہ بچا کر خود کو سونگھا۔ ایسا لگا جیسے باڑے میں گھس گیا ہو۔ سردیوں میں نہانے کا وہ ہمیشہ سے چور رہا تھا۔ اور آرام سے تین چار دن نکال لیا کرتا تھا۔

''آج تو گھر جا کر فوراً ہی نہاؤں گا۔ کبھی کوئی پرونا ہی ٹکرا جاتا ہے۔'' دل میں مصمم ارادہ کرتے وہ روزینہ کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ نا جانے کیا کیا کرنے لگی ہوئی تھی۔

''یہ لو شیر دل جی۔'' روزینہ نے موبائل اس کی جانب بڑھایا۔ ''اب آہستہ آہستہ سمجھا دوں گی کہ اس میں کیا کیا کرتے ہیں۔ ابھی بس ایک دو چیزیں سمجھ لو۔ آپ کا پاس ورڈ ہے ''روزینہ''!''

وہ اترائی۔ شیر دل نے نثار ہوتی نگاہوں سے دیکھا۔

''وہ تو دل پر لکھا ہے شہزادی۔''

''وہاں سے نقل کر کے ادھر بھی لکھ لینا آپ شیر دل جی۔''

اب وہ اسے فیس بک کھول کر کچھ چیدہ چیدہ باتیں سمجھا رہی تھی۔ اور شیر دل کا دھیان یہاں وہاں گردش کر رہا تھا۔

''دیکھو شیر دل جی۔ آج کل لوگ جو بھی کرتے ہیں، جہاں بھی جاتے ہیں جو بھی کھاتے ہیں سب کی تصویریں فیس بک پر ڈال دیتے ہیں۔ چاہے کسی کو پسند ہو نا ہو۔ اپنا شوق پورا لازمی کرتے ہیں۔''

''یعنی سب کچھ پھینک دیا کروں اس پر۔ کچھ بھی۔''

''آہو۔ کچھ بھی۔ اب میں چلتی ہوں۔ گھر مہمان ہیں۔ باتیں بنائیں گی دونوں۔''

وہ فوراً اٹھ کر چلتی بنی تو شیر دل نے بھی موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے گھر جانے کا قصد کیا۔ یہ محسوس کیے بنا کہ آج روزینہ کے انداز میں بہت عجلت تھی۔

☆☆☆

چوہدری حق نواز گھر آئے تو صحن کے بیچوں بیچ چارپائی پر شیر دل کے خراٹے گونج رہے تھے۔ نہایا دھویا وہ سوتے میں بھی تر و تازہ لگ رہا تھا۔ چوہدری صاحب نے سر مارتے ہوئے اسے اونچی آواز میں پکارا تو وہ کسمسا کر آنکھیں کھولتا اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا۔ آپ بھی نا۔ ابھی بے چارہ نہا کے سویا تھا۔ بچی نیند سے اٹھا دیا اسے۔ کبھی آرام بھی کرنے دیا کریں اسے۔''

''او۔ او موٹی عقلے۔ اس کے ساتھ کے افسر لگ گئے اور یہ ابھی تک مجھی سے لگا ہوا ہے۔''

''ابا جی۔ میرے خاب (خواب) بڑے ہیں تو نیند بھی لمبی لینی پڑتی ہے۔'' شیر دل جماہی لیتا ہوا بولا۔

''کبھی کبھار تو تُو مجھے شیراز کا منڈا لگتا ہی نہیں۔ کمالے والی عادتیں ہیں تیری۔''

''اور آپ بھی مجھے اپنے دووووور کے ابا جی لگتے ہیں۔'' اس نے شرارتاً انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو چوہدری صاحب نے ہاتھ جوتے کی جانب بڑھایا۔

''مطلب۔ بیچ میں میرے ابا اور چاچا کمالا بھی تو پڑتے ہیں نا۔'' اس نے انہیں جوتی اٹھاتا دیکھ کر فوراً صفائی دی۔

''بندہ بن جا شیرو۔ تجھے دھی نہیں دینی کسی نے۔''

''تو آپ اپنا پوتا دے دینا ابا جی۔ کوئی دھی والا لے لے گا۔''

''ناخیری صلا۔'' بے بے کے دل پر ہاتھ پڑا۔

''میں تو تیری نُوندر (ناخن) نہ دوں کسی کو۔ اور اپنے ابا جی کی بات دھیان سے سن میرا پتر۔ کل۔ کو کڑی والے پوچھیں گے کہ منڈا کام کاج کیا کرتا ہے تو کیا کہیں گے انہیں۔''

''او بے بے۔ کہہ دینا کہ ہم جو کام کہتے ہیں کر دیتا ہے۔''

اور اب کے چوہدری صاحب نے بلا لحاظ جوتی اٹھائی اور بیچ کے بھاگتے شیر دل کی پشت پر دے ماری۔ وہ جوتی کھا کر بھی ڈھٹائی سے ہنستا مٹی

کے چولہے کے قریب جا بیٹھا۔

''او بے بے روٹی دے دے۔ بڑی بھوک لگی ہے۔''

بے بے جو چوہدری صاحب کو پوتے کو جوتا مارنے پر کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی واری صدقے ہوتی اٹھیں۔

''ماں صدقے جیون جوگیا۔ آج بڑی جلدی بھوک لگ گئی میرے لعل کو۔''

اب لعل کیا بتاتا کہ گھر میں پکے کھانے کی تصویر فیس بک پر ڈالنے کے لیے جلدی مچا رہا ہے۔ بے بے نے جھٹ پٹ مکئی کی روٹی بنا کر چنگیر پر رکھی اور گرم گرم ساگ پر مکھن کی ڈلی رکھ کر اس کے آگے رکھا۔

''اک منٹ بے بے۔ رک ذرا۔'' وہ کرتے کی جیب سے موبائل نکالتا ہوا بولا۔

''یہ کیا کر رہا ہے۔''

''بے بے۔ اس پر نا سمجھ ایک کتاب ہوتی ہے۔ جسے فیس بک کہتے ہیں۔ لوگ جو بھی کھاتے پیتے ہیں نا اس پر ڈال دیتے ہیں۔ آج میں بھی ڈالوں گا۔ سب کو پتا چلے گا کہ آج میری بے بے نے مکئی کی روٹی تے سرسوں کا ساگ پکایا ہوا ہے۔ تو دیکھ بس۔''

وہ بڑے جوش سے موبائل تھامے بے بے کو تفصیل بتا رہا تھا۔ بے بے بھی مارے شوق کے آگے کو جھک کر بیٹھ گئی۔ دل میں خوشی بھی ہوئی کہ پوتا اس کے پکے کھانے کی لوگوں سے تعریف کروائے گا ہے۔ کہ اتنے میں چوہدری صاحب کی کڑک دار آواز سنائی دی۔

''او شیرو۔ یہ حقہ تو دے جا ذرا۔ معدہ ڈک ہوا پڑا ہے۔''

''چچ۔'' وہ پل بھر کو بیزار ہوا مگر وہیں سے آواز دیتا اٹھ گیا۔ ''آیا جی۔ لایا جی۔ بے بے میں بس ابھی آیا۔'' وہ موبائل وہیں رکھ کر بے بے کو بھی تسلی دے گیا جو اس سے زیادہ شوق سے وہاں براجمان تھی۔ مگر صبر کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ شیر دل کو حقہ بناتے دیکھ کر بے بے نے ایک نظر گرم گرم ساگ اور مکئی کی روٹی کو دیکھا اور ایک نظر پاس ہی رکھے موبائل کو۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بے بے نے چمچ پکڑ کر ساگ کی کٹوری میں سے تھوڑا گرم گرم بھاپ اڑاتا ساگ موبائل کی اسکرین پر ڈالا اور مکئی کی روٹی توڑ کر وہ بھی ساتھ رکھ دی اور جھک کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہاں کسی قسم کی تبدیلی کے کوئی آثار نہیں تھے مگر کچھ فاصلے پر کھڑے شیر دل کے لہجے میں زلزلے کے آثار ضرور تھے۔

''یہ کیا کیا بے بے؟'' وہ صدمے سے چور آواز میں بولا۔

''تو نے خود تو مجھے کہا تھا کہ بے بے جو بھی پکایا ہے موبیل پر ڈالنا ہے۔ میں نے ڈال دیا تو اب تیرا منہ بگڑ کیوں گیا ہے۔ بھلائی کا ویلا ہی نہیں کوئی۔''

بے بے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ نہیں بہت کچھ غلط ہو گیا ہے مگر غصہ دکھا کر اپنی بات اوپر رکھ لی تھی اس نے۔

''بے بے۔ میرے موبیل دا بیں ناس (ستیاناس) مار دیا۔ میں نے کہا تھا تصویر بنا کر فیس بک پر ڈالنی ہے۔ تو نے گیلا سالن ہی میرے موبیل پہ ڈال دیا۔ اب تو یہ مر گیا بیچارہ۔'' وہ غم کی تصویر بنا پیروں کے بل یوں بیٹھا تھا جیسے کسی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بیٹھا ہو۔

''میں اب کیا کروں گا۔ ابھی تو میں نے استعمال بھی نہیں کیا تھا۔ ہائے بے بے! یہ کیا کر دیا۔'' وہ ہو کے بھرتا موبائل سے ساگ اور روٹی صاف کرتا ہوا بولا۔ ساگ کی باقیات ابھی بھی اسکرین سے چپکی پڑی تھیں۔ اس نے روہانسا ہو کر دوبارہ موبائل فرش پر رکھ دیا۔

''لے دس۔ بے بے! کیا ظلم کمایا ہے۔''

اسی وقت پانی کی لمبی دھار اسکرین پر پڑنا شروع ہوئی اور شیر دل کے سارے ہو کے پانی میں بہہ گئے۔ بے بے سلور کا جگ ہاتھ میں لیے موبائل

پر پانی گرا رہی تھی۔ فارغ ہو کر اسے پچکارتی ہوئی بولی۔

''چل بس کر میرا پتر۔ نارو۔ یہ لے دھو دیا میں نے۔ ایڈا شیر جوان ہو کے ایک کھڈو نے کے پیچھے روتا اچھا لگتا ہے تُو بھلا۔ لے اٹھا اسے اور روٹی کھا۔''

بے بے سکون اور تسلی سے واپس پلٹ کر اس کے لیے دوبارہ مٹی کی ہانڈی سے ساگ نکال کر پلیٹ میں ڈال رہی تھی اور وہ دل تھامے بے دم پڑے موبائل کو حسرت سے دیکھ رہا تھا جس پر ابھی تک وہ روزینہ سے بات تک نہ کر پایا تھا اور زمین پر بے سدھ پڑا وہ بالکل ڈمی موبائل لگ رہا تھا۔

☆☆☆

تین دن ہو گئے تھے شیر دل کی روزینہ سے ملاقات ہوئے۔ بودی کو روزانہ اسکول چھوڑنے جا رہا تھا وہ۔ دو دن تو چھٹی پر رہی اور آج آئی بھی تو ملی نہیں۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہر شے کاٹ کھانے کو آ رہی تھی۔ موبائل الگ خراب ہو گیا تھا، اس کی اسکرین تڑخ گئی تھی۔ چاچے کمالے کو دکھایا تو اس نے کہا تھا جس دن شہر گئے، ساتھ لیے چلنا وہاں ٹھیک کروالیں گے ورنہ وہ روزینہ سے بات ہی کر لیتا تو سکون آ جاتا۔ اداس اور روٹھا روٹھا سا وہ چھت پر چلا آیا۔

چھت سے تا حد نگاہ دکھائی دیتے کھیت اسے ہمیشہ سرشار کرتے تھے مگر آج نگاہوں کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نغمہ اپنی چھت پر پھیلی گندم دیکھنے آئی تھی۔ آج کل وہ امتحانات کی تیاری کر رہی تھی۔ سارا دن کہیں نہ کہیں گھسی پڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ گھر میں دو بھابیاں تھیں اور دونوں کے مزاج اچھے تھے اس لیے کبھی کسی نے اس کی مصروفیات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اپنے گھر کا ایسا فرد تھی جس سے سب ہی متاثر تھے یہاں تک کہ باسط بھی جو ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ نغمہ نے گندم الٹ پلٹ کی۔ تار پر ڈالے کپڑے اتار رہی تھی کہ نظر سر جھکائے بیٹھے تنکے کے ساتھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے شیر دل پر پڑی۔ اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے کبھی شیر دل کو اداس دیکھا ہو۔ وہ حیران سی کپڑوں کو بازو سے کندھے پر منتقل کرتی منڈیر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''شیر دل۔ شیر دل۔'' اس کے دو بار پکارنے پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے دوبارہ آواز دی۔

''اب اگر میری آواز نہیں سنی نا تو اگلی بار میرے پاس دکھڑے رونے مت آنا تم۔ سمجھے۔''

اور شیر دل کو احساس ہوا کہ اس میں اسی کا نقصان ہو جانا ہے اس لیے فوراً چہرہ اونچا کر کے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے۔ ایسے کیوں بیٹھا ہے۔ کسی سے لڑ کر آیا ہے کیا؟''

وہ جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

''شیر دل۔ میں اتنی فارغ نہیں۔ جلدی بول تا کہ میں نیچے جاؤں۔ کیا ہوا ہے؟''

''آہو۔ چلی جا تُو بھی۔ شیرو کی پروا بھلا کس کو ہے۔ اور پھر تُو تو ہوئی وڈی سیانی۔ بی اے پاس۔''

''بی اے پاس نہیں ہوئی ابھی۔ ہاں ان شاء اللہ ہو جاؤں گی۔'' اس نے مزہ لیا۔

''ظاہر ہے۔ سب کو اپنی پڑھائی لکھائی کا غرور ہے۔ ایک میں ہی ہوں ان پڑھ نکما۔''

''نہیں تُو ان پڑھ تو نہیں۔ میٹرک پاس تو ہے نا۔ رہی بات نکمے ہونے کی تو وہ تیرے ہاتھ میں ہے شیر دل۔ کام کاج کیا کرنا تو کوئی تجھے نکما نہیں سمجھے گا۔''

''مجھے سبق نہ پڑھا نغمہ۔ جا، جا کر کام کر اپنا۔''

''روزینہ میڈم سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟'' اس نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

''لڑائی کیا ہوتی ہے۔ تین دن ہو گئے متھے ہی نہیں لگی۔ روز بودی کو چھوڑنے جا رہا ہوں مگر نہیں ملتی۔ جب سے اس کی وہ شہر والی کزنیں آئی ہیں مجھے

تو جیسے بھول ہی گئی ہے وہ۔'' روزینہ کا نام لینے کی دیر تھی، فٹافٹ سارا دکھ کہہ سنایا تھا کہ کہیں موضوع تبدیل نہ ہوجائے۔

''مصروف ہوگی ان کے ساتھ۔ ورنہ مجھ سے تو ملاقات ہوئی تھی کل شام۔'' نغمہ کا لہجہ اور انداز سرسری تھا

''کیا۔'' وہ چلایا۔ ''تیرے سے ملی تھی وہ کل شام.....کدھر.....؟''

''باسط پائین کے ڈیرے کی پرلی طرف جو ٹیوب ویل ہے، وہاں۔ ساتھ میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔''

''آہو وہی وہی شرلیاں سی۔''

''اوں ہونہہ۔ بڑی ماڑی بات ہے شیر دل۔ ایسے نہیں بولتے۔ پروہنیاں ہیں پنڈ کی۔''

''او جان دے تُو نغمہ۔ بے بے دیکھے نا انہیں تو کہے کیسی تارے لانیاں (چالاک) کڑیاں ہیں یہ۔ وہ تو مجھے پہلے دن ہی بہت چالاک لگی تھیں۔ اب سمجھ آئی کہ وہ کیوں نہیں ملی مجھ سے۔''

''تُو اس کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتا شیر دل۔ وہ تیرے مزاج کی کڑی نہیں۔''

''اچھا جی۔ بڑی بات نہیں۔ کیوں میرے مزاج کو کیا ہے۔ میں اشتہاری ہوں کیا؟''

''تجھے کیسے سمجھاؤں۔ وہ شہر سے آکر یہاں رہ رہی ہے۔ اس کی عادتوں میں فرق ہے۔ یہاں کے لوگ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔''

''نا مطلب کہ تُو اسے چالاک کہہ رہی ہے۔''

''وہ بیچ میں سے بات اچک گیا۔

''اسے چالاک نہیں کہہ رہی یہاں کے لوگوں کو سادہ کہہ رہی ہوں۔ اچھا بابا جان چھوڑ میری۔'' اس نے زچ ہوکر ہاتھ جوڑے۔ ''لگائے رکھا اسے جی کو۔ مجھے کیا۔'' وہ واپس مڑنے لگی تو اس نے جھٹ سے روکا۔

''بات تو سن نا میری۔ میرا ایک کام کردے نغمہ۔''

''اب کیا ہے۔'' اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ نغمہ! تُو جانتی ہے نا کہ میں ایک تیرے پر ہی تو اعتبار کرتا ہوں۔ تُو نے کبھی میری کوئی گل نہیں موڑی۔ آج بھی مجھے مایوس نہ کرنا۔''

جواب میں وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی تو شیر دل نے فٹافٹ بات مکمل کی۔

''کل بودی کے ساتھ روزینہ کے گھر چلی جا۔ دیکھ، میں بڑا پریشان ہوں۔ اسے میرا پیغام دے کہ بوہڑ کے درخت کے پاس ملے آکر مجھے۔ میں نے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''تو وہ ضروری باتیں تُو موبائل پر بھی تو کرسکتا ہے نا۔ میرے جانے کی بھلا کیا تُک ہے شیر دل۔''

''اس کا نمبر ہی بند جارہا ہے نغمہ۔ اصل میں میرے موبائل پر بے بے نے ساگ ڈال دیا تھا گرم گرم، اس کی اسکرین ہی خراب ہوگئی۔ کتنے ہی دن اس سے بات نہیں ہوسکی میری اور مجھے پتا ہے کہ وہ انتظار کرکر تھک گئی ہوگی ہے میرے فون کا۔ پرسوں چاچے کے ساتھ شہر سے نیا موبائل لایا ہوں مگر اب اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔ دیکھ نغمہ چلی جا۔ بدلے میں جو تُو کہے گی، میں کروں گا۔ چلی جانا۔''

''بدلے میں جو میں کہوں گی، وہ تُو کبھی نہیں کرسکتا شیر دل!'' اس نے ایک طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے چلی جاؤں گی۔ کل عصر کے وقت۔''

شیر دل کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ ایک دم ہلکا پھلکا سا ہوگیا۔ نغمہ اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی کپڑے لیے واپس پلٹ گئی۔ کپڑوں کے ڈھیر کی آڑ میں شیر دل اس کی آنکھ کی نمی دیکھ نہیں پایا تھا جو اکثر اس کی باتیں سن کر اتر آیا کرتی تھی۔

☆☆☆

وہ باورچی خانے میں چولہے کے پاس اکیلی بیٹھی تھی۔ نغمہ اور اس کی بھابھیاں گیس والا چولہا استعمال کرتی تھیں جبکہ باہر برآمدے کے ایک طرف

مٹی کا چولہا بھی بنا ہوا تھا مگر نغمہ نے سب ہی کو گیس والے چولہے کے استعمال کا عادی بنا دیا تھا۔ ایک مخصوص خوف اور ڈر جو اس کی بھابیوں کے دل میں بھی گڑا تھا اسے نکالنے کے لیے اس نے پہلے خود ہر روز گیس والے چولہے پر کھانا بنایا تھا۔ جب سب کچھ جھٹ پٹ تیار ملنے لگا تو بھابیوں کی بھی دلچسپی بڑھی۔

پہلے چائے کے لیے ہی کتنا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ مٹی کے چولہے میں آگ اگر جل رہی ہے تو ٹھیک ورنہ آگ جلانے اور پھر چائے بنانے میں کتنا ہی وقت لگ جایا کرتا تھا۔ اب تو کھانا بھی جلدی بن جاتا، تو بھائیوں کو ڈیرے پر جلدی پہنچ جاتا اور وہ خود بھی صاف ستھری رہتیں۔ پہلے لکڑیوں کا کسیلا دھواں آنکھوں میں بھرتا، چہرے پر سیاہی کی ہلکی سی تہہ جم جاتی تھی اور کپڑوں سے دھوئیں کی بُو الگ آتی رہتی تھی۔ اس تمام جھنجٹ سے نغمہ نے سب کی جان چھڑائی تھی۔ بھابیاں اول دن سے ہی اس کی خوبیوں کی معترف تھیں اب تو مزید اس کے ترانے گاتی تھیں۔

اس وقت بھی سب رات کا کھانا کھا کر بڑے ہال کمرے میں جمع تھی جہاں کچھ دیر تک ٹیلی ویژن پر خبریں سنی جانی تھیں اور پھر بھائیوں نے مل کر حکومت کی مٹی پلید کرنے کے بعد بکتے جھکتے کمروں کی راہ لینی تھی۔ نغمہ نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دل بے طرح اداس تھا۔ کسی سے بات تک کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ذہن میں مسلسل شیر دل کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ شیر دل کی روزینہ میں دلچسپی ہے مگر اس حد تک ہے کہ وہ اس سے ملاقات نہ ہونے کے سبب کتنا بے چین اور اداس سا دکھ رہا تھا۔ اس کی تڑپ نے اندر تک نغمہ کو دکھی کر دیا تھا۔

چولہے کے قریب بیٹھی ماچس کی تیلی سے وہ فرش کریدر ہی تھی اور سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھی جب چھوٹی بھابھی زینب اندر باورچی خانے میں داخل ہوئی تو اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پیڑھی گھسیٹ کر خود بھی وہیں آ بیٹھی۔

''اے نغمہ! کیا ہوا تجھے۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ اور یوں شام سے چپ چاپ سی پھر رہی ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں پابی (بھابھی)۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس جی ہی نہیں کیا کچھ کھانے کو۔ طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''کیا ہوا طبیعت کو۔ پھکی کھانی تھی اماں جی سے لے کر۔'' زینب بغور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر یکدم کچھ خیال آنے پر پوچھا۔ ''اے سن۔ شیرو نے تو نہیں تجھے کچھ کہا۔ اک وہی ہے جس کی کسی بات کو لے کر تو پوری رات کڑھ سکتی ہے۔ کیا ہوا ہے بتا مجھے۔'' وہ دھونس سے پوچھ رہی تھی۔

''پابی۔ شیر دل نے کل مجھے روزینہ کو ملنے کا کہا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا حال چال پتا کر کے مجھے بتا۔ ساتھ میں اسے کہہ کہ مجھے بوہڑ کے نیچے ملے آ کر۔'' اس نے ساری بات کہہ سنائی۔

''تو تُو صاف منع کر دیتی نا۔ کہہ دیتی کہ مجھے اماں نہیں نکلنے دے گی۔ تُو بھی نا جتنی سیانی ہے اتنی ہی سادی بھی ہے۔''

''مجھ سے اسے منع نہیں کیا جاتا پابی۔ میں اسے اداس نہیں دیکھ سکتی۔''

''پاویں (چاہے) خود اداس ہو جائے۔ چندری ہوئی ہے تُو۔ مائیں تم لوگوں کی رشتہ جوڑنے میں لگی ہیں اور تُو اسے اس روزینہ شرلی سے ملوانے لگی ہے۔''

''وہ اسے پسند کرتا ہے پابی۔ اور ویاہ بھی اسی سے کرنا چاہتا ہے۔''

''اور تُو۔ تیری پسند۔ تیرا ویاہ نغمہ۔ میں بھلا جانتی نہیں کہ تُو کتنا چاہتی ہے اسے۔ بھلا کیسے کسی اور کو سونپ رہی ہے اسے تُو۔''

''وہ میرا تھا ہی کب پابی۔ اسے کیا معلوم میرے دل کا۔ وہ تو اتنا مست ہے روزینہ کے ساتھ

کہ اسے کسی اور کی آنکھوں میں تکنے کی فرصت ہی نہیں۔''

''تو وہ جو اس کی بے بے یہاں رشتہ ڈالنے والی ہے وہ.....''

''میں اماں کو سمجھا دوں گی پابی۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے وہ خود ہی اپنی بے بے کو روزینہ کے بارے میں بتا دے گا۔''

''نہ کر نغمہ۔ تُو بچپن سے اسے چاہتی ہے۔۔ جب میرا تیرے ویر سے ویاہ نہیں ہوا تھا تب میں بھی یہاں کا پھیرا ڈالتی تھی تو تیرے پاس ہمیشہ بس اسی کی باتیں ہوتی تھیں۔ تُو اسے کیسے کل کی آئی استانی کے لیے گنوا رہی ہے۔''

''چھوڑ پابی۔ اس بات کو یہیں دبا دے۔ سمجھ، ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر شیر دل، روزینہ کے ساتھ خوش ہے تو مجھے بھی خوشی ہے۔ یہ تو بس ایویں دل ذرا ڈول جاتا ہے۔ کمینہ جو ہوا۔''

اور زینب بھی دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ شروع سے وہ نغمہ کے قریب رہی تھی۔ شادی ہو کر یہاں آئی تب بھی دونوں کی محبت میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ گواہ تھی کہ نغمہ کتنی جان چھڑکتی تھی شیر دل پر۔ اور گھر کی بڑی بوڑھیوں میں اندر خانے دونوں کی بات بھی طے تھی۔ باسط اور نغمہ کا بیاہ ایک ساتھ کرنے کا ارادہ تھا۔ اب ایسے میں جب سب کو پتا چلے گا کہ شیر دل کی مرضی کہیں اور ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا اس سب کا۔ وہ نغمہ کا گھٹنوں پر جھکا ہوا سر دیکھ کر افسوس سے سوچے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شیر دل نے بڑی مشکلوں سے رات سے دن کیا تھا۔ صبح بودی کو اسکول چھوڑ کر آیا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پیغام بھجوانے کے باوجود وہ اسکول کی پچھلی طرف اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہاں کھڑا انتظار کر کر کے وہ واپس آیا تھا اور آتے ہی کمرے میں جا کر پلنگ پر اوندھا پڑ گیا تھا۔ بے بے نے کھانے کے لیے بلایا مگر سوتا بنا رہا۔

چوہدری صاحب نے آوازیں دیں پر ان سنی کر گیا۔ حویلی کی معمول کی صفائی ستھرائی شروع ہو چکی تھی اور بے بے کی ملازماؤں کو ہدایات دیتی آواز اندر کمرے میں سنائی دے رہی تھیں۔ اس عمر میں بھی وہ چاق و چوبند تھیں۔ ساتھ مل کر کام کرواتی تھی۔

جب کافی دیر تک شیر دل کمرے سے باہر نہیں نکلا تو وہ اسے دیکھنے کے لیے اندر چلی آئیں۔ وہ قمیص اتارے، محض بنیان پہنے بنا لحاف کے الٹا لیٹا تھا۔ سفید اور سڈول کندھے بنیان میں سے جھانک رہے تھے۔ بے بے نے کھڑے کھڑے نظر کا دم کیا اور پھر اس کے پاس آ بیٹھیں۔ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس کا سر سہلاتے ہوئے پچکارا۔

''کیا ہوا میری جند جان کو۔ سویر کا چاء پانی بھی نہیں پیا۔ نہ کوئی بُرکی (لقمہ) روٹی کی کھائی میرے چن نے۔ کیا ہوا بتا مجھے۔''

شیر دل نے آنکھیں کھول کر بے بے کا چہرہ بغور دیکھا اور پھر لمبی سانس بھرتا اٹھ بیٹھا۔

''ویسے ہی بے بے۔ بس دل نہیں کر رہا کھانے پینے کو۔ سارا جگ ہی ویران سا لگ رہا ہے آج کل تو۔''

''ہائے خیری صلا میرا پتر۔ اس طرح کیوں کہہ رہا ہے تُو۔ ویران ہوں تیرے دشمن۔ میرے پتر ابھی تو تُو نے دادی دادے کو سکھ کے دن دکھانے ہیں۔ ہم وڈیروں (بوڑھوں) کی اب آس ہی کیا ہے سوائے تیرے ویاہ اور بال بچے کے۔''

''چھوڑ بے بے۔ ویاہ کون کراتا ہے میرا۔ ابا جی سے بات کرو تو وہ میرے دن رات نتھار کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کو تو میں بس ہر وقت کھیتوں میں سانڈ کی طرح ہل چلاتا نظر آنا چاہیے ہوں۔ سارا دن ٹریکٹر چلا چلا کر میرے اپنے مغز کی وائی بیجی (کاشت کاری) ہو گئی ہے اب تو۔ اور تُو بات کرتی ہے میرے ویاہ کی۔ کوئی چاء نہیں ابا جی کو میرے ویاہ کا۔''

''او بند کر لے بکواس اپنی۔''

بے بے کب سے برداشت کر رہی تھیں، اس کی کتر کتر چلتی زبان کو دو تھپڑ مار کر بند کروایا۔ ''پونگی جایا کر، پونگی جایا کر۔ تیرے اباجی غلط بھی نہیں کہتے۔ وہ تو میں تیرے کرتوت چھپائے رکھتی ہوں ورنہ تجھے روز چوبارے پر چڑھا کر کنگڑ بنایا ہو۔ وڈا آیا۔ ہزار بار کہا ہے کہ عقل کو ہاتھ مار تو کل کی کراتی اج ہی ویاہ کرادوں مگر بندے کا پتر بننا نہیں اور گھوڑی چڑھنے کے چاہ دیکھ اپنے۔ چھوڑ دے چاچے والی حرکتیں۔ تجھے اسی کی گڑھتی (گھٹی) ہے نا، اس واسطے آدھا پونا تو اسی پر چلا گیا ہے۔''

''نا تو میں نے کب کہا کہ میرا ویاہ ہی کرادے سیدھا۔ صرف منگنی تو کرادے۔''

وہ ٹھنکتا ہوا بالکل سیدھا ہو کر بیٹھا تو بے بے کو اس کی بنیان میں سے جھانکتے سفید سینے پر ایک جانب بڑے اہتمام اور پریت کے ساتھ R کا ہندسہ لکھا دکھائی دیا۔

''اوئے یہ کیا ہے؟'' اس نے اچنبھے سے اس ہندسے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ شیر دل ٹھٹھکا اور بے بے کے ہاتھ کے نیچے دکھائی دیتے کالے پرمنٹ مارکر سے لکھے R کو دیکھا پھر آنکھیں ادھر ادھر مٹکا کر کچھ پل۔ سوچنے میں لیے اور بولا۔

''اس کو ٹیٹو بولتے ہیں بے بے۔''

''ٹٹو۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ تیری مت تو نہیں ماری گئی شیرو۔ تیرے اباجی نے دیکھ لیا تو لتر ولتری کر دیں گے تجھے۔ پتا نہیں کیا منحوس بنا لیا ٹٹو سا۔ تجھے درد نہ ہوئی یہ ٹٹو بنواتے۔''

''نا۔ ذرا سا بھی نہیں کیونکہ سیاہی کے ساتھ لکھا ہے اور میں اباجی کے سامنے کرتا تھوڑی اتارتا ہوں بے بے۔ ویسے دو تین باری نہانے دھونے سے اتر جاتا ہے۔ مجھے پسند ہے بے بے۔''

بے بے جھٹ چادر کے پلو سے وہ ٹیٹو رگڑنے لگی تو وہ بدک کر پرے ہوا۔

''نہ کر بے بے۔ رہنے دے۔ یہ اتر گیا تو میں کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''بیڑا ترے تیرا۔ ٹٹو سینے پر بنوایا ہے فکر منہ دکھا کی ہیں۔ ہماری باری تو نہیں ہوتے یہ ٹٹو۔ جو ماں پیو دیکھ لیتے تو اتار چھتر لیتے اور لمبا کر مارتے۔ تیرے بھی اباجی نے دیکھ لیا تو ایسا کرنا انہوں نے۔''

''بے بے۔ بات نہ ٹال۔ میرا رشتہ کرا جدھر میں نے کہنا ہے وہاں کرانا ہے۔''

''لے وس۔ مجھے تیری مرضی کا پتا نہیں بھلا دل سوڑا (چھوٹا) کیوں کرتا ہے، وہیں کراؤں گی۔''

''اوبلے بھئی بلے۔'' وہ مارے خوشی کے بے کے گلے لگ گیا۔ ''بے بے تجھے کیسے پتا چلا۔ میں نے تجھ سے کی ہی نہیں تھی ابھی یہ بات۔''

''بے بے ہوں تیری۔ تیری آنکھوں میں تیرا دل پڑھ لیتی ہوں۔ مجھ سے تیرے اندر کی کوئی بات چھپ سکتی ہے بھلا۔''

''تو بے بے۔ اباجی۔ انہیں کون راضی کرے گا؟''

''وہ تو راضی ہی راضی ہیں جھلیا۔ بس تو کام میں جی لگائے تو کل کا کرتے آج کر دیں تیرا رشتہ وہاں۔ لیکن کڑی والے صرف زمین جائداد نہیں دیکھتے۔ بیٹھ کے کھانے سے تو کھوہ (کنواں) بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ کام کاج کرے گا تو کڑی دیں گے اگلے۔''

''تو فکر ہی نہ کر بے بے۔ کل سے شیرو صبح تڑکے کھیتوں میں چلا جائے گا۔ میرا ویاہ وہاں کر دے بے بے، میں ساری حیاتی نہ ستاؤں گا۔''

''چل بس کر شوخانا ہو تو۔'' بے بے نے محبت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''اب میں جلدی کروں گی۔ لیکن تو بندے کا پتر بن اور یہ ٹٹو شٹو بھی ہٹا سینے سے۔'' وہ پلنگ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''جب تیری بہو حویلی میں آجائے گی تو ان ٹٹوؤں کی ضرورت ہی نہیں رہنی بے بے۔'' وہ بڑی ترنگ میں جھومتے ہوئے بولا۔

''بے شرم نہ ہو تو۔ منڈے کو ذرا جھجک نہیں۔''

بے بے ہنسی دباتی کمرے سے نکل گئی تو وہ دھپ سے سر تکیے پر گراتے روزینہ سے ہم کلام ہوا۔

''بس روزی جی۔ ختم ہوگئیں جدائیاں۔ اب ساری رکاوٹیں اپنے آپ ہٹ گئیں۔''

اسے یک دم خیال آیا کہ اس نے نغمہ کو بودی کے ہمراہ روزینہ کے پاس جانے کو کہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ چھلانگ مارتا پلنگ سے اتر آیا۔ روزینہ سے ملاقات ہوتی تو اسے جلد از جلد یہ خوش خبری دینا تھی۔

☆☆☆

وہ بڑے بجھے دل کے ساتھ کپڑے بدل کر تیار ہوئی تھی۔ دل بیزاری کی حدوں کو چھو رہا تھا اور شیر دل تھا جس نے گھر کے صحن کے کونے پر لگے انار کے درخت پر پتھر مار مار کر اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ جب بھی اسے نغمہ سے کوئی ایسا کام ہوتا جو فوری کروانا ہوتا تھا تو وہ اسی طرح سے سگنلز دیا کرتا تھا۔ جوانی کی سرحد عبور کرتے ہی بے بے نے اس کا منہ پھاڑ کر نغمہ کو آوازیں دینا بند کروا دیا تھا۔ اس لیے اس نے متبادل حل ڈھونڈ کر رکھا ہوا تھا جب ضرورت ہوتی استعمال کر لیتا۔

نغمہ نے انار کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر نگاہ بچاتے ہوئے اسے انتظار کرنے کا اشارہ کر دیا تھا اور اب کپڑے بدل کر سینڈل پہنے، سلیقے سے بال بنائے وہ برآمدے میں بیٹھی اماں اور دادی کو سہیلی کی طرف جانے کا کہہ کر نکل آئی تھی۔ آس پڑوس کے سب ہی گھروں میں لڑکیاں تھیں اور سب ہی کے ساتھ اس کی اچھی علیک سلیک تھی۔ شام سے پہلے پہلے جب گھروں کے مرد کھیتوں میں ہوتے تھے، تب تک اس کے کسی کے گھر جانے پر پابندی نہیں تھی۔ اسی طرح کوئی نہ کوئی سہیلی اس سے بھی ملنے آئی رہتی تھی۔ وہ گھر سے باہر نکلی تو نکڑ پر ہی بودی دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی دوڑ لگاتا اس تک پہنچا اور سلام کرتا آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر شیر دل کی حویلی کی اور دیکھا تو وہ چھت پر کھڑا دکھائی دیا۔ وہ دل مسوس کر نپے تلے قدم اٹھاتی چلنے لگی۔

''بودی۔'' کچھ آگے جا کر اس نے بودی کو پکارا۔ ''تیری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''ذرا بھی اچھی نہیں جا رہی۔ روز سوٹے کھاتا ہوں۔'' وہ اتنی بے نیازی سے بولا کہ نغمہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔

''کیوں..... کیوں مار کھاتا ہے روز۔ کیا دھیان سے نہیں پڑھتا۔''

''مجھے کوئی پڑھاتا ہی نہیں۔ اماں اور ابا کہتے ہیں اسکول پڑھ کر آیا کر اور اسکول میں استانیاں کہتی ہیں، گھر سے پڑھ کر آیا کر۔ نہ میں اسکولے پڑھتا ہوں نہ گھر۔'' اس نے چلتے چلتے ٹوٹی شاخ اٹھا کر اس سے رستے کی مٹی اڑائی۔

''یہ تو بہت غلط بات ہے بودی۔ اس طرح تو تو پیچھے رہ جائے گا۔'' اسے حقیقتاً فکر ہوئی۔

''اماں کہتی ہے، پڑھ کر منسٹر تو لگنا نہیں تُو نے، پیو کے ساتھ کھیتی باڑی ہی کرنی ہے اس لیے جتنا بھی پڑھ آتا ہے وہی بہتیرا ہے۔''

''اور روزینہ۔ روزینہ بھی کیا دھیان نہیں دیتی؟''

''ہونہہ۔ استانی روزینہ پہلے دھیان دیتی تھی پر اب تو جیسے میرے ساتھ بیر ہو گیا ہے اسے۔ مفت میں مارتی ہے مجھے۔''

''اچھا تُو ایسا کر۔ کل سے شام میں کتابیں لے کر میرے پاس آ جایا کر۔ میں پڑھا دیا کروں گی۔ دھیان سے پڑھے گا تو ایک دن قاری صاب کے پتر جیسی وڈی گڈی ہو گی تیرے پاس۔''

''ہیں سچی۔ جھوٹ تو نہیں مار رہی تُو؟'' اس نے آنکھیں سکوڑ کر شبہ سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''مار رہی ہوں جھوٹ۔ کیوں کہ تیرے پاس قاری صاب کے پتر سے بھی وڈی گڈی ہو گی۔''

اور جواب میں بودی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ قاری صاب پنڈ کے بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے، ان کا

اکلوتا بیٹا سی ایس ایس کر کے سرکاری نوکری سے لگ گیا تھا تو پنڈ میں جیسے ان کی عزت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ وہ جب جب اپنی گاڑی پر پنڈ آتا، تو عید کے چاند کی طرح اسے دیکھنے سب چھتوں پر چڑھ جاتے تھے۔ عنقریب وہ ماں باپ کو بھی ساتھ لے جانے والا تھا۔ باقی سب کی طرح بودی کے لیے بھی وہ رول ماڈل تھا۔

اسی طرح کی باتوں میں رستہ کٹ گیا اور اب وہ ماسی رحیم کی حویلی کے باہر کھڑی سانس درست کر رہی تھی۔ اس کی روزینہ سے سرسری سی ایک دوبار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ کل بھی ٹیوب ویل پر کھڑے کھڑے سلام دعا کر کے اس نے اپنی راہ پکڑی تھی۔ ویسے بھی اس کا مزاج روزینہ جیسا کھلا ڈلا نہیں تھا۔ دوسرے وہ اسے قریب سے نہیں جانتی تھی۔ اب دل کو گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ بھلا کیا بات کرے گی وہ اس سے۔ بودی کو وہیں رکنے کا کہہ کر اللہ کا نام لیتی وہ حویلی کا پھاٹک عبور کر کے اندر داخل ہو گئی۔ سامنے بڑے سے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں اور روزینہ کی نانی اور اس کی مامیاں وہیں بیٹھی تھیں۔ سارا صحن بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ روزینہ ایک چارپائی پر اپنی شہری کزنز کے ساتھ نیم دائرے کی صورت بیٹھی گھسر پھسر کر رہی تھی۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر نغمہ کا جی چاہا فوراً واپس پلٹ جائے مگر روزینہ کی مامی نے دیکھ لیا اور وہیں سے ہانک لگائی۔

''او اماں، ماسی ذکیہ کی پوتری آئی ہے۔ ابھی کل ہی تو ماسی کو یاد کر رہی تھی نا، لے اب اس سے پوچھ لے حال چال۔''

روزینہ کی مامی نے اس کی نانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو سب ہی کا دھیان نغمہ کی جانب ہوا۔ وہ چلتی ہوئی قریب آئی اور سب کو سلام کر کے وہیں نانی والی چارپائی پر ٹک گئی۔

''آپتر۔ خیری آئی ہے نا۔ دادی کی سنا کیسی ہے۔ بڑے ہی دن ہو گئے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''سب ٹھیک ہیں نانی۔ اور اماں جی بھی بڑا سلام کہہ رہی تھیں آپ کو۔ پیغام بھیجا ہے کہ آپ کو چکر لگانے کا کہوں۔''

''ہالا ہالا۔ اچھی بات ہے۔ لگاؤں گی۔ تُو اپنی سنا، سنا ہے داخلہ پڑھ رہی ہے۔''

''کہاں نانی۔ بس چودھویں کے پرچوں کی تیاری کر رہی ہوں۔ تیاری ہو گئی تو دے دوں گی امتحان۔ اچھا، وہ میں نے روزینہ سے ملنا تھا۔''

اس نے مختصراً جواب دے کر فوراً اصل مدعا بیان کیا تاکہ جلد از جلد گلو خلاصی ہو سکے۔ روزینہ اپنا نام سن کر چونکی اور اسے حیرت سے دیکھتی چارپائی سے اتر کر چپلیں پہننے لگی۔ اس کی کزنوں نے دھیمی آواز میں کوئی شوشا چھوڑا تو تینوں کا مشترکہ قہقہہ سارے صحن میں پھیلا۔

''او کڑیو۔ عقل کو ہتھ مارو۔ لوڈیلے (شام ڈھلے) نہیں ہنستے ایسے۔ اور روزینہ، نغمہ تجھ سے ملنے آئی ہے، اندر کمرے میں لے جا اور چا پانی بھی پوچھ۔ لینا۔''

شان بے نیازی سے چلتی روزینہ اس تک آئی اور احسان جتانے والے انداز میں اسے اندر چلنے کو کہا۔ نغمہ کو خفت سی محسوس ہوئی مگر اٹھ کر اس کی معیت میں اندر کا رخ کیا۔ شیر دل کی خاطر وہ یہ کڑوے گھونٹ بھر رہی تھی۔

اندر کمرے میں پلنگ کے قریب دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک پر خود بیٹھ کر دوسری پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نغمہ کا دل کر رہا تھا کھڑے کھڑے شیر دل کا پیغام دے اور چلی جائے واپس مگر بات اتنی مختصر نہیں تھی۔ وہ کرسی کے کنارے پر ٹک کر لفظ ترتیب دینے لگی۔ اس کی ہڑبڑاہٹ سے حظ اٹھاتی روزینہ نے اپنی چوٹی لہرا کر سینے پر پھینکی اور اس کے بلوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''شیر دل کا کوئی پیغام لائی ہو کیا؟''

''تمہیں کیسے پتا۔'' نغمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''پتا کیسے نہیں ہوگا۔ میری کون سا گوڑی (گہری) سہیلی ہو جو مجھ سے اداس ہوئی پڑی تھی تو ملنے آ گئی۔ اور مجھے پتا ہے کہ تم شیر دل کی ہمسائی بھی ہو اور۔'' اس نے گہری نگاہ سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ ''اور شائد اسے پسند بھی کرتی ہو۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔ تمہیں کس نے کہا ایسا۔'' نغمہ ایک دم بھڑکی تھی۔ اسے روزینہ سے عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔

''کسی نے بھی نہیں۔ اندازہ ہے میرا۔ بچپن سے ساتھ ہو، اچھا لگ ہی جاتا ہے کوئی۔ اور شیر دل ہے بھی تو پورے پنڈ میں سب سے زیادہ گھبرو۔''

''ایسے گھبرو تمہیں ہی مبارک۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں صرف تمہیں یہ کہنے آئی تھی کہ شیر دل تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بے بے کو تمہارے نانا نانی کے پاس بھیجنے والا ہے۔ کہہ رہا تھا اس سے پہلے ایک دفعہ اس سے مل لو۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں چلتی ہوں اب۔'' اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

''اس سے کہنا روزی کو آج کل ذرا فرصت کی کمی ہے۔ میرے چاچے کی بیٹیاں آئی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں، جب موقع ملا تو مل لوں گی اور یہ رشتہ بھیجنے کی پسوڑی نہ ڈالے۔ جب مناسب ہوگا تو میں بتا دوں گی اسے۔''

بنا پلٹے نغمہ نے اس کی پوری بات سنی اور دو حرف بھیجتی دروازہ پار کر گئی۔ روزینہ کی طنزیہ ہنسی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

''بھلا میں جانتی نہیں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ بڑی آئی بی اے پاس۔ سمجھتی ہے کہ دو جماعتیں زیادہ پڑھ کر میرا مقابلہ کر لے گی۔ شیر دل کو تیرا کبھی بھی نہیں ہونے دوں گی۔''

ہلکی آواز میں بڑبڑا کر وہ اپنے اندر کا زہر نکال رہی تھی۔

اور ماے رحیم کی حویلی کا پھاٹک پار کرتے ہی نغمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں جنہیں وہ بمشکل بہنے سے روک رہی تھی۔ شیر دل کی خاطر اتنی بے عزتی برداشت کی تھی۔ بس یہ آخری بار تھا، آئندہ نہیں۔ دل میں عہد کرتی وہ خود کو بھی کوس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں۔ اس رات وہ خوب سارا روئی تھی۔

☆☆☆

بے بے نے چوہدری صاحب کو شیر دل کی منگنی کے لیے راضی کر لیا تھا۔ گو کہ چوہدری صاحب کو ابھی بھی خاصے اعتراضات تھے مگر جب بے بے نے بتایا کہ شیر دل بس منگنی کروانے کو کہہ رہا ہے تو چپ ہو گئے۔ اپنے دل میں بھی پوتے کی شادی کو لے کر ارمان تھے مگر شیر دل کی لاابالی فطرت نے انہیں تردد میں ڈال رکھا تھا۔ ایک چاچا کمالا انہیں پریشان کرنے کے لیے کم تھا جواب شیر دل کی بھی فکر دل و دماغ پر سوار رہا کرتی۔ بے بے نے انہیں سمجھا لیا تھا کہ اگر شیر دل کی بات پکی کر دیں گے تو وہ یقیناً سدھر جائے گا۔ نہ سدھرا تو اس کا علاج بھی کمالے والا کریں گے۔ سر پر پڑے گی تو کام کاج پر دھیان دے گا نا۔

وہ چوہدری صاحب کی نیم رضامندی کو کافی جان کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور چادر اوڑھ کر سیدھا چلی گئیں فریدہ چاچی کے گھر۔ فریدہ چاچی اور چاچا کمالا بیچ صحن میں چارپائی ڈالے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان گول گپوں سے بھرا چھابہ اور کھٹائی سے بھرا ڈول رکھا تھا جس میں سے چاچی کمالا پیالہ بھر کر چاچی کے ہاتھ میں تھما رہا تھا۔

''اج خاص سر پر کھڑے ہو کے بنوائے ہیں تیرے لیے گول گپے۔ اور کھٹائی بھی رج کے کھٹی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج تو میری شہزادی خوش ہو جائے گی۔ کیوں مکھنو۔ تو تو بس میری مکھن ہے، مکھن جیسی ملائم اور نرم۔''

''ذرا یہ مکھن مجھے بھی دے۔ میں چولہے چڑھا کے گھی بناؤں۔ ختم ہوا پڑا ہے۔'' بے بے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتی یہ منظر دیکھ

تیز پا ہوتے ہوئے بولی تھیں۔ ”بے غیرت ہی ہو گیا تُو تو۔ گھر کا دروازہ کھلا پڑا ہے اور یہ اندر زنانی کے ساتھ مشکریاں (اٹکھیلیاں) کرنے لگا ہوا ہے۔ زن مرید نہ ہو تو۔“

چاچا کمالا چارپائی سے ایسے اٹھا کہ اترتے اترتے فریدہ چاچی کے ہاتھ میں پکڑے پیالے کو اس کی ٹانگ جا لگی۔ سارا پانی فریدہ چاچی کے اوپر گرا اور جواباً چاچی نے غصے سے گول گپوں سے بھرا چھابا چاچے کو دے مارا۔ سب گول گپے چٹ پٹ ہو گئے۔ ویسے بھی وہ غصے کی حالت میں کسی کا لحاظ کم ہی کیا کرتی تھی۔ چاچے نے اپنے کندھوں اور بالوں سے گول گپوں کی باقیات جھاڑیں اور ماں کے بیٹھنے کے لیے فوراً کرسی آگے کی۔ بے بے نے تسلی سے بیٹھ کر فریدہ چاچی کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہے نی۔ تجھے سلام دعا کی ہوش نہیں فریدے۔ ایسی مست ہوئی ہوئی ہے تُو۔ مانا بندہ تیرا جھڈو (بے وقوف) ہے مگر کچھ خود بھی عقل کو ہتھ مار لیا کر۔ اور میرے سامنے ہی اپنے گھسم کو چھابا دے مارا۔ بے ہدایتی۔“

”او بے بے چل جان دے۔ تُو بتا خیری آئی ہے نا۔“ بیوی کے بگڑتے زاویے چاچے کو پریشان کر رہے تھے لہٰذا فوراً بے بے کا دھیان اپنی جانب کیا۔ بے بے کو چاچے پر مزید تاؤ آیا اور پہلے سے زیادہ تڑخ کر بولیں۔

”جیسی تیری حرکتیں ہیں نا، تجھے جتیاں پڑنی چاہئیں۔ میری طرف سے) پاویں چھابہ کھا زنانی سے یا چھتر، مجھے کیا۔ میں بس یہ بتانے آئی تھی کہ اپنے شیرو کا رشتہ کرنے لگی ہوں میں ذکیہ کی پوتری نغمہ سے۔“

”ہیں بے بے۔ یہ کیا کہہ رہی ہے تُو۔ اتنی جلدی رشتہ کرنے لگی ہے۔ نہ صلاح نہ مشورہ۔ نہ منگنی کیا مارا مار پڑی ہے بے بے!“

چاچے کمالے نے چور نگاہوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا جس نے باقاعدہ غصے سے پہلو بدلا تھا۔ بے بے نے نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

”جب شیرو اور نغمہ ابھی چھوٹے سے تھے تب سے میری اور ذکیہ کی اندر خانے بات ہو چکی ہوئی ہے۔ سوچا تھا کہ وڈے ہو جائیں تو پھر سب کو بتا دیں گے۔ اور سب سے وڈی بات۔ یہ کہ میرے شیرو کی مرضی ہے پوری۔

”ہیں۔“ چاچے کمالے نے حیرت سے بھنویں اچکائیں۔ ”وہ تو اپنی استانی۔“

”ہاں تو نغمہ نے بھی چودہ پڑھ کر استانی لگنا ہے۔ بڑا شوق ہے اسے۔“ بے بے نے بات کو مرضی کا رنگ دے کر چشمہ لگایا۔

”پر بے بے۔ وہ فریدہ کا خیال اپنی بہن کی طرف تھا۔ شیرو کے ساتھ بڑی چمتی رانو۔“ فریدہ چاچی کی مسلسل چبھتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بالآخر چاچے نے کہہ ہی ڈالا۔

”وہ آرام طلب۔ وہ بے کار اور رج کے نکمی کڑی۔ جس کی چھیلی منگنی اس لیے ٹوٹی تھی کہ وہ اسی منڈے کے یار کو خط لکھتی تھی۔ شاوا پتر شاوا۔“

”ہاہائے بے بے۔ اتنے بڑے بہتان نہ لگا میری بہن پر۔ وہ تو اس منڈے کے یار کا دل آ گیا تھا رانو پر، اس لیے منگنی تڑانے کے لیے رانو کے نام سے جھوٹے خط دکھا دیے۔ ورنہ میری بہن ایسی نہیں۔“

”چل وہ جیسی بھی ہے نا میری طرف سے ست سلام۔ میں ایک سے ہی رج گئی ہوں۔ ایک اور لے آئی تو بدہضمی ہو جانی ہے ہمارے پورے ٹبر کو۔“ بے بے نے ہاتھ جوڑ کر فریدہ چاچی کے سامنے کیے۔ چاچی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بے بے کو کوٹ کر رکھ دے۔

”بے بے ویاہ کے بعد سب کڑیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ رانو بھی ہو جائے گی۔“ چاچے کو اپنی متوقع درگت صاف دکھائی دے رہی تھی اس لیے

ایک آخری کوشش کر دیکھی۔

''یہ تو سدھری نہیں۔۔دس سالوں میں۔''

''نہ تو بے بے! میرے میں کیا عیب دیکھ لیے تُو نے۔'' فریدہ چاچی چمک کر بولی۔اس کی رنگت تمتمارہی تھی غصے سے۔

''کوئی اک ہو تو بتاؤں نا۔چل چھڈ۔تُو تو اسپغول ہے۔ جسے پھرولنے کی غلطی میں نہیں کر سکتی۔''

''ہالا ہالا بے بے۔تُو ڈال رشتہ۔جیسی تیری خوشی۔'' چاچے نے فوراً بات رفع دفع کی ورنہ بے بے نے سارے کھاتے کھول دینے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بودی کو گھر بھیجنے کا کہہ کر نکل گئی۔ کچھ بھی تھا اپنے دونوں پوتوں میں اس کی جان تھی۔ بے بے کے جانے کی دیر تھی ،فریدہ چاچی نے چاچے کمالے کو زوردار گھوری دی۔ چاچا کھسیا کر ہنستا رہا۔

''چل جانے دے فریدیے۔ رانو کو رشتے بڑے۔تُو فکر نہ کر۔وہ نمبردار ہے نا ساتھ والے پنڈ کا۔وہ کہہ رہا تھا کہ تیری کوئی سالی شالی ہے تو بتا میں نے اپنے سالے کا ویاہ کرانا ہے۔''

''ہائے کھا قسم۔'' فریدہ چاچی خوش ہوئی تھی سن کر۔''نمبردار کا سالا ہوگا تو یقیناً کھاتا پیتا ہوگا۔''

''آپ بات کرو جی۔ ویسے اسے اپنی رانو کا خیال کیسے آیا۔''

''وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے سالے سے بدلہ لینا ہے۔جیسی میرے متھے ماری ہے نا زنانی، ویسی ہی ان کے متھے لگاؤں گا تاکہ ان کے گھر بھی طوفان آئے۔اور تیری جورو کا مزاج لڑا کا ہے تو سالی کا بھی ہوگا۔''

چاچا کمالا چارپائی سے چھابہ اٹھا کر اس کے اندر اس کے گرے لوازمات واپس ڈال رہا تھا اور اسی دھیان میں وہ کہتا ہی چلا گیا تھا۔ جب تک احساس ہوا تو دیر ہو چکی تھی۔ چاچے کی حالت اسی خستہ حال گول گپے جیسی ہوگئی اور اگلے کچھ ہی پلوں میں وہ بھی چارپائی پر ہاتھ میں پکڑے گول گپے جیسا ہی اوندھا پڑا تھا۔

☆☆☆

''سن نغمہ! بات سن۔'' زینب بھابھی بھاگتی ہوئی اس تک آئی تھی۔ جوش سے تنفس پھول رہا تھا۔ نغمہ رجسٹر پر نوٹس بنا رہی تھی ،دھیان ہٹا کر پین کا ڈھکن بند کیا اور دونوں ہاتھ کھڑے کر کے زینب بھابھی کو پرسکون ہونے کا اشارہ کیا۔

''پانی۔آرام سے۔کیا ہو گیا ہے۔ایسے کیوں بھاگتی دوڑتی آرہی ہو۔ابھی پاؤں پھسل جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے تجھے۔''

''سکون کرنے کا ویلا نہیں ہے یہ۔شیرو کی بے بے آرہی ہے شام کو۔''

''تو کیا ہوا پابی۔آنے دے۔کوئی نیا تو نہیں آنا بے بے نے۔''

''کملی ہے تُو۔وہ دادی سے تیرے رشتے کی بات کرنے آرہی ہے۔تیرے اور شیر دل کے رشتے کی۔ مجھے اماں بتا رہی تھی کہ شیرو کی بے بے اور تیری دادی نے بڑا عرصہ پہلے ہی گل بات کر رکھی تھی۔اب تو بس سارے رشتے داروں کو پتا چلنا رہ گیا ہے۔''

''پر پابی! شیر دل کی مرضی تو روزینہ استانی کی طرف ہے۔وہ کیسے مان گیا بھلا۔''

''او چھوڑ تُو اس بات کو۔ یہ دیکھ کہ تیرے دل کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ جسے تُو نے بچپن سے چاہا ہے، وہ اخیر تیرا ہونے والا ہے۔اور مانتا کیسے نہیں۔ بے بے نے اسے پالا ہے۔ماں سے بڑھ کر ہے وہ اس کے لیے۔ذرا سی جھاڑ پلائی ہوگی تو دبک گیا ہوگا۔ میں تو بہت خوش ہوں۔تُو بھی ذرا نہا دھو کے تیار شیار ہو جا۔''

زینب بھابھی کہہ کر جا چکی تھی اور نغمہ کو ان گنت سوچوں نے گھیر لیا تھا۔

بھلا شیر دل اتنے آرام سے کیسے مانا۔ وہ روزینہ سے محبت کرتا ہے اور ابھی دو دن پہلے ہی تو اس کے لیے مرا جا رہا تھا اب ایک دم سے اچانک کیسے اس سے بیاہ کے لیے مان گیا۔کچھ تو مسئلہ تھا۔

وہ کتابوں پر نظریں جمائے چھت پر جانے کی سبیل سوچنے لگی، ہوسکتا ہے کہ شیر دل بھی اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں مل سکا اور عصر کے بعد ہی بے بے اور چوہدری حق نواز مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لیے چلے آئے تھے۔ باسط انہیں لیے بیٹھک کے بجائے بڑے سے صحن میں ہی آ گیا تھا جہاں نغمہ کی دادی کی ہدایت پر چارپائیوں پر خاص آج کے دن کے لیے سفید چادریں اور مخملی سنہری گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ کشادہ صحن مزید بارونق لگ رہا تھا۔ باسط نے انگیٹھیاں بھی جلا دی تھیں۔

ماحول کافی پرجوش اور پرحرارت لگ رہا تھا۔ بے بے بے تاب سی دادی ذکیہ کی چارپائی پر ہی ٹک گئی۔ چوہدری صاحب نغمہ کے ابا جی کے ساتھ آ بیٹھے جنہوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی حقہ تازہ کرایا تھا۔

نغمہ کے ابا جی، چوہدری حق نواز کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کے ابا اور چوہدری صاحب چچیرے بھائی تھے اور اماں ذکیہ بھی بے بے کی خالہ زاد لگتی تھی، اس طرح یہ سب ایک دوسرے سے رشتے داری کے بندھن میں بندھے تھے۔ اب اسی بندھن کو مضبوط کرنے کا وقت تھا۔ وہ بات جواب تک بے بے اور اماں ذکیہ کے بیچ تھی اسے کھل کر کہنے کا موقع آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں نغمہ کے دونوں بڑے بھائی بھی وہیں آ بیٹھے تو محفل مزید رنگین ہو گئی۔ خوش گپیوں میں بے بے نے نغمہ کا ہاتھ شیر دل کے لیے مانگا تو سب ہی کے چہرے مسرت کے احساس سے چمک اٹھے۔ باسط کو اعتراض تھا مگر اس نے اظہار کرنے سے گریز کیا تھا۔ روزینہ استانی کے ساتھ وہ خود شیر دل کو کئی بار بوہڑ کے درخت تلے دیکھ چکا تھا۔ دل کھٹا بھی ہوا تھا مگر چوہدری صاحب اور بے بے کے ساتھ ان کے گھرانے کا تعلق ایسا نہیں تھا کہ بڑوں کے اس فیصلے میں دخل اندازی کرتا۔ اور پنڈ میں وہ اکیلا مرد نہیں تھا جس نے شیر دل کو روزینہ کے ساتھ دیکھا تھا، ان کی لاپروائی کے باعث نا جانے کون کون دیکھ چکا تھا۔ اس کے اپنے ابا جی اور بڑے بھائی بھی اس میں شامل ہو سکتے تھے تو جب انہیں اعتراض نہیں تھا تو وہ کون ہوتا تھا ٹانگ اڑانے والا۔

زینب بھابھی کی اس کے ساتھ بھی اچھی دوستی تھی، باتوں باتوں میں انہوں نے اسے نغمہ کے دل کی بھی مرضی بتائی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ صحن میں یک دم مبارک سلامت کا شور بلند ہوا تو وہ چونکا۔ نغمہ کو بے بے نے بلوا کر اپنے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک دیکھ کر وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ شیر دل پسند تو اسے بھی تھا اور اب سے ابھی سے وہ اس کا اکلوتا بہنوئی بن گیا تھا تو پہلے سے زیادہ دل سے قریب محسوس ہوا۔ وہ ہر گزشتہ بات نظر انداز کر کے بہن کی خوشی میں راضی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل، بودی کو ساتھ لیے سارے پنڈ میں آوارہ گردی کرنے کے بعد حویلی پہنچا تو رونق میلا لگا ہوا تھا۔ روزینہ سے ملاقات کی آس میں سارا وقت بودی کو بھی پھراتا رہا تھا اور خود بھی خجل خوار ہوتا رہا۔ مامے رحیم کی حویلی کے باہر دیس پھیرے لگائے تھے۔ ایک دو بار چھت پر رنگین آنچلوں کی جھلک سی محسوس ہوئی مگر کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے باوجود کوئی دکھائی نہ دیا تو مایوس سا ہو کر حویلی واپس آ گیا۔ یہاں الگ ہی میلا لگا ہوا تھا۔ پورے پنڈ کی عورتیں بے بے کو گھیرے بیٹھی تھیں اور بے بے خوش باش اور چہکتی ہوئی پلنگ پر دھرنا دیے بیٹھی تھیں۔ اس کے کانوں میں مبارک کی آوازیں پڑی تھیں پر وہ ان سنی کر کے اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا مگر بودی وہاں کچھ دیر چسکے لینے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

کمرے میں آ کر ریموٹ سے دیوار پر لگی ایل ای ڈی آن کر کے وہ اپنے بستر پر اوندھا لیٹ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے حویلی میں روزینہ کی پسند کی

تبدیلیاں لا رہا تھا۔ روزینہ کو دیوار پر لگا ٹی وی پسند تھا، وہ اگلے ہفتے ہی چاچے کمالے کے ساتھ جا کر دو لے آیا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں لگوایا تھا اور دوسرا اپنے کمرے میں۔ حالانکہ ابا جی نے اس کی وہ گوشمالی کی تھی کہ اسے نانی یاد آ گئی تھی۔۔ بے بے کو بالآخر اس کی طرفداری میں میدان میں آنا پڑا تھا۔

ایل ای ڈی لگی تھی تو کیبل اور انٹرنیٹ بھی نصیب ہو گیا تھا اب تو نیا نکور موبائل بھی پاس تھا، نیٹ بھی موجود تھا، واٹس ایپ بھی استعمال کرنا آتا تھا مگر یہ سب بتانے کے لیے روزینہ نہیں مل رہی تھی، اس سے ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اسے ایسے بھولی ہوئی تھی جیسے کبھی جانتی ہی نہ ہو۔ وہ بے دھیانی میں اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا جب بودی بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔

''او پاشیرو۔ تجھے پتے کی بات بتاؤں؟''

شیر دل نے مرجھائی نگاہ اس پر ڈال کر اثبات میں سر ہلایا تو بودی کو مایوسی ہوئی۔ وہ سنسنی پھیلا کر بدلے میں کچھ مانگنا چاہ رہا تھا مگر شیر دل ٹھس سا بیٹھ رہا۔ پھر بھی ہمت نہ ہارتے ہوئے وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔

''تیرا ویاہ ہونے لگا اے پاشیرو۔''

شیر دل ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور ریموٹ ایک جانب اچھال کر اس سے پوچھنے لگا۔

''کیا..... کیا کہا ہے۔ میرا ویاہ۔ کس کے ساتھ؟''

''میں نے تو یاہر سے اندر آتی اڑتی اڑتی بے بے کے منہ سے ابھی سنی تھی کہ اپنے شیرو کا ویاہ نغمہ کے ساتھ کر رہی ہوں میں۔ بس ہو گئیں شروع سب کی سب۔ مبارک ہو آپاں جی، مبارک ہو ماسی۔ فلانی تو فلانی۔''

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو۔ دماغ پہ چوٹ تو نہیں لگ گئی تیرے۔''

''میرے تو نہیں لگی پاشیرو۔ پر جو یہ بات سچ ہوئی تو استانی روزینہ تیرا دماغ اڑا دے گی۔'' جانتا تو وہ بھی سب ہی کچھ تھا۔

''بودی۔ اٹھ جا مرجا ادھر سے۔'' شیر دل نے غصے سے اسے ٹانگ مار کر پلنگ سے نیچے دھکا دیا۔ وہ بدک کر کھڑا ہوا۔

''پاشیرو۔ میرے ساتھ یہ سلوک نہ کر۔ مہنگا پڑے گا۔''

''تیری تو.....'' شیر دل جوتا اٹھانے کو نیچے جھکا مگر بودی فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ وہ ہاتھ میں تھاما جوتا فرش پر پٹختے ہوئے سیدھا ہوا اور بے بے کے فارغ ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کی شادی اور نغمہ سے۔ بھلا بے بے کیسے کر سکتی ہے ایسا۔ اس نے موبائل نکالا اور روزینہ کے نمبر پر کال کی جو بند ہی ملا۔ دو موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے وہ موبائل بھی فرش پر دے مارنے لگا تھا مگر یک دم یہ خیال آیا کہ خراب ہو گیا اور روزینہ کی کال آ گئی تو کیا ہو گا۔ دل مسوس کر وہ دوبارہ بستر پر اوندھا گر گیا تھا۔

☆☆☆

مغرب کی اذانیں ہوئیں تو بے بے نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ انہیں لگا کہ وہ سو رہا ہے، واپس پلٹنے لگیں تو شیر دل کی آواز نے انہیں روک لیا۔

''کدھر چلی ہے بے بے۔ کب سے اڈیک رہا ہوں کہ فارغ ہو جائے تو بات کر لوں۔''

''نماز واسطے وضو کرنے چلی ہوں۔ سارا ٹیم تو ان زنانیوں نے کھا لیا میرا۔ تیرے ابا جی بھی آ گئے ہوئے ہیں، بیٹھک میں بیٹھے ہیں، نماز پڑھ کے کھانا دینے لگی ہوں انہیں۔'' بے بے کے انداز میں عجلت تھی جیسے شیر دل کے ساتھ زیادہ بات چیت سے گریز کر رہی ہوں۔

''بے بے۔ ادھر بیٹھ میرے پاس۔'' اس نے پلنگ پر ہاتھ مار کر کہا۔

''وے بے بیا۔ دیر ہو جانی ہے بہتیری۔''

''بے بے.....'' اس کے تنبیہاً کہنے پر ناچار بے بے بیٹھ گئیں۔

''بول جلدی۔''

''کس سے کرادی ہے میری منگنی؟''

''وہیں جدھر تُو چاہتا تھا۔''

''بے بے۔ میں نے کب نغمہ کا نام لیا تھا؟'' وہ بنا تمہید بولا۔

''ابھی نہیں لیا نا۔ لیکن جب وہ ویاہ کے ادھر آئے گی تو بس اسی کا نام لے گا تُو۔''

''بے بے میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی ہے تو.....'' وہ برہم ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا اور بے بے نے تسلی سے لمبا سانس بھرا اور بولیں۔

''کھیل تو تُو کھیل رہا تھا ہماری ناک کے نیچے۔ میں نے تو اس کھیل کو لپیٹا ہے ورنہ کوئی نہ کوئی چن چڑھا دینا تھا تُو نے۔ تیرے ابا جی کی جو عزت ہے، وہ تجھے نہیں دکھتی بدلحاظ۔ میں کا کی نہیں جسے سمجھ نہیں کہ یہ موبیلوں پر فوٹو ویں تُو کس کے لیے اتارتا ہے۔ ڈینگے چبے منہ بنا کے اپنا ٹٹو دکھا کر وہ فوٹو تُو اس پھاپھے کٹنی کو بھیجتا ہے۔ وہ تارے لانی روزینہ کے چھن تجھ پر کھلے نہیں ابھی اس لیے اچھل رہا ہے۔ اب سن میری بات کان کھول کے۔ رشتہ تیرا اپکا ہے نغمہ کے ساتھ۔ تُو نے اگر زیادہ ٹیں ٹیں کی نا تو اس بار میں نے اتار جُوتی لینی ہے۔ اور سارا پنڈ تیری چھترول دیکھے گا۔ سمجھا۔ اب منہ تے لا جندرا (تالا) اور چپ کر کے قبول کر، جو ہو رہا ہے۔''

بے بے تو آج بے بے لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ شرربار نظروں سے اسے گھورتی اٹھیں اور آستینیں کہنیوں تک چڑھاتی باہر نکل گئیں۔ شیر دل کو بے بے کے تیور واقعی چپ کرا گئے تھے۔ سامنے بولنے کی جرات نہیں ہوئی تھی مگر اب پیچھے سے اونچی آواز میں بولا۔

''بے بے۔ میں ترفلاٹ ڈال دینا ہے۔ بات یاد رکھنا میری۔ پھر نا کہنا کہ منڈا ہتھوں نکل گیا۔ آہو۔''

اس نے غصے میں ایل ای ڈی کی آواز اونچی کی اور خود سر تک لحاف تان کر لیٹ گیا۔ اس وقت اسے سب سے زیادہ تاؤ نغمہ پر آ رہا تھا۔

☆☆☆

عصر سے کچھ بعد کا وقت تھا، جب نغمہ اپنی سہیلی کے ساتھ باجی رخشندہ کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔ بازوؤں میں تھامی کتابیں سینے سے لگا رکھی تھیں۔ وہ اور اس کی سہیلی زہرہ، باجی رخشندہ کی بیٹی سے کبھی کبھار پڑھنے چلی جاتی تھیں۔

باجی رخشندہ کی بیٹی نے اسی سال اردو ادب میں ماسٹرز کیا تھا۔ ایک طرح سے وہ پنڈ کی واحد لڑکی تھی جو اتنا پڑھ لکھ گئی تھی۔ اسے جب نغمہ اور اس کی ایک دو سہیلیوں کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اپنی مدد آپ کے تحت بی اے کے امتحانات کی تیاری کر رہی ہیں، تو اس نے انہیں خود ہی پڑھانے کی پیشکش کی۔ اب جب کبھی زیادہ مشکل ہوتی تو نغمہ، زہرہ کے ساتھ اس سے پڑھ آتی تھی۔

آج پڑھائی سے زیادہ شیر دل سے ہونے والی اپنی منگنی اور اس سے متعلق ان گنت سوچوں سے دھیان ہٹانے کے لیے وہاں گئی تھی۔

دو دن ہو گئے تھے شیر دل کے نام کی انگوٹھی ہاتھ میں پہنے مگر ابھی تک اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ کرنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ دل مسلسل فکر میں گھل رہا تھا۔ روزینہ کے لیے شیر دل کے جذبات سے بھلا اس سے زیادہ کون واقف تھا۔ شیر دل کے منہ سے سن سن کر اسے تو روزینہ کی ہر بات ازبر ہو چکی تھی۔ کوئی کچھ بھی کہتا، وہ بخوبی جانتی تھی کہ یہ منگنی اس کے علم میں لائے بنا کی گئی ہے اور جب اسے پتا چلا ہو گا تو اس نے خوب ہنگامہ کیا ہو گا۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں، زہرہ کی باتوں کا جواب ہوں ہاں میں دیتی وہ سر جھکائے چلے جا رہی تھی۔

سفید چادر کے ہالے میں اس کا فکرمند گلابی مائل گندمی رنگت والا چہرہ بے حد پرکشش لگ رہا تھا۔ اگر شیر دل کے دل میں روزینہ نہ بسی ہوتی تو وہ یقیناً اس رشتے پر خوش ہوتا۔ نغمہ جیسی لڑکی پر پنڈ کی کئی عورتوں نے اپنے بیٹوں کے لیے نگاہ رکھی ہوئی تھی مگر کچھ کچھ اندازہ سب ہی کو تھا کہ اس کا رشتہ کہاں

ہونے کے امکان ہیں، اس لیے کسی نے قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ زہرہ اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی مگر اس کا دل جیسے ہر احساس سے عاری تھا۔ وہ بظاہر دھیما سا مسکراتے اس کی باتوں کو سن رہی تھی تبھی گھر سے کچھ ہی فاصلے پر کولہو کے پاس شیر دل درخت سے ٹیک لگائے کھڑا دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹکی ضرور مگر رکی نہیں۔ زہرہ نے بھی شوخی سے اسے کہنی ماری لیکن اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اس کے سامنے سے گزر جاتیں، شیر دل نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''نغمہ! وہ بات کرنی ہے، ایک چھوٹی سی۔''

نغمہ کے قدم رک گئے اور دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ زہرہ گلا کھنکارتی ہوئی اسے معنی خیزی سے دیکھتی آگے بڑھ گئی۔

''اچھا نغمہ! میں چلتی ہوں، اماں اڈیک رہی ہوگی۔''

شرمندگی سے نغمہ کا چہرہ مزید سرخ پڑ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ شیر دل اسے منگنی کے بعد یوں بے باکی سے راہ چلتے روک لے گا۔ کوئی دیکھ لیتا تو خاصا معیوب لگتا جبکہ وقت بھی مردوں کی گھروں کو واپسی کا تھا۔ زہرہ کچھ آگے نکل گئی تو شیر دل اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ نغمہ ہونٹ بھینچے، انگلی سے رجسٹر کریدتے ہوئے اس کے بات کرنے کے انتظار میں تھی۔

''تجھے پتا ہے نا نغمہ۔ بے بے نے کیا کر ڈالا ہے۔''

اس کا انداز جارحانہ تھا۔ دل میں کرچی سی چبھ گئی۔ مطلب وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا، شیر دل راضی نہیں تھا۔ نغمہ اب بھی خاموش رہی۔

فضا میں پرندوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پیپل کے درخت کے پتے ہوا سے تھرتھرے کھا رہے تھے۔ کچی پگڈنڈی سے گرد سی اڑنے لگی تھی، لگتا تھا آندھی آنے والی ہے۔ نغمہ نے چادر کو ٹھوڑی کے نیچے سے کس کر پکڑا اور شیر دل سے مخاطب ہوئی۔

''جلدی بول شیر دل۔ ہنیری (آندھی) چل پڑی تو راہ نظر نہیں آئے گی گھر کی۔''

''بے بے نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے تیرے سے نغمہ۔ تو جانتی ہے نا کہ میں روزی سے محبت کرتا ہوں۔ پھر بھی تُو نے ہونے دیا یہ رشتہ۔'' اس کے لہجے کا شکوہ نغمہ کی جان جلا گیا۔ وہ تڑخ ہی گئی۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو مر کر بھی ہاں نہ کہتی شیر دل، جگہ جگہ پر منہ مارنے والا مرد کسی کڑی کو چنگا نہیں لگ سکتا۔ میرے سامنے جو اکڑ کر بول رہا ہے تو ذرا حوصلہ پکڑ اور بے بے کو منع کرنا۔ اپنے ابا جی سے شکایت کر جا کر۔''

''بے بے کو تیری یہ دو گز لمبی زبان نہیں دکھی؟'' شیر دل اس کے ایسے لب و لہجے کا عادی کب تھا، حیرت زدہ سا بولا۔ ''ویسے تو ہر کڑی بے بے کو چالاک لگتی ہے، پر تیری دفعہ پلیکھا (غلط فہمی) کیوں پڑ گیا اسے۔''

''دیکھ شیر دل۔ میرا سر نہ کھا۔ میرے امتحان سر پر ہیں۔ تیاری کرنی ہے۔ میرے پاس ٹیم نہیں ہے ان باتوں کو سوچنے کا۔ تجھے اگر اتنا سیاپا پڑا ہوا ہے تو خود منع کر دے اپنے گھر کے بڑوں کو۔'' وہ بے مروتی سے کہتی آگے بڑھنے لگی، اس سے زیادہ سننے کا یارانا تھا۔ تب ہی وہ پیچھے سے بولا۔

''مجھے پتا ہے تُو نے اس دن روزی سے ضرور کوئی ایسی بات کہی ہوگی جو وہ اب میرا فون بھی نہیں اٹھاتی۔ بلکہ اس نے تو فون ہی بند کر رکھا ہے، اور یہ سب اسی دن سے ہوا ہے نغمہ جس دن کی تُو اس سے مل کر آئی تھی۔ اگلے ہی دن بے بے تیرے لیے رشتہ لے کر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ میرے ساتھ چنگا نہیں کیا تُو نے۔ مجھے دھوکہ دیا ہے۔''

''اپنی بکواس بند کر لے شیر دل۔'' نغمہ یک دم طیش میں آئی تھی۔ ''نہ میں نے روزینہ سے ایسا ویسا کچھ کہا نہ بے بے سے۔ روزینہ کے تو تیور کسی وجہ سے پہلے ہی بدل گئے تھے اور رہی بے بے تو جانا منع کرا نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں تجھ جیسے ایف اے فیل کے ساتھ متھا پھوڑنے کا۔ مجھ پر الزام لگانے سے

اچھا تھا شیر دل! کہ روزینہ کی کھوج کرتا کہ وہ تجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی۔ سمجھا۔''

وہ کہہ کر تن فن کرتی واپسی کے لیے پلٹی مگر اس نے دوبارہ نیکی لگادی۔

''مجھے تو ذرا سا بھی یقین نہیں تجھ پر۔ اگر اتنی ہی سچی ہے نا تو اک دفعہ پھر جا روزینہ کے پاس۔ مامے رحیم کی حویلی کے سامنے جو دھریک ہے نہ وہاں وہ اج کل اپنی ان کزنوں کے ساتھ بیٹھتی ہے۔ میں وہاں اس سے بات کر لیتا لیکن سامنے مامے رحیم کی حویلی کا پھاٹک اکثر کھلا ہوتا ہے اور روزینہ کی نانی اور مامیاں مجھے ڈال کر بیٹھی ہوتی ہیں۔ تو اسے بلا وہاں پر، میں وہیں کہیں چھپ کر بیٹھوں گا، بات کر اس سے۔ سب پتا چل جائے گا کہ کتنی سچی ہے تو.....''

نغمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ بچپن کی دوستی تھی اور آج وہ ایک ایسی لڑکی کے لیے اس پر بیچڑ اچھال رہا تھا جو کبھی بھی شیر دل سے مخلص نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں میچ کر آنسو پیے اور رندھے گلے کے ساتھ بولی۔

''ٹھیک ہے۔ چلی جاؤں گی مگر کچھ دن بعد۔ باسط پائین نے اگلے ہفتے شہر جانا ہے تب چلی جاؤں گی ورنہ اس نے مجھے روزینہ کے ساتھ دیکھ لیا تو برا منائے گا، اچھی لڑکی نہیں سمجھتا وہ اسے۔''

اس کی بات پر شیر دل جز بز ہوا مگر خاموش رہا۔ اب نغمہ کیا بتاتی اسے کہ روزینہ نے باسط کو بھی موبائل پر کالز کی تھیں۔ تب سے باسط نے اسے بھی سختی سے منع کر دیا تھا مامے رحیم کے گھر جانے سے۔

''پر اس کے بعد۔ اس کے بعد شیر دل تو مجھے اپنی شکل نہ دکھانا اور اسی دن اس رشتے کے لیے شام سے پہلے تو اپنے منہ سے منع کرے گا ورنہ میں تو ہر حال میں کر ہی دوں گی۔ سمجھا۔''

''ہاں ہاں کر دوں گا۔ میرا کون سا چکی کے نیچے ہتھ آیا ہوا ہے۔ کہ تجھ سے نہ ہوئی تو میری ناک نیویں (نیچی) ہو جائے گی۔ چار جماعتیں کیا پڑھ گئی ہے تو نغمہ، اپنے پرائے کی سدھ بدھ ہی بھول بھلا گئی ہے۔ بس تجھے بات کرنی ہے روزی سے ہر حال میں۔'' ایف اے فیل کا طعنہ ابھی تک تکلیف دے رہا تھا اسے۔

''کہا نا، کر دوں گی۔ اب میرا کھیڑا (پیچھا) چھوڑ۔ جا یہاں سے۔ تجھے تو کسی کی شرم ہے نہیں، میرا ہی خیال کر لے۔''

اتنا کہہ کر نغمہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ شیر دل کو لگا جیسے وہ رو رہی ہو، اس نے دو تین بار اسے چادر کا پلو اٹھا کر چہرے کی طرف لے جاتے دیکھا۔ اور نغمہ کے آنسو واقعی بہتے چلے آ رہے تھے۔ اسے شیر دل سے اس قدر سنگ دلی کی امید نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس دن باسط شہر جائے گا، اسی دن یہ کام کر دے گی اور روزینہ سے بات کر کے سارا کچا چٹھا شیر دل کو سنوا دے گی اور خود اس رشتے سے انکار کر دے گی۔ باسط کو کہہ کر۔ وہ اس کی بات سمجھ بھی جاتا۔ مگر یوں ارزاں ہو کر کسی کی بیوی بننا اسے ہرگز قبول نہیں تھا بھلے سے وہ اس کا منٹھار ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

بے بے بالن کا گٹھا اٹھائے کوٹھری سے نکلیں تو کمرے سے باہر آتے شیر دل نے آگے بڑھ کر لینے کی کوشش کی مگر بے بے نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پرے جھٹک دیا۔ وہ شدید ناراض تھیں۔ رات شیر دل نے بے بے کو کمرے میں بلا کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ نغمہ سے شادی نہیں کرے گا، روزینہ سے کرے گا ورنہ کنوارا مرے گا۔ بے بے نے آؤ دیکھا نا تاؤ، جوتی اتاری اور رکھ رکھ کر اس کے بنیان میں سے جھانکتے ننگے کندھوں پر برسا دی۔

''بے غیرتا۔ بے حیا۔ تجھے ماسا موٹی شرم نہیں رہ گئی۔ کنجر ہو گیا بالکل تو تو۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ مجھے پتا نہیں کہ کس فسادن کے لاروں میں ہے تو۔'' بے بے نے دوبارہ ہاتھ میں جوتی سیٹ کی اور ٹیٹو کے اوپر ماری۔

''یہ جو تیرا ٹٹو ہے نا مجھے پتا تھا کہ کس کے واسطے بنایا ہوا ہے۔ کنکول کی طرح تجھے چمٹ گئی ہے وہ کڑی۔ یہ رحیمے کو تو میں سویرے بتاؤں گی کہ اپنی دوہتری (نواسی) سنبھالے۔ لیکن پہلے تیرا دماغ جتیاں مار مار کے پولا کر دینا میں آج۔ تیرے ابا جی کو پتا چلے تو وڈ کے رکھ دیں گے تجھے، پر رحیمے کی دوہتری نہیں لائیں گے۔ اینٹ کتے کا بیر ہے دونوں میں۔ تجھے جو چاء چڑھے ہوئے نے نا میں سارے نکال کے رکھ دینے نے۔ لے سہی تو دوبارہ اس استانی کا نام۔ ڈھیٹ مٹی نہ ہو تو۔''

بے بے نے تابڑ توڑ حملے کے بعد ہانپتے ہوئے جوتی نیچے پھینکی تو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے شیر دل نے ذرا سا سر اٹھا کر جائزہ لیا اور بے بے کا جوتی سے خالی ہاتھ دیکھ کر تسلی سے بولا۔

''کنکول تو نہ کہہ نا بے بے روزینہ کو۔''

''بند کر بوتھی، بند کر۔ میں بھی کہوں کہ جس دن سے نغمہ کے ساتھ رشتہ کیا ہے تیرا مڑ نگا (منہ) ہی سیدھا نہیں ہو رہا۔ ایسی آگ لگی ہوئی ہے تجھے اس روزینہ کی کہ ہیرے جیسی کڑی میں عیب پھرول رہا ہے۔ اب میرے ساتھ کلام کرنے کی کوشش نہ کریں منڈیا! ورنہ تیرے سارے ٹٹو تیرے ابا جی کے سامنے کڈھ کے رکھ دینے ہیں پھر وہ تجھے ایسے لتر ماریں گے کہ سارے پنڈے پہ ٹٹو بن جائیں گے۔ پہلے دماغ سیدھا کر، پھر میرا منہ دیکھنا۔ اور ایک بات اور سن لے۔ چمکیں مارتا روپ انا (اندھا) کر دیتا ہے، اپنا پرایا سب بھول جاتا ہے لیکن جو روپ مٹھی مٹھی (دھیمی دھیمی) لو دے نا اس سے اکھیاں ٹھنڈیاں ہوتی ہیں، دل ٹھنڈا رہتا ہے اور اس کے چانن میں اپنوں کی پہچان باقی رہتی ہے۔ روزینہ کا روپ نغمہ کے آگے لشکارے ضرور مارتا ہے پر یہ چمک چار دن کی ہے لیکن نغمہ کا وجود تیری پوری زندگی کو روشن کر دے گا۔''

بے بے کوئی بھی جوابی بیان سنے بنا کمرے سے باہر نکل گئی تھی، پیچھے شیر دل حق دق بیٹھا تھا۔ اس نے بے بے کا یہ روپ تو دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تو کبھی سخت لہجے میں جھڑکتی تک نہیں تھیں پر آج جوتے سے تواضع کر ڈالی تھی۔ کندھوں سے تپش نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں سہلاتے ہوئے وہ الگ ہی ٹینشن میں آ گیا تھا۔ اگر بے بے نے واقعی ابا جی کو روزینہ کے بارے میں بتا دیا تو وہ کیا جواب دے گا۔ اس سے بڑی خطرناک بات یہ تھی کہ اگر ابا جی کو ٹیٹو کا پتا لگ گیا تو وہ اسے کنویں میں دھکا دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ فوراً چھلانگ لگا کر پلنگ سے اترا اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر ایک حسرت زدہ نظر اپنے سینے پر ڈالی جہاں لکھا R جگمگا رہا تھا۔

پر مزید تواضع سے بچنے کے لیے اس نے ڈریسنگ کی دراز سے اسپرٹ کی بوتل نکالی اور تھوڑی سی روئی پر لگا کر ٹیٹو رگڑنے لگا۔

''کوئی بات نہیں شیرو! اک بار معاملہ سیدھا ہو جائے تو پنڈا بھی ادھر اور ٹیٹو بھی ادھر۔ بس پاباسط شہر جائے اور نغمہ کام کر دے میرا۔''

وہ خیالوں میں روزینہ کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اسے ڈٹ کر سب کے سامنے کھڑے ہو کر کہتے سن رہا تھا۔

''یہ شادی نہیں ہونے دینی میں نے۔ شیر دل میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔'' دل گنگنا اٹھا اور ایک گہری مسکراہٹ شیر دل کے لبوں کو چھو گئی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ٹیٹو رگڑ رہے تھے۔ اب یہ قصہ آر یا پار لگنے ہی والا تھا۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا عجیب گدلا سا موسم ہو رہا تھا۔ آندھی کے آثار لگتے تھے۔ وہ چھت پر مرغیوں کو بند کر کے منڈیر کے نزدیک چلی آئی۔ دور تک لہلہاتے کھیتوں نے دل ٹھنڈا کر دیا۔ کھیتوں کی ہریالی کو چھو کر آتی تازہ ہوا جسم سے ٹکرا کر تازہ دم کر دیتی تھی۔

چند پل وہ آنکھیں بند کیے اس تازگی کو محسوس کرتی رہی اور جب آنکھیں کھلیں تو نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا، وہ سلگا دینے کو کافی تھا۔ چھت سے

روزینہ کی حویلی صاف دکھائی دیتی تھی اور شیر دل ذرا سے فاصلے پر اس کی شہر سے آئی کزن سے بات کر رہا تھا۔

وہ لڑکی ادھر ادھر دیکھتی کچھ کہہ رہی تھی اور ہاتھ میں تھامے موبائل پر شیر دل کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔ دو منٹ مزید کچھ بات چیت ہوتی رہی اور پھر شیر دل کافی خوش سا وہاں سے چل پڑا۔ نغمہ فوراً منڈیر سے پرے ہوگئی کہ اس کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ مگر دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ یقیناً شیر دل کی روزینہ سے رابطے کی کوئی سبیل نکل آئی ہوگی۔ یا پھر کوئی خیر خبر مل گئی ہوگی۔

کتنے ہی قیاس وہ لگاتی من بھر قدموں سے چلتی نیچے اتری تو آخری تین سیڑھیوں سے پیر رپٹ گیا۔ گھٹنوں کے بل صحن کے فرش پر آگری۔ ماں، دادی اور بھابیاں بھاگی آئیں اسے دیکھنے اور اس نے جیسے موقع ڈھونڈا تھا۔ اس بری طرح سے روئی کہ سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ کبھی بھی ایسی چھوٹے دل کی نہیں تھی۔ چوٹوں پر تو بالکل بھی واویلا نہیں کیا کرتی تھی۔

زینب بھابھی سمجھ گئی کہ رونا کسی اور بات کا ہے بس سبب نہیں مل رہا تھا۔ وہ اسے بہلاتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ پلنگ پر بٹھا کر دروازہ بند کیا اور دوپٹے سے اس کا منہ پونچھا جو آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

''اے نغمہ! کیوں روئی اتنا۔ دیکھ، میں بار بار نہیں پوچھوں گی کہ کیا ہوا، ایک ہی بار میں بول دے۔ شیر دل نے لازمی کچھ کہا ہے تجھے۔ ورنہ تو ایسی چھوٹے دل کی نہیں کہ نکی سی چوٹ پر رونے لگے۔''

''کچھ نہیں پابی۔ بس دل کیا کہ رولوں، تم سب سے جدا جو ہونا ہے تو اس خیال سے رونا آگیا۔''

''نانا نا۔ باتیں نہ بنا نغمہ! یہ دیوار کے پار تو سوہرے (سسرال) ہیں تیرے۔ کنڈپ کے ادھر کنڈپ کے ادھر۔ تو روئی ہے کیونکہ شیر دل نے تجھ سے کہا ہوگا کہ وہ ابھی بھی اس مرجانی روزینہ کو چاہتا ہے، اور تو اس رشتے سے انکار کردے۔ ہے نا۔''

زینب بھابھی کا اندازہ ٹھیک تھا، نغمہ کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس نے ایک طویل ہوکا بھر کر آنسو صاف کیے اور مزید ٹال مٹول کیے بنا سب کہہ دیا۔

''نہ حیا بالکل ہی مک گئی اس منڈے میں۔ تو نے کیسے سن لیں اس کی باتیں۔ کہا کیوں نہیں کہ اس کی بے بے مندری (انگوٹھی) ڈال کر گئی ہے تجھے۔ بات کرنی ہے تو اس سے کرے۔ خود ہی جتیاں مار کے سر گنجا کر دیتی وہ۔ تجھے کیوں گھسیٹ رہا ہے۔''

''وہ سمجھتا ہے پابی! کہ میں نے روزینہ کو بھڑکایا ہے، اس نے کافی دنوں سے شیر دل سے بات نہیں کی تو وہ مجھے الزام دے رہا ہے کہ میں نے اپنے اور شیر دل کے بارے میں الٹی سیدھی بات کر دی ہے تب ہی وہ اب اس سے بات نہیں کر رہی۔ کہتا ہے کہ کسی طرح روزینہ سے مل کر میں اسے راضی کروں تاکہ وہ شیر دل کی طرف سے دل صاف کرلے۔'' وہ سپاٹ انداز میں بتاتی چلی گئی۔

''نہ تو تُو ایسا کرے گی کیا۔ بھاڑ میں نہیں جائے روزینہ۔ مرے پرے۔ نہ کرے بات شیر دل سے۔ اچھا ہی ہوا یہ تو۔ ویاہ ہوگا تو شیر دل خود ہی تیرے ساتھ سیدھا ہوجائے گا۔''

''نہیں پابی! میں کروں گی بات روزینہ سے۔ تین دن بعد باسط پائین نے شہر جانا ہے تو میں بودی کو کہہ کر اسے پیغام بھیجوں گی ملنے کا۔ شیر دل وہیں چھپ کر ساری بات سن لے گا۔ پابی تو اس کی آنکھیں کھل جائیں گی پر اس کے بعد میرا اور اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ میری اور اس کی گل مک جانی ہے۔ بس۔''

''بے وقوفی نہ کر نغمہ! مرد تو آٹے ورگا ہوتا ہے جتنا پیار کا پانی ڈالو اتنا نرم ہوتا جاتا ہے۔ یہ جو ارد گرد کی ہوائیں چلتی ہیں ناں وہ چھو کر تو سب ہی کو جاتی ہیں بس جو پکے کلے (کھونٹا) سے بندھا ہو وہ اپنی

جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ تو شیر دل کا کلہ ہے، پکی رہے گی تو وہ کہیں بھی اڈاری نہیں مارے گا۔''

''نہیں پابی! کلے مضبوط ہوں یا کچے، جس مرد نے ادھر اُدھر کا منہ کرنا ہو تو وہ کلہ ہی توڑ دیتا ہے۔ اور میں ٹوٹنا نہیں چاہتی پابی۔''

آنکھوں میں آئے آنسو چھپاتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ زینب بھابھی اسے تاسف اور دکھ سے دیکھ کر روزینہ کو جی ہی جی میں کوسنے لگی۔

☆☆☆

روزینہ بڑی بے چینی سے گھنے درخت کے سائے میں اس کے موٹے تنے سے ٹیک لگائے نغمہ کا انتظار کر رہی تھی۔ آج صبح بودی خاص پیغام دے کر گیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے پر نغمہ نے ملنے کی جگہ تبدیل کر دی تھی۔ وہ اس کی حویلی کے آس پاس اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔

روزینہ منہ پھٹ اور بدلحاظ لڑکی تھی، جوش میں آکر اونچا چلانے لگتی یا اسی سے پلٹ کر لڑنے لگ جاتی تو بدنامی اس کی بھی ہو سکتی تھی۔ چار لوگ مامے رحیم کے گھر سے نکل آتے تو کیا جواب دیتی وہ کہ کس لیے آئی تھی۔ اس لیے اس نے اسکول کی پچھلی طرف ہی اسے بلوا بھیجا تھا جہاں روزینہ اور شیر دل ملتے رہے تھے۔

شیر دل کو بھی کہلوا دیا تھا۔ روزینہ خاصی حیران ہوئی تھی، پہلے تو سوچا کہ نہ جائے مگر جب سے اس کی اور شیر دل کی منگنی کی خبر سنی تھی، سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ ایسا تو اس نے اتنی جلدی ہو جانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بھلا اوقات ہی کیا تھی۔ نغمہ کی اس کے آگے۔ کہاں وہ شہر سے آئی، وہیں کی ایف اے پاس جو ہاتھوں ہاتھ یہاں استانی لگ گئی تھی اور کہاں یہ پنڈ کی جٹی نغمہ۔ کھلے پائینچوں والی شلوار پہننے والی اور فیشن سے بے بہرہ۔ کیا تھا جو گریجویٹ ہونے والی تھی، بھلا پرائیویٹ پڑھائی بھی کوئی پڑھائی تھی۔

وہ شیر دل کو اب گھاس ڈالنا بند کر چکی تھی کیونکہ اسے نیا شہری گدھا ملا گیا تھا اپنی ان ہی شہری کزنز کی بدولت لیکن دل میں شیر دل کی منگنی کا سن کر کبھی آگ لگ گئی تھی۔ اب بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ شیر دل سے رابطہ کر کے یہ منگنی تڑوا دے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ شیر دل کو مزید اپنے ساتھ چپکانا نہیں چاہتی تھی۔ اگر اسے اشارہ مل جاتا تو وہ منگنی کیا ہر شے توڑ پھوڑ دیتا۔ اس کے لیے بس اس رابطے کے آفٹر ایفیکٹس نے اسے شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔

وہ اکتا کر وہیں ایک طرف ٹیک لگا کر بیٹھنے کا سوچ رہی تھی جب اسے نغمہ آتی دکھائی دی۔ ساتھ اس کے حسب معمول بودی بھی تھا۔

''ایک تو اسے دم چھلے بڑے پسند ہیں۔ نکمی سارے جہان کی۔ چنے بیچ کر پڑھائی کر رہی ہے۔ میری طرح کیا ہوتا نا ایف اے تو میں دیکھتی کیسے بی اے کرتی ہے۔۔ ہونہہ۔'' نغمہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ چادر کے پلو سے چہرہ صاف کر کے اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے روزینہ کو سلام میں پہل کی۔ جس کا اس نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

دونوں کے مابین کچھ پل کو بالکل خاموشی چھا گئی جیسے نہ وہ کچھ کہنے آئی تھی نہ اسے کچھ سننا تھا۔ بودی قریب ہی ٹوٹی شاخ سے مٹی اڑا رہا تھا تو کبھی اچھل کر پتوں کو شاخ سے مارنے کی کوشش کرتا۔ نغمہ نے خاموشی توڑی۔

''اوئے بودی! جا گھر جا۔ تیری اماں نے کہا تھا جلدی واپس بھیج دوں تجھے اسکول کا کام پڑا ہے تیرا کافی۔''

''او آپا نغمہ! اماں نے کبھی میری کتابوں کو کھول کر نہیں دیکھا، مجھے کام تے مٹی کرائے گی۔'' وہ استہزائیہ مٹی اڑا کر بولا۔

''جانا۔ باتیں نہ چگ ادھر سے۔ چل نکل۔'' اس نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ نغمہ اس کے جانے کے بعد گلا کھنکھارتے ہوئے روزینہ کی جانب متوجہ ہوئی جو حسب عادت اپنی چوٹی سامنے ڈالے اس کے بلوں سے چھیڑ چھاڑ

کر رہی تھی۔ نغمہ کن انکھیوں سے قریب ہی کچی دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھے شیر دل کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''روزینہ۔ وہ مجھے تجھ سے کچھ کہنا تھا۔ اصل میں۔''

''اصل میں مجھے بھی تجھ سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ نغمہ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے کہ شیر دل سے منگنی ہوگئی تیری، تو قلوپطرہ بن گئی۔ تیری جرات کیسے ہوئی اس سے منگنی کروانے کی۔''

''یہ جرأت میں نے نہیں ہمارے بڑوں نے کی ہے روزینہ۔ اور میں تجھ سے یہی کہنے آئی تھی کہ تو شیر دل سے رابطہ کرلے ایک بار۔ اس دن تیرے گھر بھی تجھ سے یہی کہا تھا مگر تو نے شاید اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ شیر دل تجھ سے محبت کرتا ہے روزینہ۔ وہ تجھ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن تو نے اپنا نمبر بند کر رکھا ہے۔ ابھی بھی بس اتنا ہی کہنے آئی ہوں کہ تو ایک بار اس سے بات کرلے تاکہ وہ اگلا قدم اٹھا سکے۔''

''یہ اتنا لمبا بھاشن کس خوشی میں دے رہی ہے تو مجھے۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے یا نہیں وہ میں جانوں۔ لیکن میں کسی قیمت پر اس سے تیری منگنی رہنے نہیں دوں گی۔ میں جانتی نہیں کیا کہ وہ پورے پنڈ کا سب سے بھروسے اور اس سے شادی کر کے تو مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے تو ایسا میں ہونے نہیں دوں گی۔ میں تو شہر جانے والی ہوں، وہیں شادی کروں گی کسی شہری سے، مجھے ساری عمر اس پنڈ میں تھوڑی رہنا ہے۔ شیر دل لاکھ اچھا سہی پر میری مرضی کا نہیں ہے وہ۔ کدھر میں شہر کی بارہ پڑھی ہوئی کہاں وہ پنڈ کا دسویں پاس گنوار جسے فیس بک اور واٹس ایپ کا ہی پتا نہیں تھا۔ وہ ڈنگروں میں رہ کر ڈنگر بن چکا ہے۔ میں اپنی زندگی خراب نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر جو ہوا ہے، اس پر اعتراض کیوں ہے تجھے روزینہ۔ یہ منگنی کیوں تڑوانا چاہتی ہے اور شیر دل بھلا کس آسرے پر توڑے گا منگنی؟''

''ایسے۔ ایسے توڑے گا وہ۔'' روزینہ نے لہرا کر دو چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''آج میں اس سے کہوں گی نا کہ میں اس کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرسکتی۔ مرجاؤں گی اس کے بغیر اور نغمہ مجھے دھمکا کر گئی ہے کہ میں شیر دل سے رابطہ ختم کردوں ورنہ وہ مجھے پورے پنڈ میں ذلیل کردے گی تو دیکھنا کیسے شام سے پہلے سارا شگن تیرے منہ پر مار کر آتا۔ تو سمجھتی کیا ہے مجھے۔ اس کے بعد میں شہر چلی جاؤں گی اور وہ پوری حیاتی میری اڈیکوں میں رہے گا۔''

''شیر دل کے اتنے بُرے دن نہیں آئے ابھی استانی۔''

یک دم وہ دیوار کے پار سے نکلا تھا۔

روزینہ کا رنگ فق ہوا تھا۔ نغمہ بھی پل بھر کو تھرا اٹھی۔ یہ طے نہیں ہوا تھا کہ شیر دل یوں سامنے آ جائے گا۔ مگر اس کا سرخ چہرہ اس کے ضبط کی کہانی سنا رہا تھا۔

''شیرو کوئی کھڈونا نہیں استانی۔ تیری دل پشوری کے لیے نہیں بیٹھا ہوا یہاں۔ تجھے کیا لگتا ہے کہ نغمہ سے منگنی میری اب ہوئی ہے۔ نا نا نا۔ بچپن کی۔ بچپن کی منگ ہے یہ میری۔''

کہتے کہتے وہ نغمہ اور روزینہ کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

''تو شہری ہے تو میں پنڈ کا ہوں، پنڈ والوں کو اتنے آرام سے دانہ نہیں ڈال کر جاتا کوئی۔ تیرے سارے کام میرے سامنے تھے۔ وہ منڈا جو ڈھیلی پینٹ پہن کر آیا تھا چار دن پہلے پنڈ۔ میں تب ہی سب کچھ جان گیا تھا استانی۔ یہ تو آج تجھے یہاں بلانے کا مقصد بس تجھے تیری اوقات دکھانا تھا۔ نغمہ میری بچپن کی محبت ہے۔ تُو تو راہ میں آنے والا گھڑا تھی جس میں میرا پیر اڑ گیا تھا۔ ورنہ منزل میری، میں جانتا تھا۔ یہ جو واٹس ایپ۔ وٹس ایپ ہیں نا ان کا استعمال مجھے چنگی طرح آتا ہے تب ہی تو تیری اس شہری کزن سے تیرا نیا نمبر لے کر پچھلے ایک ہفتے سے کسی اور نمبر سے تجھ سے بات کر رہا ہوں اور تُو یہ

جانے بغیر کہ میں کون ہوں، کدھر ٹھکانا ہے میرا، بس شہری منڈا سمجھ کر میرے ساتھ بھاگنے کو بھی تیار ہوئی بیٹھی ہے۔ فٹے منہ ایسی سوچ پر بھی۔''

روزینہ کا چہرہ خفت سے زرد پڑتا جا رہا تھا۔ شیر دل سب سچ کہہ رہا تھا وہ واقعی کسی انجان بندے سے کئی دن سے بات چیت میں کافی آگے نکل آئی تھی اور دوسری طرف اپنے شہری کزن کے ساتھ بھی سیٹنگ کر رکھی تھی۔ وہ شیر دل کو اتنا چالاک نہیں سمجھتی تھی۔ اسے تو اپنی کزن پر حیرت تھی جس نے شیر دل کو اس کا نیا نمبر دے دیا اور بتایا بھی نہیں۔ ماتھے پر آیا پسینہ صاف کر کے وہ چلانے والے انداز میں بولنے کے لیے پر تولنے لگی تھی کہ شیر دل نے ٹوک دیا۔

''چپ۔ بالکل چپ۔ منہ توڑ دوں گا نہیں تو۔ پینڈو مرد جتانی کی اونچی آواز نہیں سہتے۔ یہ شہر نہیں کہ کرتوت کر کے رولا ڈال دے اور کٹ پڑ جائے بے چارے بندے کو۔ بی بی ادھر ناک کاٹ دیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اج کے بعد جتنے دن پنڈ میں ہے منہ نہ دکھانا ورنہ باسط پائین کے کھوہ میں پھینک دوں گا۔ سمجھی۔ چل اب اپنے گھر دفع ہو اس سے پہلے کہ میں بے بے کو مامے رحیم کے پاس بھیجوں کہ جا کر تیری سب کرتوتیں کھول آئے۔ تو تو ویسے ہی ایک آنکھ نہیں بھاتی اسے۔''

وہ ہکا بکا کھڑی روزینہ کو تنفر سے دیکھتا مڑا تو نغمہ واپسی کے لیے پلٹ چکی تھی۔

ایک پل بھی مزید دیر کیے بنا وہ اس کے پیچھے لپکا تو روزینہ کو ہوش آیا۔ اس کی نغمہ کے لیے بے تابی اس قدر عیاں تھی کہ پہلی بار اسے خیال آیا کہ کہیں واقعی شیر دل کے ہاتھوں وہ ہی بے وقوف تو نہیں بنی تھی۔ اور یہ جو اتنے دن سے جس لڑکے سے باتیں کر رہی تھی وہ شیر دل تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوا تھا۔

اس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اپنے تئیں وہ شہری لڑکا سمجھ کر اسے شادی تک تو لے آئی تھی۔ پوز بنا بنا کر تصویروں کی بھی بھرمار کر دی تھی۔ کیا ہو جو شیر دل سارا کچھ اٹھا کر اس کے نانا کو دکھانے چلا آئے۔ وہ اس گاؤدی سے کچھ بھی توقع رکھتی تو کم تھا۔ وہ ایسی باتوں میں آئی تھی کہ بنا سوچے، بنا جانے ہر روز ڈھیروں تصویریں بھیجتی رہی۔

حسد اور جلن کے احساس سے لبریز آنکھوں سے وہ شیر دل کو نغمہ کے پیچھے جاتا دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس پل۔ کتنی تن کر چل رہی تھی نغمہ۔ کیسا بانکا سجیلا نوجوان اس کے پیچھے اسے مناتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

روزینہ نے حقارت سے ایک جانب تھوک دیا۔ اسے جلد از جلد اس پنڈ سے چلے جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ چہرے اور بالوں پر ہاتھ پھیرتی گھر کی جانب چل دی۔ اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ واٹس ایپ اور فیس بک کے چکر میں خاصی خواری ہو گئی تھی اس کی۔

نغمہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر جا رہی تھی۔ وہ غصے سے زیادہ رنج کی کیفیت میں تھی۔ شیر دل سے ناراضی اتنی تھی کہ وہ اس کی صفائی بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ سمجھتا کیا تھا وہ خود کو۔ جب دل کیا جھاڑ پر چڑھا دیا، جب دل کیا اتار کر پٹخ دیا۔ کیسی کیسی باتیں نہیں سنی تھیں اس نے روزینہ کے منہ سے اس ایک شخص کے لیے۔ اس کا کون سا طنز تھا جو نہیں سہا تھا۔ اب سب یاد آ رہا تھا تو دکھ ابل ابل کر آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ پانی اتنا تھا کہ رستہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی پل اس کا پیر رپٹا اور گرنے سے پہلے ہی شیر دل نے اس کا بازو تھام لیا۔

''کدھر بھاگی جا رہی ہے۔ کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔ سنتی کیوں نہیں۔'' وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ مگر وہ بلاوجہ چڑ گئی۔ اسی تیزی سے قدم اٹھاتی بولتی چلی گئی۔

''مجھے نہیں سننی تیری کوئی بھی بات شیر دل۔ کس لیے سنوں۔ اب جب تیری روزی، روزینہ بن گئی ہے تو تجھے نغمہ کی قدر ہونے لگی۔ اس نے تیرا استعمال کیا، فائدہ اٹھایا اور جب دل بھر گیا تو میرے حوالے بھی کرنے کو تیار نہ تھی اور تو مجھ پر اس کے لیے شک کرتا رہا

کہ میں نے ہی اسے بھڑکا دیا ہے تیرے خلاف۔'' وہ ایک جھٹکے سے پلٹتے ہوئے ہوئی رکی۔ شیر دل دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے خود بھی ٹھہر گیا۔

''آج اگر تُو نے خود اس کی باتیں سن نہ لی ہوتیں تو تجھے کبھی میرا یقین نہ آتا شیر دل۔ تُو ہر چمکتی چیز کو دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے، میں تیری عادت جانتے ہوئے بھی خاموشی سے تجھے دل میں بسائے بیٹھی رہی۔ پر اب اور نہیں۔ تُو اج میری واہ واہ کرے گا کل پھر کسی اور کے قصیدے پڑھنے لگے گا۔ دنیا سے نہ حسن ختم ہونا ہے نہ فریب۔ کب تک دھوکے کھاتا رہے گا اور آہیں بھرتا رہے گا۔ اچھا یہی ہے کہ جا اور بے بے سے کہہ کر منگنی ختم۔ کروا دے شیر دل۔ میں ساری عمر دکھ نہیں سہہ سکتی۔''

''بول لیا کہ اور بھی کچھ بولنا ہے۔ ویسے زبان تو تیری بھی واہ تیز ہے۔ اب میری بات سن نغمہ۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن میری بات کا یقین کر، تُو مجھے بچپن سے جانتی ہے کہ میں تیرے سے جھوٹ نہیں بولتا نہ کچھ چھپاتا ہوں۔ چھپایا ہوتا تو پہلے دن سے لے کر اب تک کی ساری کہانی تجھے پتا نہ ہوتی اور تُو مجھے اج ان ہی باتوں کے مہنے (طعنے) نہ دے رہی ہوتی۔ روزینہ پر شک مجھے اسی دن ہو گیا تھا جس دن میں نے شہر سے آیا باؤ ان کے گھر جاتا دیکھا تھا اور پھر اس کے ساتھ روزینہ مجھے اپنی چھت پر چڑھی نظر آئی۔ اسی دن میں نے دوسری سم لی اپنے یار سے اور اس کی کزن سے اس کا نیا نمبر بھی۔ چار تعریفیں اس کی بھی کر کے واسطہ دیا کہ روزینہ کو اس بارے میں نہ بتائے جس کا مجھے یقین نہیں تھا لیکن اللہ کی طرف سے وہ خاموش رہی۔

اس نمبر سے میں نے روزینہ سے دن رات رابطہ کیا اور وہ جو مجھے ملتی نہیں تھی اب ہر وقت واٹس ایپ پر تگنگی ملتی۔ اس سے زیادہ کیا معلوم کرنا تھا میں نے۔ یہ سارا آج والا ڈرامہ تو تیرے لیے کیا میں نے تا کہ تیرے سامنے میں اسے اس کی اوقات دکھا دوں۔ مجھے پتا تھا پچھلی باری بھی اس نے تیری کتنی بیستی کی تھی، بودی نے بتایا تھا مجھے کہ تُو مامے رحیم کے گھر سے روتے ہوئے نکلی تھی۔ میں دیکھ کچی بات کروں گا کہ مجھے دکھ بہت ہوا استانی کے ایسا کرنے کا۔ بے بے کے ساتھ بھی خواہ مخواہ کپت ڈال دیا میں نے، بس ایویں غصہ تھا بہت جو دل کر رہا تھا ساروں پر اتار دوں۔

دیکھ شیرو نے کبھی کسی مائی کے لعل سے معافی نہیں مانگی لیکن تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ معاف کر دے مجھے، غلطی ہو گئی مجھ سے۔ آئندہ ایسا ہوا تو قسمے جو سزا دے گی قبول ہو گی مجھے۔''

نغمہ کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھر کر سمٹی۔ وہ دل میں خوش بھی ہوئی پر اتنے آرام سے راضی ہو جاتی تو جو اتنا دل دکھا تھا اس کا کیا؟ اس لیے آنکھیں ماتھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

''تیرا اعتبار ہی نہیں رہا مجھے شیر دل۔ تُو اج کچھ تو کل کچھ۔ کل کو اور کوئی نظر آ گئی تو پھر مجھ سے آنکھیں پھیر لے گا۔''

چلتے چلتے وہ چاچے کمالے کے گھر کے قریب آ گئے تھے، جہاں سے چاچی فریدہ کے چلانے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ نغمہ نے ہنسی دبائی تو شیر دل نے موقع غنیمت جان کر فوراً کہا۔

''جیسے چاچی نے چاچے کو نکیل ڈال رکھی ہے نا ویسے ہی تُو مجھے ڈال کر رکھنا۔ پھر نہیں میں جاتا ادھر ادھر۔''

وہ دونوں ہاتھ لہرا کر سر کی پشت پر باندھ کر ترنگ سے چلتا ہوا بولا۔ اب کی بار نغمہ کی ہنسی نہیں رکی۔ ایک تو اس کی بات پر، دوسرا عین اسی وقت چاچا کمالا گھر کے دروازے سے باہر اس انداز میں نکلا جیسے پیچھے سے دھکا دیا گیا ہو۔ ساتھ ہی درمیانے سائز کا اسٹیل کا ڈول بھی چاچے کے پیروں میں اچھال دیا گیا جس سے بچنے کے لیے چاچا خود بھی اسپرنگ کی مانند اچھلا تھا۔

''ہی ہی۔ وہ تیری چاچی اج پھر پٹڑی سے اتری ہوئی ہے۔ بوہت ہی غصہ آ جاتا ہے نمانی کو۔ دہی لینے جا رہا ہوں۔ لسی شسی پیے گی تو دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

ان دونوں کو دیکھ لینے کے بعد وہ کھسیاتے

ہوئے بولا تو آگے سے دونوں کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''چلو دفع ہو گھر۔ منگنی کرا کے بوہتے چوڑے ہو گئے ہو۔ کھلے عام پھرتے پھر رہے ہو۔ شرم ہے کہ نہیں۔''

ان کے ہنسنے سے چاچے کو غیرت آئی تو الٹا جھاڑ دیا۔ خود ڈول میں دہی لینے چل دیا اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

''دیکھ۔ ایسے تیری غلامی کروں گا۔ من جا۔ چھوڑ اب ناراضی نغمہ۔ نا منہ پھیر میرے سے۔'' وہ اسے مزید لالچ دیتا بولا تو نغمہ کے قدم رک گئے۔ اس نے سنجیدگی سے شیر دل کو دیکھا اور سبھاؤ سے بولی۔

''تجھے کیسے لگا شیر دل کہ مجھے ایسا خاوند چاہیے جسے ہر وقت میرا تراہ (ڈر) ہی پڑا رہے۔ میاں بیوی اک ہی درخت کی ڈالی ہوتے ہیں جو دھوپ لگے تو دونوں سہیں، جو مینہ برسے تو دونوں بھیگیں۔ دکھ سکھ کا ساتھ ہوتا ہے، خوشی غمی کا ملن ہوتا ہے۔ حد سے بڑھے ہوئے رعب نہیں سہتا یہ رشتہ۔ سمجھے۔''

''سمجھ گیا۔ تُو بوہت سیانی ہے نغمہ۔ میں تو تیرا شاگرد بن کر رہوں گا۔ بس منگنی نہ توڑ۔ دیکھ تجھے واٹس ایپ پر روز چنگے چنگے میسج کیا کروں گا۔ اور صرف تیرا ہی نمبر میرے پاس رہے گا۔''

''جب دل سے دل کے سگنل ملے ہوں نا شیر دل تو ان موبائلوں اور واٹس ایپ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ تو شیطانی حیلے ہیں۔ ان میں کل کوئی اور تو پرسوں پھر کوئی اور۔ یہ تو مزے سے مزہ جڑا ہے شیر دل۔ اس میں جتنا گھسے گا، اتنا ہی گند لگتا جائے گا اپنے ساتھ۔ لیکن جب دلوں میں رب محبت پیدا کر دے تو یہ سب ذریعے کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھلا ان کے لالچ میں کیوں ڈال رہا ہے۔''

پہلی بار شیر دل کا دل فخر کے عجیب سے احساس سے معمور ہو گیا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی ہوتا تو اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کر دیتا جو اس وقت وہ نغمہ کے لیے محسوس کر رہا تھا۔ اسے بے بے کی سب باتیں ایک دم سچی محسوس ہوئیں۔

''تو پھر معاف کر دے نا۔ میں بڑی بڑی نہیں کروں گا لیکن نغمہ میری منزل تُو ہی ہے باقی سب تو سراب تھا۔ جس نے مجھے ایویں بھگایا اپنے پیچھے۔ میری ہر راہ تیرے تک آتی ہے۔''

اس سے زیادہ خوبصورت اظہار بھلا وہ اپنے پنڈ کے سب سے بھرو جوان کے منہ سے کیا سنتی۔ اب ایسی بھی کہاں کی اکڑ تھی۔ وہ تو شفاف دل کی مالک تھی، ریا کار نہیں تھی۔ شیر دل کو اگر احساس ہو گیا تھا تو صد شکر۔ وگرنہ وہ کون سا اس شادی کو روکنے کی کوشش کرنے والی تھی۔ وہ اس کی دھڑکنوں میں بستا تھا۔ سبق ضرور سکھانا چاہتی تھی اور روزینہ کی اصلیت بھی بتانا چاہتی تھی، جس کے لیے آج قدرت نے خود موقع فراہم کر دیا۔ اب تو اپنے ہی کھونٹے سے باندھے رکھنا تھا اسے ہمیشہ۔

وہ مسکراہٹ دباتی چادر کا پلو اچھے سے سر پر جماتی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھ تک آنے کے بعد اپنے سب کواڑ بند کر لینا شیر دل۔ جس سے کوئی پرائی ہوا اندر داخل نہ ہو سکے۔ تُو میرے دل کا چین بنے اور میں تیرے دل کا قرار۔ ہم دونوں اک دوجے کے منٹھار بنیں۔''

''باتیں تو تُو رج کے سوہنیاں کرتی ہے۔ تیری قسم شیر دل کبھی تجھے دغا نہ دے گا۔''

نغمہ کے چہرے پر بے حد اطمینان پھیلا تھا۔ اس کی مراد نا تمام نہیں رہی تھی۔ قدرت نے بڑے سبھاؤ سے اس کے رستے آسان کر دیے تھے ورنہ بظاہر اس کے پاس وہ اوصاف نہیں تھے جن سے وہ روزینہ کو مات دے پاتی۔ شام ڈھلنے والی تھی، شیر دل دو قدم اس سے آگے چلنے لگا۔ اس کے پیچھے گھر تک جاتے ہوئے نغمہ کے قدم کہکشاؤں کو زیر کر رہے تھے۔ شیر دل نے پلٹ کر ایک نگاہ اس کے چمکتے خوب صورت چہرے پر ڈالی، مسکرا کر چہرہ واپس موڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بے بے نے سچ کہا تھا کہ جو روپ مٹھی مٹھی لو دے اس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، دل سکون پاتا ہے۔

☆☆

نمرہ احمد

حالم

تینتیسویں قسط

جب عارف واپس قید خانے میں آیا' ایڈم دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھا تھا کہ قلم ساتھ پڑا تھا اور گھٹنوں پہ رکھا کاغذ ہنوز کورا تھا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ سیاہی اب اس کے آدھے چہرے تک پھیل چکی تھی۔ عارف کی نظریں اس کے دوسرے بازو تک گئیں۔

سیاہی نے اس کو بھی ڈھانک رکھا تھا۔ قید خانے سے جلد کے گلنے سڑنے کی بدبو الگ اٹھ رہی تھی۔ عارف نے ناک پہ رومال رکھا اور اس کے قریب آیا۔ پیچھے ایک سیاہی پہرے پہ کھڑا تھا۔ اس نے بھی ناک کو کپڑے سے ڈھانک رکھا تھا۔

''آدم.....'' ناگواری سے اس کو آواز دی۔

ایڈم نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میں نہیں لکھ سکا کچھ۔'' اس کی آواز مدھم تھی۔

''دیکھو..... چند الفاظ لکھ لو۔ خدا کے لیے۔''

''میرا ہاتھ نہیں چل رہا۔ راجہ۔ راجہ کو بلاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔'' اس کی آواز میں درد تھا۔ بے بسی تھی۔ عارف پریشانی سے مڑا اور سیاہی کو مخاطب کیا۔

''اسے کچھ کھانے کے لیے دو۔ تاکہ اس کی

توانائی بحال ہو۔''

''راجہ نے منع کیا ہے۔اسے پانی کے سوا کچھ نہیں دینا۔''

''یہ صبح تک ویسے ہی مر جائے گا۔ مجھے اس سے یہ خط لکھوانا ہے۔'' وہ زچ ہو کے بولا مگر سپاہی نے گردن ہلا دی۔

''راجہ نے جو فرض مجھے سونپا ہے' میں اسے پورا کروں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... راجہ کو بلاؤ۔ان سے کہو جلدی آئیں۔اس نوجوان کا آخری وقت ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔ پھر ایڈم کو پکارا۔ ''کیا تم چند سطور بھی نہیں لکھ سکتے؟''

''راجہ کو بلاؤ'' وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔سپاہی ناک پہ ہاتھ رکھے فوراً سے باہر نکل گیا۔

جس وقت مراد راجہ عجلت میں قید خانے میں پہنچا' عارف سر جھکائے سامنے ایک چوکی بیٹھا تھا۔ اس کے مقابل ....سلاخوں کے پار....ایڈم اسی حالت میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس کے چہرے کی ساری جلد اب گلی سڑی نظر آتی تھی۔ سوائے چند دھبوں کے سارا چہرہ سیاہ ہو چکا تھا۔بس آنکھیں پہچانی جاتی تھیں۔

مراد نے اونہوں کہتے ہوئے ہاتھ ناک پہ رکھا اور برہم نظروں سے ایڈم کو دیکھا۔

''اس نے خط نہیں لکھا؟''

''راجہ....اس کو کچھ کھانے کے لیے دے دیتے ہیں' تاکہ اس میں لکھنے کی توانائی آئے....''

''مراد راجہ....'' کوڑھ زدہ قیدی بولا تو عارف خاموش ہو گیا۔ ''مجھے درد نہیں ہو رہا....آپ نے مجھ سے میرے سارے درد چھین لیے ہیں.....''

مراد خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ ماتھے پہ بل تھے۔

''مجھے یہ فیصلہ مشکل لگتا تھا..... چے تالیہ کو چھوڑنا....مگر آپ نے اسے میرے لیے آسان بنا دیا۔'' وہ توڑ توڑ کے الفاظ ادا کر رہا تھا۔نظریں درد دیوار پہ جمی تھیں۔ ''حالانکہ..... حالانکہ میرے پاس اب کوئی راستہ نہیں بچا....پھر بھی....آپ چے تالیہ سے کہنا کہ میں ان سے دستبردار ہوتا ہوں۔ایڈم بن محمد اب کبھی تالیہ اور فاتح کے درمیان آنے کا نہیں سوچے گا۔ مجھے اب چے تالیہ کے لیے جینے کی خواہش بھی نہیں رہی۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' مراد سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میری جتنی زندگی باقی ہے....میں وہ اپنے لیے جیوں گا....جہاں بھی....جیسے بھی.....اب میں پرسکون ہوں۔مگر.....'' اس نے نظریں مراد کی طرف پھیریں۔

''میں ایک عام انسان تھا..... مجھے عام موت نہیں چاہیے تھی۔میں اپنی موت کو آپ کے لیے یادگار بنانا چاہتا ہوں۔''

وہ ہلکا سا کھانسا۔مراد اتنی دور سے' اس نیم اندھیر ماحول میں بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کے سیاہ گلی سڑی جلد کی تہہ میں جذب ہو رہے تھے۔

''میں آپ کو کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اچھے والد نہیں ہیں۔آپ نے اپنی بیٹی سے ویسی محبت نہیں کی جیسی کرنی چاہیے۔ماں باپ کا کام ہوتا ہے....اپنے بچوں کی حفاظت کرنا۔ان کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کی ڈھال بن جانا۔آپ کو بس اتنا کرنا تھا۔اتنی سازشوں کی ضرورت نہ تھی۔''

عارف ناک پہ رومال رکھے خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔مراد کے چہرے پہ البتہ کوئی تاثر نہ تھا۔

''آپ کے پاس اب بھی موقع ہے۔چے تالیہ سے ویسے پیار کر کے دیکھیں جیسے کرنا چاہیے تھا۔وہ جس کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں' جہاں رہنا چاہتی ہیں' ان کو ان کی مرضی کرنے دیں۔آپ چے تالیہ کو ویسے نہیں جانتے جیسے میں جانتا ہوں۔ان کو آزاد کر دیں۔میری جان لے لیں' راجہ۔مگر ان کو آزاد کر دیں۔''

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ اور گردن راجہ کی طرف سے موڑ لی۔ اب مراد اس کا نیم رخ دیکھ سکتا تھا۔ وہ کافی دیر خاموش رہا تو مراد اکتا کے بولا۔ ''کہہ چکے؟''

ایڈم بن محمد نے جواب نہیں دیا تو مراد نے سر جھٹکا۔

''اس کو کھانا لا دو۔ شاید یہ چند سطور لکھ دے۔''

وہ مڑا اور باہر کی طرف بڑھا۔ دوسرے سپاہی نے قدرے سراسیمگی سے پکارا۔

''راجہ.... یہ زندہ ہے۔''

مراد نے اکتا کے کہا۔ ''ہاں وہ زندہ ہے۔ اسے کچھ کھانے کے لیے لا دو۔'' وہ باہر نکلا تو عارف بھی پیچھے ہو لیا۔

سیڑھیاں چڑھ کے وہ دونوں اوپر آئے تو مراد راجہ فکر مند دکھائی دیتا تھا۔

''مجھے اس کی کتاب لا کے دو۔ میں اس کی لکھائی میں خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''شہزادی تاشہ بہت زیرک واقع ہوئی ہیں۔ وہ پہچان جائیں گی۔''

''ہوں۔ شاید ہمیں خط کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک گواہی کافی ہوگی۔'' مراد سوچ رہا تھا جب وہی سپاہی بھاگا بھاگا اوپر آیا۔

''راجہ۔ راجہ۔'' وہ ہانپ رہا تھا۔ ''وہ.... وہ جواب نہیں دے رہا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ وہ شاید.... وہ مر گیا ہے۔''

انسانی موت ایسا المیہ ہے جو سخت سے سخت دل کو بھی ایک دفعہ ہلا دیتی ہے۔ چاہے وہ سخت دل اس کے منتظر ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ تینوں واپس نیچے دوڑے۔

قید خانہ ویسا ہی تعفن زدہ تھا مگر اب.... کوڑھ زدہ ''قیدی'' دائیں پہلو فرش پہ گرا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا ہو۔ بدبو پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

''دیکھو.... وہ سانس لے رہا ہے؟''

سپاہی ہچکچایا۔ اس زمانے میں عام فہم رویہ یہ تھا کہ کوڑھ چھونے سے پھیلتا ہے۔ عارف تیزی سے تعفن زدہ کوٹھڑی کے اندر آیا' اور جھک کے اس کی گلی سڑی کلائی چھوئی۔

وہاں نبض کب کی ختم ہو چکی تھی۔ دل کی دھڑکن اور سانسیں بھی رک چکی تھیں۔

کوڑھ زدہ آدمی مر چکا تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ عارف نے مراد کو دیکھا اور افسوس سے سر ہلا دیا۔

''اس کی لاش کو سمندر میں بہا دو۔ اور اس راز کو یہیں دفن کر دو۔ اگر یہ بات کسی تیسرے فرد کو معلوم ہوئی تو میں تم دونوں کو مثال عبرت بنا دوں گا۔'' سرد آواز میں تنبیہہ کی اور آگے بڑھ گیا۔ عارف نے جھٹ سر ہلایا اور لاش کی طرف بڑھ گیا۔ اسے ہی اس کوڑھ زدہ لاش کو ٹھکانے لگانا تھا۔ جانتا تھا دوسرا سپاہی مدد نہیں کرے گا۔

☆☆☆

بنداہارا کا محل رات کی تاریکی میں ڈوبا تھا۔ چند قمقمے جل رہے تھے اور دیوار پہ لگی مشعلیں روشن تھیں جن کے باعث گردونواح میں راستہ تھوڑا بہت سجھائی دیتا تھا۔

مراد قید خانے سے سلطنت محل گیا تھا۔ اور عشاء کے بعد وہاں سے فاتح کے ہمراہ اپنے محل واپس آ رہا تھا۔ محل کے قریب اس نے سپاہیوں کو آگے بھیج دیا تھا اور خود گھوڑے سے اتر آیا۔ لگام تھامے' گھوڑے کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے فاتح کو دیکھ رہا تھا۔

وہ بھی اس کی تقلید میں گھوڑے کی لگام تھامے پیدل چل رہا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس' اپنی مخصوص سیاہ قبا کندھوں پہ ڈالے' وہ سوچ میں گم لگتا تھا۔

''وفاداری تمہارے نزدیک کیا ہے' وان فاتح؟'' اندھیری سڑک پہ چلتے مراد نے اچانک سے سوال پوچھا تو فاتح نے محض آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

''آپ کے نزدیک کیا ہے' راجہ؟''

''اپنے مفاد پہ کسی دوسرے کو ترجیح دینا' اس کے رازوں کی حفاظت کو مقدم رکھنا' اور اس کا غیر مشروط ساتھ دینا۔''

''اگر وفا صرف یہی ہوتی تو یہ آپ مرسل کے ساتھ نبھا چکے ہیں۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مراد نے چونک کے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''اتنی وفاداری تو سب آپ کے اچھے وقت میں نبھاتے ہیں' راجہ۔ وفاداری صرف یہ نہیں ہوتی۔''

''پھر کیا ہوتی ہے؟''

فاتح نے نگاہوں کا زاویہ اس کی طرف موڑا اور سادگی سے کہا۔

''جب راستہ تاریک ہو جائے تو الوداع نہ کہنا بلکہ ساتھ چلتے رہنا۔ وفاداری اندھیروں کے ساتھ کا نام ہے۔''

مراد رک گیا تو وہ بھی ٹھہر گیا۔ دونوں اب ایک دوسرے کے آمنے سامنے اندھیری سڑک پہ کھڑے تھے۔

''میں کیسے یقین کروں کہ تم میرے ساتھ وفادار ہو' فاتح؟'' مراد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا میں اب تک خود کو وفادار ثابت نہیں کر سکا؟''

''بظاہر تو تم نے سب کیا ہے لیکن ایک امتحان ابھی باقی ہے۔'' وہ ٹھہرا۔ بادل آسمان سے ذرا سے سمٹے تو چاند کا چمکتا ہوا کنارہ دکھائی دیا۔ ذرا دیر کو سڑک پہ روشنی بکھر گئی۔

''میں نے تمہیں برونائی کے ولی عہد کے طور پہ اس لیے متعارف کروایا تھا کیونکہ میں دیکھ چکا تھا' تاشہ تمہارے بغیر میری دنیا میں کبھی خوش نہیں رہے گی۔ کیا تم اس سے میری دنیا کے رواج کے مطابق شادی کرنا چاہتے ہو؟ ایسی شادی جس کا علم ساری سلطنت کو ہو۔''

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ فاتح کے چہرے پہ چھائے سکون میں واضح دراڑ پڑی تھی۔

''میں اور تالیہ ایک زمانہ پہلے اس رشتے میں خود کو باندھ چکے ہیں' راجہ۔''

''میں ایک علی الاعلان شادی کی بات کر رہا ہوں۔'' مراد کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔

''اور بدلے میں مجھے آپ سے چابی کا سوال نہیں کرنا ہوگا۔ ہے نا؟''

''ایسا ہی ہے۔ ویسے بھی تمہاری دنیا میں تمہارے لیے اب کیا رہ گیا ہے؟ تم وہاں کبھی حکومت نہیں کر سکو گے۔''

فاتح چپ ہو گیا۔

''میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے دوبارہ موقع ملے تو میں اپنا استعفیٰ واپس لے لوں گا اور دوبارہ سے....''

''تمہارے لوگ اب کبھی تمہارا اعتبار نہیں کریں گے' وان فاتح۔'' مراد زور دے کر بولا۔ ''تمہارے لیے وہاں اب کوئی محبت' کوئی التفات نہیں بچا۔ تاشہ نے بتایا تھا کہ تمہاری بیوی مر چکی ہے' تمہارے خواب ختم ہو چکے ہیں۔ بہت جلد تمہارے بچے تمہارا نام اپنے ساتھ لگانے سے احتراز کرنے لگیں گے۔ تمہاری دنیا راکھ ہو چکی ہے۔''

اندھیرے میں بھی وہ فاتح کی گردن میں ڈوب کے ابھرتی گلٹی دیکھ سکتا تھا۔

''مگر میری دنیا میں.... میں تمہیں ایک غیر ملکی شہزادے کے طور پہ خوش آمدید کہتا ہوں۔ تم سلطان کی بیٹی سے شادی کرو گے۔ تم میرے بنداہارا بن سکتے ہو۔ تم میرے ساتھ اس ملک پہ حکومت کر سکتے ہو۔ کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟''

''میں نے ایک دفعہ اپنے دوستوں کو بتائے بغیر آپ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ اگر میں نے دوبارہ ایسا کیا تو وہ میرا اعتبار کبھی نہیں کریں گے۔''

''میں آدم کو واپس اس کی دنیا میں بھیج سکتا

ہوں۔اور تم ....تم ادھر ہی رہ سکتے ہو۔'' مراد بہت آرام سے کہہ رہا تھا۔

''آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ مشتبہ نظروں سے راجہ کو دیکھ رہا تھا۔

''اپنی بیٹی کے لیے۔وہ تمہارے بغیر کبھی خوش نہیں رہے گی۔''

''یعنی تالیہ کو پانے اور ایڈم کو واپس اس کے ماں باپ سے ملانے کے لیے مجھے ایک دفعہ پھر مراد راجہ کے ساتھ پسِ پردہ سودا کرنا پڑے گا؟'' وہ ناخوشی سے بولا۔

''ہاں۔ مگر پہلے تمہیں اپنی وفاداری ثابت کرنی ہوگی۔'' مراد معنی خیز انداز میں کہہ کے آگے بڑھ گیا تو فاتح نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا مگر فی الحال مراد کا ارادہ نہ تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ محل میں داخل ہوئے تو اندھیرے باغیچے کے سامنے برآمدے کے زینوں پہ وہ منتظر دکھائی دی۔مراد کو آتے دیکھ کے وہ تیزی سے نیچے آئی۔

''باپا....ایڈم کہاں ہے؟ کیا وہ آپ کے ساتھ ہے؟''

وہ ان کے سامنے آ رکی اور بے قراری سے بولی۔

مراد نے گہری سانس لی اور فاتح کو دیکھا۔''تم نے اسے کہیں بتایا؟''

فاتح چونکا۔مگر بولا کچھ نہیں۔جیسے سمجھ میں نہ آیا ہو اس بات پہ کیا کہے۔

''آدم نے تندرست ہونے کے بعد مجھ سے پہلا سوال وقت کی چابی کے بارے میں کیا تھا۔''

''ظاہر ہے۔وہ واپس جانا چاہتا تھا۔مگر.....'' تالیہ ٹھہر گئی۔بے یقینی سے مراد کو دیکھا۔''کیا مطلب؟ باپا.....آپ نے.....''

''ہاں۔میں نے اسے وقت کی چابی دے دی۔وہ اپنی دنیا میں واپس جا چکا ہے۔''

چند لمحے کے لیے اندھیری سیڑھیوں پہ ششدر سا سناٹا چھایا رہا۔تالیہ اور خود فاتح بھی بے یقینی سے مراد کو دیکھ رہے تھے۔

''آپ نے..... ایڈم کو.....جانے دیا؟ مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''یہ فاتح اور اس کی خواہش تھی کہ ایسا ہی ہو۔''

وان فاتح نے چونک کے مراد کو دیکھا اور پھر تالیہ کو جس کی بے یقین نظروں کا رخ اس کی طرف مڑ چکا تھا۔

مراد راجہ اسی سادگی سے بتا رہا تھا۔

''وہ چابی محض آدم اور فاتح کے لیے تھی۔آدم چاہتا تھا کہ وہ تم سے ملے بغیر واپس جائے اور وان فاتح....'' مراد نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''وان فاتح واپس نہیں جانا چاہتا۔وہ یہیں رہنا چاہتا ہے۔مجھے بتاؤ میں نے کیا غلط کیا؟''

وہ ابھی تک صدمے کے زیرِ اثر لگتی تھی۔بس ٹکر ٹکر باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''وہ چابی...ظاہر ہے...فاتح اور ایڈم کے لیے تھی...مگر.....'' ذرا سنبھل کے بولی' پھر شکایتی نظروں سے فاتح کو دیکھا۔''مگر آپ نے مجھے بتانا مناسب تک نہ سمجھا؟ ایڈم مجھ سے ملے بغیر یوں کیسے جا سکتا ہے؟ کیا اس نے.....اس نے میرے لیے ایک فقرہ بھی نہیں کہا۔''

''کیا اس نے کچھ کہا تھا؟'' مراد نے سنجیدگی سے فاتح کو دیکھا جیسے اس وقت فاتح وہاں موجود ہو۔''کیونکہ اگر کچھ کہا ہو تو وان فاتح ضرور تمہیں بتائے گا۔مجھے اس کی وفاداری پہ شک نہیں ہوتا۔'' مراد اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا کہہ رہا ہو....بند اہارا کا عہدہ....یا سچ؟ فیصلہ تمہارا ہے۔

''نہیں۔وہ .....وہ بس اپنے ماں باپ کے پاس واپس جانا چاہتا تھا۔'' وہ رک رک کے بولا۔وہ اس جھوٹ کے لیے تیار نہ تھا اس لیے یہ کہنا مشکل لگا تھا۔

''کیا تم یہی نہیں چاہتی تھیں؟ کہ وہ تندرست ہو جائے اور واپس چلا جائے؟'' مراد اپنی بیٹی کو تعجب

سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ دونوں نے اسے واپس بھیج دیا؟ اور وہ چلا بھی گیا؟ مجھ سے ملے بغیر؟'' وہ ہنوز شاک کے زیرِ اثر لگتی تھی۔ پھر سر جھٹکا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''

پھر وہ پلٹ گئی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تعلیم' آداب' سب آج بھلا دیے۔

''تالیہ۔'' فاتح نے پکارا لیکن وہ نہیں رکی۔ وہ دور چلی گئی۔

''کیا یہ تھا وفاداری کا امتحان؟'' وہ مراد کی طرف گھوما اور بہت ضبط سے بولا۔

''ہاں اور تم اس میں پورے اترے۔ تم ملاکہ سلطنت کے بہترین بندا ہار ابنو گے' وان فاتح۔''

''میں نے ابھی ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''

''میں تمہاری آنکھیں پڑھ سکتا ہوں۔'' مراد نے مسکرا کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ''تم نے جھوٹ اس لیے بولا کیونکہ تم تخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔''

''آپ نے مجھے اس کی نظروں میں ناقابلِ اعتبار بنا دیا ہے۔'' وہ بولا تو آواز میں دکھ اور بے بسی تھی۔ مراد صرف مسکرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔

''کیا آپ کو واقعی اپنی بیٹی سے محبت ہے' راجہ؟''

مراد کے قدم ٹھہر گئے۔ وہ مڑا اور ناگواری سے فاتح کو دیکھا۔ ''کیا تمہیں اب بھی شک ہے؟''

میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب میں آپ کو تخت دلا دوں گا تو میں آپ سے کچھ مانگوں گا۔''

''ابھی میں سلطان نہیں بنا۔''

''لیکن تخت آپ کا ہی ہے۔ یہ شہزادے تو کٹھ پتلی ہیں۔'' فاتح سنجیدگی سے کہتا اس کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔''

''کہو۔'' مراد نے لب بھینچ لیے۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ 'مراد راجہ' بنے بغیر صرف.... صرف ایک باپ کی طرح اپنی بیٹی سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔''

مراد کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ ''یہ کس قسم کی شرط ہے؟''

''میں اس کو نہیں بتاؤں گا کہ آپ نے ایڈم کو مجھ سے پوچھے بغیر واپس بھیجا ہے اور میرے لیے چابی بنائی ہی نہیں ہے۔ اگر آپ یہ کام کر لیں' تو میں یہاں رہنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ ایک دن کے لیے تالیہ کے باپ بن کے دکھا سکتے ہیں؟''

''تمہیں لگتا ہے میں ایک اچھا باپ نہیں ہوں؟''

''یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ کیا آپ اپنی بیٹی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اس سے اس کی مرضی پوچھ سکتے ہیں؟''

''اور اس سے کیا ہوگا؟''

''اگر آپ واقعی اس کے باپ بن کے اس سے بات کریں گے تو آپ کو اسے ایڈم کے بارے میں سچ بتانا ہوگا۔ سچ بتائے بغیر آپ دونوں کا رشتہ کھوٹا رہے گا۔ میں نہیں مان سکتا کہ بغیر کسی بڑی وجہ کے آپ نے ایڈم کو خاموشی سے واپس بھیج دیا۔ کچھ ہے جو آپ چھپا رہے ہیں۔''

مراد چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس اندر کھینچی۔

''اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ ''تالیہ'' اور ''فاتح'' کے درمیان نہیں آنا چاہتا۔ وہ ''چے تالیہ'' سے دستبردار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اب 'چے تالیہ' کے لیے نہیں جیے گا۔''

مراد نے اس کے الفاظ دہرا دیے اور فاتح چند ثانیے کچھ بول نہ سکا۔ یہ ایڈم کے ہی الفاظ تھے۔ اور یہ اس کے لیے نئے تھے۔ یہ الفاظ کسی سازش' کسی منصوبے کا حصہ نہ تھے۔

''اس نے ایسا کہا؟'' جو بات دونوں کے درمیان تکلف میں ہمیشہ ادھوری رہ گئی تھی' اسے ایڈم جاتے جاتے پورا کر گیا تھا۔

مراد اسے وہیں چھوڑ کے اندر آیا تو نیم روشن

راہداریاں ویران پڑی تھیں۔اپنی خواب گاہ کی طرف جانے کے بجائے وہ تالیہ کے کمرے کی طرف آیا۔دروازہ کھلا تھا۔یہ بے دار بت بنے کھڑے تھے اور وہ پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ننگے پیر فرش پہ تھے۔اور خود گم صم خلا میں دیکھ رہی تھی۔

آہٹ پہ نظریں اٹھائیں۔پھیکی نقاہت سے مسکرائی۔کمرے میں دو مشعلیں روشن تھیں اس لیے اس کا چہرہ زرد روشنی میں واضح دکھائی دیتا تھا۔

''تم مجھ سے خفا ہو کہ میں نے اسے جانے دیا؟'' وہ اس کے پلنگ پہ بیٹھا اور نرمی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' تالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔''میں خود سے خفا ہوں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں نے آپ پہ شک کیا تھا' بابا۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔مراد نے اپنے چہرے سے اندرونی جذبات کی خبر نہ ہونے دی اور بظاہر عام انداز میں حیران ہوا۔

''کیسا شک؟''

''یہی کہ دوا کام نہیں کرے گی۔یا شاید ترکیب درست نہ ہو۔لیکن آپ نے اپنا وعدہ نبھایا۔مجھے آپ پہ کبھی شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پھر اس نے گہری سانس لی۔''جب مرسل نے اپنے بھائی کو مارا تو مجھے لگا میں اس پاگل دنیا میں نہیں رہ پاؤں گی۔میں بھی ایڈم اور فاتح کے ساتھ واپس جانے کا سوچنے لگی تھی لیکن آپ نے جو کچھ میرے دوست کے لیے کیا....اس کے بعد میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔''ایڈم صحت یاب ہو گیا' اور واپس چلا گیا' مجھے یہی چاہیے تھا۔لیکن وہ مجھ سے مل کے کیوں نہیں گیا۔''

مراد چند لمحے اس کا اداس چہرہ دیکھتا رہا۔

''وہ تمہارا دوست تھا۔'' توقف کیا۔''تمہارے نزدیک دوستی کیا ہے' تاشہ؟''

اس نے آنکھیں رگڑیں اور سادگی سے کہنے لگی۔

''کسی کی خوشی میں خوش' اس کے غم میں غمگین اس کو اعتبار اور مان دینا۔وفا نبھانا۔''

''اور محبت کیا ہوتی ہے؟''

تالیہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔''یہ نہیں۔''

''میں بتاؤں؟'' مراد آگے کو جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''محبت وہ دوستی ہوتی ہے جس سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔''

تالیہ مراد اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔

''اس نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بچے تالیہ اور فاتح کے درمیان سے نکلنا چاہتا ہے۔وہ بچے تالیہ سے دستبردار ہونا چاہتا ہے۔اور اب وہ بچے تالیہ کے بجائے اپنے لیے جینا چاہتا ہے۔''

اس کا انداز گہرا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس کا یہی کہنا کافی تھا۔

وہ یہ کہہ کے اٹھ گیا اور شہزادی پتھر کا مجسمہ بنی بیٹھی رہی۔

یہ بات نئی تھی۔یہ کسی سازش' کسی جھوٹ کا حصہ نہ تھی۔یہ ایڈم کیا کہہ گیا تھا؟

ایڈم اس کا دوست تھا۔صرف دوست۔وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا مگر وہ ایڈم کی نظر میں کیا تھی؟ وہ خالی نظروں سے مشعل کے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اس کو عصرہ کی گیلری میں ملا تھا۔وہ اس کو چور سمجھتا تھا۔وہ اس کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔وہ اس کے پیچھے کنویں تک آیا تھا اور پھر وہ ہمیشہ اس کے پیچھے آنے لگا۔

ایڈم بن محمد ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔مشکل میں اس کے پاس تسلی دینے کے لیے۔اس کو سمجھانے اور کبھی کبھار صرف اس کو سننے کے لیے۔ایڈم وہ سایہ تھا جو خاموشی سے اس کی چھاؤں بنا رہتا تھا۔اور اسے کبھی خبر ہی نہ ہوئی؟

ایک ایک کر کے یادیں ذہن سے ٹکرا رہی تھیں۔

''ایڈم کا دل قدیم ملاکہ میں ٹوٹا تھا۔'' (فاتح

جانتا تھا؟ وہ کیوں نہ جان پائی؟)

''تم نے کبھی ایڈم کو غور سے دیکھا ہے؟''

(داتن بھی محسوس کر گئی تھی۔ ایک وہ نہ کر سکی بس کی عقل سمجھ ان سب سے زیادہ تھی۔)

وہ اس کے انٹرویوز دیکھنا بھول جاتی تھی۔ وہ اس کی ای میلز کے جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ اس کے پاس صرف اپنی کہنے آتی تھی۔ اس نے کبھی بیٹھ کے سنا ہی نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا کون سا برتن تھا؟ اور وہ اس کی زندگی میں کیا تھی؟

''کیا میں کبھی اس سے پوچھ پاؤں گی کہ اس نے یہ سب مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' وہ ابھی تک سن سی بیٹھی تھی۔

(آپ کتابیں نہیں پڑھتیں' چے تالیہ؟)

مسکراتا ہوا لہجہ یاد آیا تو احساس ہوا کہ وہ خود بھی تو ایک کتاب ہی تھا۔ کیا وہ ہمیشہ یہ پوچھا کرتا تھا کہ وہ اسے کیوں نہیں پڑھتی؟ اور وہ جواباً کیا کہتی تھی؟ اپنے جواب یاد ہی نہیں تھے۔

''اوہ ایڈم!'' اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ ایڈم بن محمد اظہار کے اس عجیب طریقے سے اسے اداس کر گیا تھا۔

☆☆☆

صبح کی دودھیا روشنی ملاکہ کے اونچے محلوں پہ پھیلی تھی۔ رات کی ساری سیاہی کو اس نے دھو ڈالا تھا۔ پرندوں کا ایک غول چہچہاتا ہوا بندارا کے محل کے اوپر سے گزر رہا تھا اور وہ بالکونی میں کھڑی سر اٹھائے ان کو دیکھ رہی تھی۔

''تالیہ!'' آواز پہ اس کا ہاتھ نیچے آن گرا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ پھر بے یقینی سے پلٹی۔

مراد کمرے کے دروازے پہ کھڑا تھا جو بالکونی میں کھلتا تھا۔ کتنے عرصے بعد اس نے تالیہ کو تالیہ کہہ کے پکارا تھا۔

''بابا؟'' وہ خوشگوار حیرت سے بولی' پھر اسے دیکھا تو مزید چونکی۔

مراد کا حلیہ پہلے سے مختلف تھا۔ وہ خاکی رنگ کی بنا آستین کی جیکٹ میں ملبوس تھا اور اس نے گہرا سبز پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ماتھے پہ پٹی میں باندھنے کے بجائے بالوں کو پونی میں جکڑ رکھا تھا۔ نہ میان میں تلوار تھی نہ ہاتھ میں قیمتی انگوٹھیاں۔ بس کندھے پہ ترکش تھا اور چہرے پہ مسکراہٹ۔

''کیا تم شکار پہ جانا چاہتی ہو؟''

وہ کھلے دل سے مسکرا دی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ملاکہ کا جنگل الورسونگائی کے جنگل سے مختلف تھا جس میں بچپن میں وہ جایا کرتی تھی مگر شاید سارے جنگل اندر سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سارے راستے گم ہو جاتے ہیں اور وہ زندہ ہوتے ہیں۔

وہ دونوں شکار کے لباس میں ملبوس' کندھوں پہ ترکش اٹھائے جنگل میں چلتے جا رہے تھے۔ یہ ایک رین فاریسٹ تھا اور اونچے درختوں نے اوپر سبز چھت بنا رکھی تھی۔ بمشکل سورج کی روشنی جنگل کے فرش پہ پہنچ پاتی تھی۔

''کیا تم آدم کے لیے فکر مند ہو؟'' ایک سبز پانی کے جوہڑ کے کنارے پتھر پہ بیٹھتے ہوئے مراد نے سرسری انداز میں پوچھا۔ پھر ترکش اتار کے نیچے رکھا۔

''نہیں' بابا۔ وہ اپنی دنیا میں پہنچ جائے' اس سے زیادہ مجھے کیا چاہیے۔'' وہ ساتھ بیٹھتے ہوئے بولی، البتہ اس کے انداز میں اداسی تھی۔ مراد نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جوہڑ کی سطح پہ چمکتے درختوں کا عکس دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہیں یہاں کسی وجہ سے لایا ہوں۔''

تالیہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ چھوٹے سیاہ بالوں کو پونی میں باندھے' وہ بھی شکاریوں والے سادہ خاکی کرتے پاجامے میں ملبوس تھی۔

''کیا؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی زندگی کو کسی کنارے سے لگا لو۔ آدم جا چکا ہے اور فاتح یہاں رہنا چاہتا

ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو اپنے خاندان کا حصہ بنا لیں۔''

تالیہ نے تعجب سے پلکیں جھپکائیں۔ ''آپ چاہتے ہیں میں وان فاتح سے شادی کر لوں؟'' قدرے توقف سے تصحیح کی۔ ''مطلب.... ہم اپنی شادی کو ظاہر کر دیں؟''

''برونائی کے ولی عہد سے شادی برا سودا نہیں ہے۔'' مراد مسکرا کے بولا تو وہ بس اسے دیکھ کے رہ گئی۔

''بابا.... ان کو اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔ وہ یہاں نہیں رکنا چاہتے۔''

''وہ رکنے پہ تیار ہے۔''

تالیہ کی آنکھیں مشتبہ انداز میں چھوٹی ہوئیں۔ ''آپ نے ایک دفعہ پھر ان سے پس پردہ کوئی سودا تو نہیں کر لیا؟''

''میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ یہاں رکنا چاہتا ہے تو اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ آدم کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس میں سودا کیسا؟''

''مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔'' وہ تیزی سے بولی۔ پھر لب کاٹے۔ مراد نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں؟''

''میں.... بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ فاتح کو چابی بنا دیں تاکہ وہ چلے جائیں۔ وہاں ان کی زندگی ان کی منتظر ہے۔ ہم ان سے وہ نہیں چھین سکتے۔''

''کہیں تم اس کے ساتھ خاموشی سے چلے جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتیں؟'' مراد کا لہجہ خشک ہو گیا۔ زیرک نگاہیں تالیہ پہ جمی تھیں۔

وہ چند لمحے لب کاٹتی رہی۔ پھر گردن اکڑا کے بولی۔ ''نہیں۔ اگر ان کے لیے چابی بنانے کے عوض آپ مجھے یہاں رکھنا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''مگر وہ خود یہاں رہنا چاہتا ہے۔ میں اسے ملاکہ سلطنت کا بندا ہارا بنا سکتا ہوں۔'' مراد نے شانے اچکائے اور وہ بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔

''یعنی آپ دونوں نے واقعی پس پردہ سودا کر لیا ہے؟ آپ نے انہیں تخت کی پیشکش کی اور وہ لالچ میں آ گئے؟''

''تخت کا لالچ کسے نہیں ہوتا' تاشہ؟''

تالیہ نے ایک نظر اس کے شکاریوں والے حلیے پہ ڈالی۔ اسے تالیہ کہنا' یہ لباس' یہ ترکش' یہ جنگل کا سفر.... سب مراد راجہ اپنے نئے سودے کی تکمیل کے لیے کر رہا تھا۔

''آپ مجھے یہاں لائے تھے تو مجھے لگا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ صرف اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ایک دفعہ پھر مجھے اور فاتح کو استعمال کرنا چاہ رہے ہیں۔'' وہ دکھ سے بولی۔

''کیا تم حکومت نہیں کرنا چاہتیں؟''

''میں کچھ نہیں چاہتی۔'' وہ رکھائی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''

''تاشہ....'' وہ ساتھ ہی اٹھا۔

''آپ نے مجھ سے میرے دو دوست دور کر دیے' بابا۔ ایک کو وقت کے پار بھیج دیا۔ اور دوسرے کو بے اعتبار کر دیا۔ میں فی الحال تنہا رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں کہتی ایک طرف کو چلنے لگی۔ ترکش وہیں چھوڑ دیا۔ سینے پہ بازو لپیٹے اور دور چلتی گئی۔

''میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

مراد نے دیکھا وہ تھوڑی دور جا کے زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مٹی کھود رہی تھی۔ وہ بچپن میں اکثر ایسے کرتی تھی۔ ناراض ہوتی تو جا کے درختوں کے بیچ زمین پہ بیٹھ جاتی۔ جوتے اتارتی۔ مٹی کھودتی۔ اور ایک اونچا محل بناتی۔

وہ آج بھی یہی کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ غصے میں تیز تیز کام کر رہے تھے۔ وہ پھر سے محل بنا رہی تھی۔

وہ اسے وہیں چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔ دن

چڑھنے لگا تھا اور مراد کو محل جا کے بہت سے کام کرنے تھے۔ اسے اس لباس سے بھی چھٹکارا چاہیے تھا جو اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے پہنا تھا۔ اس نے وان فاتح سے کیا وعدہ اپنے تئیں پورا کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں اس کی مرضی کے منصوبے کے تحت چل رہے تھے اور چلتے رہیں گے۔ مراد کو مزید کسی محنت یا جہد کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا۔

وہ جنگل سے نکل کے محل کی طرف جانے والے راستے پہ چل رہا تھا جب ایک فقرہ ذہن سے ٹکرایا۔

''تاشہ ایک سمندری سفر پہ جائے گی جس سے وہ واپس نہیں آئے گی۔''

مراد ٹھہر گیا۔ گردن موڑی۔ جنگل کے اس پار ساحل سمندر تھا جو ویران پڑا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک دوسرا منظر لہرایا۔

وہ منظر جو وہ تھوڑی دیر پہلے دیکھ کے آیا تھا.....

مٹی پہ غصے میں بیٹھی تالیہ.....محل بناتے اس کے کیچڑ میں لتھڑے ہاتھ....اور اس کے جوتے۔

تالیہ نے جوتے نہیں اتارے تھے۔

(آپ چے تالیہ کو ویسے نہیں جانتے جیسے میں جانتا ہوں۔)

مراد ایک دم پیچھے کو بھاگا۔

(میں اپنی دنیا میں فریب کار تھی' بابا۔ میرا ہنر فریب دینا تھا۔)

وہ تیزی سے جنگل کی طرف واپس جا رہا تھا۔

(فریب کار وہ ہوتا ہے' بابا..... جو دوسرے کو وہ دکھائے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔)

ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ وہ پسینے میں شرابور ان کے درمیان بھاگتا جا رہا تھا۔

(مجھے صرف فریب کاری آتی ہے۔ اور جو مجھے کرنا آتا ہے' وہ میری جان ہمیشہ بچاتا رہے گا۔)

وہ اس مقام تک آیا تو دیکھا..... مٹی کا محل آدھا بنا ہوا کھڑا ہے۔ اور تالیہ وہاں نہیں ہے۔

مراد نے آنکھیں بند کیں' زیر لب کچھ پڑھا اور پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ وہ تیزی سے اس سمت بھاگا۔

چند درختوں کے درمیان ایک خالی قطعہ تھا۔ وہاں زمین پہ ایک ڈھکن کھلا ہوا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی کھڑا تھیلے میں کچھ ڈال رہا تھا۔ اس کی مراد کی طرف پشت تھی۔ قدموں کی آواز پہ وہ ٹھٹھک گیا اور پھر آہستہ سے پلٹا۔ مراد کو دیکھا تو ساکت رہ گیا۔

''آدم بن محمد!''

مراد راجہ سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایڈم کے ہاتھ تھیلے پہ رک گئے تھے۔ اس کا منہ ذرا سا کھل گیا' پھر اس نے افسوس سے سر جھٹکا اور اونچی آواز میں بولا۔

''سوری چے تالیہ.....لیکن آپ کے ولن باپ کو con کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔''

مراد کی نظریں ایڈم کے عقب میں اٹھیں۔ وہاں زمین میں ایک ڈھکن سا کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً نیچے سیڑھیاں تھیں

کیونکہ اگلے ہی لمحے زینے چڑھنے کی آواز آئی اور پھر..... وہ باہر نکلی۔ مراد کو دیکھ کے اس کی رنگت بدلی۔

وہ آہستہ سے باہر نکلی۔ پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہم پکڑے گئے ہیں۔'' ایڈم سرگوشی میں بولا۔

''فکر نہ کرو۔ میرا ولن باپ اکیلا ہے۔'' وہ اپنی زبان میں کہتی ایڈم کے سامنے آئی اور سرد مہری سے مراد کو دیکھا جس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

''تم مجھے دھوکہ دے رہی تھیں؟''

''آپ اپنے مقدر سے اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں بابا کہ لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں اور

آپ سلطان بن جائیں گے۔'' وہ طنز سے بولی۔

مراد نے بے بسی بھرے غصے سے ایڈم کو دیکھا۔ ''تم..... زندہ تھے؟''

وہ بالکل صحت مند نظر آرہا تھا اور اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی بند ہونٹوں سے منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔

''جی' راجہ۔ یہ زندہ تھا۔ اپنے تئیں تو آپ اسے مار چکے تھے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ یہ وہ تالیہ نہیں تھی جسے مراد راجہ جانتا تھا۔

''وہ کیا ہے' مراد راجہ کہ.....'' ایڈم ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا..... ''مجھے کتابوں نے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ اور آپ نے کبھی ہم سے سچ نہیں بولا۔ ہم تینوں کو معلوم تھا کہ آپ کبھی بھی اصل ترکیب نہیں دیں گے۔ مجھے اصل ترکیب کتابوں سے معلوم ہوگئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ آپ کی دوا مجھے کوڑھ میں مبتلا کردے گی۔ اس لیے میں نے دوا اپنی ترکیب کے مطابق بنائی تھی' آپ کی نہیں۔ گو کہ خود مجھے اور چے تالیہ کو ڈر تھا کہ ہم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں لیکن..... میں سورج نکلنے سے پہلے تندرست ہوگیا تھا۔''

''میں نے تمہاری لاش دیکھی تھی۔'' وہ مارے طیش کے یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

ایڈم نے ابرو اچکائے۔ ''ہماری دنیا میں اپنی جعلی موت ظاہر کرنا بہت عام سی بات ہے۔ کوڑھ کا یہی فائدہ ہے۔ اس کی بدبو دوسرے سیاہیوں کو قریب نہیں آنے دیتی۔ صرف ہمارا بندہ قریب آتا ہے۔''

''تمہارا بندہ؟'' مراد کا سانس تھم گیا۔

''عارف۔ ہم نے عارف کو خرید لیا تھا۔'' وہ اسی رکھائی سے مراد کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

''عارف کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ وہ ہم نے پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ ڈھیر سارا سونا دیا۔ اور اس نے ہمارا ساتھ دیا۔ عارف بہانے بہانے سے آپ کے سپاہی کو قید خانے سے نکال دیتا اور ایڈم اپنی جلد پہ جعلی کوڑھ کا خول چڑھا لیتا۔''

''وہ سب..... وہ سب اداکاری تھی؟'' مراد کی آنکھوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ ''میرے سامنے اس کے لیے پریشان ہونا..... وہ سب.....''

''جی۔ سب فریب تھا۔ لیکن میں نے آپ کو ایک موقع دیا تھا۔'' وہ تنفر سے اسے دیکھ کے بولی۔

''مجھے تالیہ سمجھ کے ملیں اور مجھ سے پوچھیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں آخر تک آپ سے سچ سننے کی منتظر رہی تاکہ آپ کو الوداع کہہ سکوں لیکن آپ نے وہ موقع بھی گنوا دیا۔''

مراد نے غصے سے ہنکارا بھرا۔ ''تو وہ تمہاری خواہش تھی۔ نہ کہ فاتح کی۔''

''میں نے کہا تھا نا' آپ چے تالیہ کو نہیں جانتے۔'' ایڈم مسکرا کے بولا۔

''پتا ہے راجہ.....'' وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ ''پھر بھی مجھے لگا تھا کہ آپ کہیں گے' ایڈم مر گیا ہے۔ وہ صحت یاب نہیں ہوسکا۔ مگر مجھے یا خود فاتح کو بھی اندازہ نہ تھا کہ آپ اسے واپس بھیجنے والا جھوٹ بولیں گے۔ آپ نے خود مجھے اپنے ہاتھوں سے کھویا ہے۔ اب میں بغیر کسی بوجھ کے یہاں سے جاؤں گی۔''

مراد چونکا۔ نظریں عقب میں نظر آتے کھلے دہانے تک گئیں۔

''مگر تمہارے پاس وقت کی چابی نہیں ہے.....''

''سرپرائز..... سرپرائز.....'' ایڈم نے گردن میں انجیر کے ساتھ پہنی چابی لہرائی۔

مراد کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ ''یہ کیسے.....''

''کیونکہ آپ ملاکہ کے واحد جادوگر نہیں ہیں۔''

آواز پہ ان تینوں نے گردن اس سمت موڑی جہاں سے وہ چلا آرہا تھا۔ کندھے پہ تھیلا ڈالے'

چہرے پہ سنجیدہ سپاٹ تاثرات سجائے' وہ تالیہ اور ایڈم کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

''سوری۔ مجھے دیر ہوگئی۔'' پھر مراد راجہ کی آنکھوں میں براہ راست دیکھا۔ ''آپ کو سب معلوم ہو ہی گیا ہے تو بتاتا چلوں... میں جانتا تھا' آپ چابی کبھی نہیں بنائیں گے۔ اس لیے میں نے یان سوفو سے سودا کرلیا تھا۔''

مراد نے گہری سانس لی۔ ''اور بدلے میں تم نے اسے بغاوت کی اطلاع اور بھاگنے میں مدد فراہم کی۔''

''بالکل۔ میں نے اس سے دشمنی ترک کردی اور اس نے مجھے چابی بنا دی۔ مجھے یہی چاہیے تھا۔ اور ہاں' یہ سب میں نے اپنے دوستوں کے علم میں لا کے کیا تھا۔'' وہ مراد کو دیکھتے ہوئے درشتی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے ایک دفعہ ان سے چھپ کے آپ سے سودا کیا تھا۔ لیکن میں اب وہ انسان نہیں رہا جو مصلحتوں پہ فیصلے کرے۔ میں ان چیزوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میں اپنی غلطیوں سے سیکھ چکا ہوں۔''

وہ تینوں شانہ بشانہ ایک ساتھ کھڑے تھے۔ تینوں کی نظروں میں مراد راجہ کے لیے سرد مہری تھی۔

اس نے غصے بھری بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''تم نے میرے ساتھ غداری کی۔ مجھے دھوکہ دیا۔'' اس کا مخاطب فاتح تھا۔ ''وہ میری بیٹی ہے' اسے میں معاف کرسکتا ہوں۔ لیکن تم.... تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں تخت میں حصے دار بنا رہا تھا۔ میں نے تم پہ اتنے احسانات کیے اور تم!''

''میں اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا' راجہ!''

''اور تم تاشہ!'' اس نے دکھ سے تالیہ کو دیکھا۔ ''تم میرے پاس آئی تھیں اور کہا تھا کہ تم یہاں ہمیشہ کے لیے واپس آ گئی ہو۔''

''کیونکہ آپ نے فاتح سے ان کی یادداشت چھین لی تھی۔ آپ کے اس سودے کی وجہ سے کتنے مہینے میری زندگی جہنم بنی رہی' آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔ میں کوئی شہزادی نہیں ہوں' راجہ۔ یہ میری دنیا نہیں ہے۔ نہ میرے اور آپ کے درمیان سچائی کا تعلق ہے۔ میں کے ایل کی عام سی تالیہ ہوں۔ مجھے اب محلوں میں رہنے کی خواہش نہیں رہی۔''

پھر اس نے گہری سانس لی اور جنگل میں اپنے سامنے کھڑے اکیلے مراد کو دیکھا۔

''میں پچھلی دفعہ گئی تھی تو آپ سے ناراض تھی۔ اکتائی ہوئی تھی۔ اس دفعہ ناراض نہیں ہوں۔ مجھے آپ سے جو محبت تھی وہ ہمیشہ رہے گی' لیکن مجھے وہ اب تکلیف نہیں دے گی۔ آپ کو چھوڑنا تکلیف دہ نہیں ہے۔''

مراد نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کے چہرے پہ جھنجھلاہٹ اور بے بسی تھی۔

''آپ اپنے ساتھ لاؤ لشکر نہیں لائے' اچھا ہے۔ لاتے بھی تو آپ ہمیں نہیں روک سکتے تھے' مراد راجہ۔ ہم اپنی دنیا میں واپس جا رہے ہیں۔ ایک دفعہ دروازہ بند ہوگیا تو آپ اسے نہیں کھول سکیں گے۔''

فاتح نے اب ان دونوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں سپاٹ نظروں سے مراد کو دیکھتے کھلے دہانے کی طرف بڑھ گئے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیچے اتر گئے۔ ڈھکن ابھی تک کھلا تھا۔

''مجھے آپ کے لیے افسوس ہے' راجہ۔ میں جانتا ہوں بیٹی کو کھونے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو موقع دیا تھا اپنی بیٹی کی نظروں میں سرخرو ہونے کا.... لیکن خیر.... الوداع' مراد راجہ۔''

اس نے گردن اٹھا کے آسمان کو دیکھا جو درختوں کے پتوں کے جھروکوں سے بدقت نظر آتا تھا۔

''الوداع ملاکہ۔''

یہ کہتے ہوئے وہ مڑا اور کھلے دہانے کی طرف بڑھا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ مراد اس کی طرف لپکا ہے' لیکن اس سے پہلے کہ وہ مڑتا' مراد راجہ نے کوئی

نوکیلی شے اس اس کی کمر میں گھونپ دی تھی۔
وقت تھم گیا۔
درختوں سے پرندے جھپاک سے اڑ گئے۔
فاتح کے منہ سے کراہ بھی نہیں نکلی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔ پہلو میں درد کی ناقابلِ برداشت لہر اٹھی تھی۔ بصارت دھندلا گئی تھی۔
مراد نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔
''جاؤ' میں نے تم تینوں کو آزاد کیا۔ اور یہ..... یہ تمہاری غداری کا بہت چھوٹا بدلہ ہے۔''
یہ کہہ کے مراد سیدھا کھڑا ہوا اور تنفر سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے پہلو پہ ہاتھ رکھے جھکا ہوا تھا۔ جنگل کی زمین پہ اس کا لہو ٹپکتا دکھائی دے رہا تھا۔
فاتح بہت ضبط سے پہلو پہ ہاتھ رکھے اٹھا۔ وہ شدید تکلیف میں تھا مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مراد منتظر تھا کہ فاتح اس پہ حملہ آور ہوگا مگر فاتح نے صرف نفی میں سر ہلایا۔
''تم تالیہ کے باپ ہو۔ اور میں تمہارا قاتل نہیں بننا چاہتا۔''
ایک نفرت بھری نظر اس پہ ڈال کے وہ دہانے کی طرف بڑھ گیا۔
مراد نے اسے سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔
پھر اس نے ڈھکن بند ہوتے دیکھا۔ وقت کے ان مسافروں کا قصہ تمام ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو کھو چکا تھا۔
اس نے قدم موڑ لیے۔ اس کا رخ سلطنت محل کی جانب تھا۔

☆☆☆

''اپنی کتاب کا آخری صفحہ تحریر کرو' ابن ابی بکر۔'' کچھ دیر بعد وہ فوارے کے ساتھ کھڑا تھا اور دور افق کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سامنے بیٹھا مورخ جو ہنگامی حکم پہ بلوایا گیا تھا کبھی حیرت سے راجہ کی بکھری بکھری حالت دیکھتا اور کبھی سر جھکا کے تیز تیز لکھنے لگ جاتا۔
''لکھو کہ مراد راجیہ نے برونائی کے ولی عہد سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔
وہ دونوں بحری سفر پہ روانہ ہو گئے۔
لیکن مذاق مذاق میں.... شہزادی تاشہ نے ایک جادوئی سوئی ولی عہد کو گھونپ دی۔
ولی عہد کا خون بہتا گیا۔
وہ زخم کی تاب نہ لا کے مر گیا اور اس غم کے باعث تاشہ نے.... اس نے خود کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا۔
اس کے بعد تاشہ کو کسی نے ملاکہ میں نہیں دیکھا۔
وہ اس بحری سفر سے کبھی لوٹ کے نہیں آئی۔''
جس وقت مراد جنگل سے باہر جا رہا تھا' وان فاتح پہلو پہ ہاتھ رکھے دھیرے دھیرے نیچے آ رہا تھا۔ تالیہ اور ایڈم نیچے موجود اس قدیم دروازے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایڈم کے ہاتھ میں چابی تھی جس سے وہ تالا کھول رہا تھا۔
تالیہ نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی اور آہستہ سے بولی۔ ''تم نے اپنی جعلی موت کے وقت بابا سے جو کہا۔ وہ پلان کا حصہ نہیں تھا.... تمہاری وہ بات....''
''چے تالیہ!'' اس نے سنجیدگی سے اسے ٹوک دیا۔ ''وہ بات ہم وقت کے اس پار کریں گے۔''
''مگر ایڈم.... کیا وہ....''
''میں نے کہا نا.... ہم وہ بات کے ایل میں کریں گے۔ وان فاتح.... آپ آ گئے؟ گڈ۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔''
وہ پہلو پہ ہاتھ رکھے زینے اتر رہا تھا۔ چہرے پہ تکلیف کو ضبط کرنے کے آثار تھے۔
ایڈم جو ساتھ ساتھ تالا کھول کے دروازہ دھکیل رہا تھا' وہیں ٹھہر گیا۔ تالیہ نے بھی چونک کے اسے دیکھا۔
''فاتح۔'' وہ بے یقینی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا بازو تھاما۔ پہلو پہ رکھے اس کے ہاتھ خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ تالیہ نے جگہ کو چھوا تو

اس کی انگلیاں بھی سرخ خون سے بھیگ گئیں۔

''یہ..... یہ بابا نے کیا ہے؟'' اس کی بے یقینی صدمے میں بدلی۔

''ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تالا کھل چکا ہے۔ ہمیں واپس جانا ہے۔'' وہ قدرے سختی سے کہہ کے آگے بڑھا۔

''آپ زخمی ہیں۔'' ایڈم ہکا بکا رہ گیا۔

''چلو.... ایڈم۔ جلدی کرو۔'' وہ تکلیف برداشت کرتا' تیزی سے چوکھٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ایڈم نے بھی پیچھے قدم بڑھائے۔ ''جلدی چلو۔''

''بابا نے..... یہ کیسے کیا؟'' اس کا صدمہ اب غصے میں بدل رہا تھا۔ رنگت سرخ پڑنے لگی تھی۔

''بابا نے اس آدمی پہ حملہ کیا جو میرے لیے سب کچھ تھا؟'' وہ ایک دم مڑی اور زینے پھلانگتی اوپر کو لپکی۔

''چے تالیہ..... آپ کیا کر رہی ہیں.....'' ایڈم کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔

ڈھکن ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ اس نے پوری قوت سے اسے ہٹایا اور سر باہر نکالا۔

''مراد راجہ.....'' وہ غصے سے غرائی۔ مگر سامنے جنگل کا فرش تنہا تھا۔ مراد دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آواز پہ بھی نہیں پلٹا۔ وہ اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی' وہ اس کا گریبان پکڑ کے اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا..... لیکن..... یہ اس سب کا وقت نہیں تھا۔ اگر دروازہ بند ہو گیا تو وہ یہیں پھنس جائے گی۔ بہ دقت ضبط کر کے وہ تیزی سے واپس آئی۔ بھاری دروازہ دھیرے دھیرے چوکھٹ کے قریب جا رہا تھا۔ وہ چوکھٹ سے لگنے ہی والا تھا جب تالیہ نے اسے زور سے دھکیلا اور اندر داخل ہوئی۔ اس کے گھستے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

اب ہر طرف اندھیرا تھا۔

''ایڈم؟'' فاتح؟'' اس نے اندھیرے میں پکارا۔ جواب ندارد۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ پیر زینوں سے ٹکرایا۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتی اوپر چڑھنے لگی۔ آخری زینے کے اوپر ڈھکن تھا۔ تالیہ نے اسے کھولا اور باہر نکلی۔

وہ سڑک کے کنارے پہ کسی مین ہول سے باہر نکل رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ذہن کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے مگر پھر..... آہستہ آہستہ اس نے گردن گھمائی۔

وہ جدید ملاکہ کی ایک سڑک تھی۔ دور دور تک دکانیں اور ریستوران بنے نظر آ رہے تھے۔ سڑک پہ دور و یہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ رات کا وقت تھا اور اسٹریٹ لائیٹس جگمگا رہی تھیں۔

سامنے ایک بورڈ نظر آ رہا تھا۔ ''جونکر اسٹریٹ'' اور آگے مڑنے کا نشان تھا۔

اوہ یعنی وہ جونکر اسٹریٹ کے قریب تھی۔ جونکر اسٹریٹ وہ جگہ تھی جہاں سے ذوالکفلی کا گھر تھوڑا ہی دور تھا۔ یعنی وہ درست مقام پہ تھی۔

اسے ذوالکفلی کے تہہ خانے سے نکلنا چاہیے تھا۔ وہ یہاں سے کیوں نکلی؟

وہ کپڑے جھاڑتی اٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ مگر..... کوئی ارد گرد تھا بھی نہیں۔

''ایڈم؟ فاتح؟'' اس نے زیر لب فکر مندی سے آواز دی۔ وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔ پلٹ کے مین ہول کو دیکھا تو وہاں زمین برابر ہو چکی تھی جیسے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تینوں ہمیشہ ساتھ جاتے اور ساتھ نکلتے تھے۔''

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ فاتح کا خون ابھی تک ان پہ لگا تھا۔ اسے پھر سے فکر ہونے لگی۔

اسے ذوالکفلی کے گھر جانا چاہیے۔ وہ دونوں یقیناً وہیں سے نکلے ہوں گے۔

وہ تیزی سے جونکر اسٹریٹ کی سمت چل دی۔ گردن میں موجود کپڑا سر پہ پہن لیا۔ وہ ایک مفرور ملزمہ تھی۔ اسے احتیاط سے کام لینا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک جگہ اونچی سی ایل ای

ڈی آویزاں تھی۔ اس پہ کوئی میچ دکھایا جارہا تھا۔ تالیہ نے چلتے چلتے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ کونے میں تاریخ اور وقت لکھا آرہا تھا۔

اتوار۔ بائیس جنوری۔

وہ مسکرائی۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ تینوں ذوالکفلی کے تہہ خانے سے وقت کے سفر پہ نکلے تھے۔

اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ واپس آ گئی تھی۔

مگر وہ دونوں کہاں تھے؟

وہ چلتے چلتے جونکر اسٹریٹ پہ آ گئی۔ وہاں بہت رش تھا۔ لوگوں کا ہجوم چلتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اداسی سے مسکراتی ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھتی گئی۔ اتنا عرصہ قدیم ملاکہ میں رہنے کے بعد یہ سب نیا نیا لگ رہا تھا۔ ٹریفک ....لوگوں کا انداز.... عمارتیں.... یہ وہی جونکر اسٹریٹ تھی جہاں وہ اَن گنت دفعہ آئی تھی۔ لیکن جدید زمانے کا سحر کتنا منفرد تھا۔

ماضی بالآخر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنے کے لیے آزاد تھی۔

اسٹریٹ میں ایک جگہ وہ ٹھہر گئی۔ گردن موڑی تو بائیں جانب ایک کافی کوکو کی مہک یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ذوالکفلی کے گھر جانے کے لیے کافی لے لینی چاہیے۔ وہ راستے میں پیتی جائے گی۔ بیٹھ کے پینے کا وقت نہ تھا۔

اس کے پاس پیسے نہیں تھے لیکن اسے ایک کریڈٹ کارڈ کا نمبر یاد تھا جسے وہ استعمال کر سکتی تھی۔

وہ کاؤنٹر پہ گئی تو باریستا نے اسے خوش آمدید کہا۔ تالیہ نے اس کو آرڈر لکھوایا اور خود دروازے کے ساتھ ایک میز پہ جا بیٹھی۔

(خدا کرے یہ مجھے نہ پہچانے۔) وہ فاتح اور ایڈم سے ملنے سے پہلے گرفتار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

کافی شاپ کی مرکزی دیوار پہ ٹی وی اسکرین نصب تھی۔ اس پہ نیوز بلیٹن نشر ہو رہا تھا۔ تالیہ کی نظریں وہاں اٹھیں تو واپس مڑنا بھول گئیں۔

اسکرین پہ ایک تھائی آدمی ایک ملے آدمی سے ہاتھ ملاتا نظر آرہا تھا۔ ملے آدمی کو وہ پہچانتی تھی۔

اسے ہی تو وہ پہچانتی تھی۔ نیوز کاسٹر پس منظر میں کہہ رہی تھی.....

''تھائی لینڈ کے بادشاہ کا استقبال کرنے ملائیشیا کے وزیراعظم وان فاتح خود آئے اور....''

اور یہ وہ لمحہ تھا جب تالیہ مراد کو احساس ہوا کہ کچھ غلط تھا۔

وہ چند لمحے ٹکر ٹکر اسکرین پہ نظر آتے فاتح کو دیکھے گئی۔ تھری پیس میں ملبوس مسکراتا ہوا فاتح رامزل مختلف نظر آرہا تھا۔

پھر اس کی نظریں سست روی سے شاپ کے اطراف میں اٹھیں۔ یہ جگہ مختلف تھی۔ یہ جگہ اس جونکر اسٹریٹ سے مختلف تھی جو اسے یاد تھی۔ اس نے اشارے سے باریستا کو بلایا۔

''آج بائیس جنوری ہے نا؟ اتوار کا دن؟'' تالیہ نے بے یقینی سے پوچھا۔ باریستا نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی۔ آج اتوار ہے۔ بائیس جنوری۔''

''بائیس جنوری 2017.... رائیٹ؟''

باریستا کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں اچنبھا در آیا۔

''نہیں.... یہ 2023 ہے۔''

اس کے الفاظ نے تالیہ مراد کی سانسیں روک دیں۔

نہیں۔ یہ 2017 ہے۔ تم مذاق کر رہے ہو' ہے نا؟'' وہ میز پہ زور سے ہاتھ مار کے بولی۔ اس کے چہرے پہ بے پناہ خوف سمٹ آیا تھا۔

''سوری میم.... میں سمجھا نہیں۔ یہ 2023 ہے۔'' باریستا اسے عجیب الجھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاریخ بہت سے لوگ پوچھتے تھے۔ لیکن سال؟ سال کون پوچھتا تھا؟

تالیہ کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ اس نے بے یقینی سے اسکرین کو دیکھا۔

وہاں ملائیشیاء کا وزیر اعظم اب تھائی لینڈ کے بادشاہ کے ساتھ عشائیے میں مصروف نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں بچے اس کے ہمراہ کھڑے تھے۔ ٹین ایج سکندر اور جولیانہ۔ وہ دونوں بڑے ہو چکے تھے۔ عمر میں بھی۔ قد میں بھی۔

چھ سال گزر چکے تھے۔

نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو بہنے لگے۔ باریستا حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں کے آگے دھواں چھانے لگا۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ گردن پہ ہاتھ رکھا۔ اور گہرے گہرے سانس لیتی .... باہر آئی۔ پھر شاپ کے آگے فٹ پاتھ پہ بیٹھ گئی۔

یہ ممکن نہیں تھا۔ چھ سال کیسے گزر سکتے تھے۔ وہ وقت میں اسی مقام پہ واپس کیوں نہیں آئی تھی؟ نہیں.... یہ جھوٹ تھا۔ خواب تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ابھی وہ جاگ جائے گی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

سب ویسا ہی تھا۔ وقت نے سارے حساب الٹے کر دیے تھے۔

وہ چند لمحے کے لیے غصے میں مراد کے پیچھے بھاگی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو دروازہ چوکھٹ سے لگ چکا تھا۔ اس نے اسے کھول لیا کیونکہ اس کا تالہ کھل چکا تھا یا جانے کیا بات تھی۔ لیکن جب اس نے اسے کھولا تو وہاں ایڈم اور فاتح نہیں تھے۔ چند لمحوں کے فرق نے جدید دنیا میں برسوں کا فرق ڈال دیا تھا۔

لوگ جونکر اسٹریٹ پہ گزر رہے تھے۔ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ بول رہے تھے۔

اور تالیہ مراد سن سی فٹ پاتھ پہ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

اگلا ایک گھنٹہ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں اس اسٹریٹ پہ آگے پیچھے پھرتی رہی تھی۔ کبھی کسی بنچ پہ جا بیٹھتی۔ کبھی کسی دکان کے اندر۔ کبھی سڑک کنارے سر جھکائے چلنے لگتی۔ کبھی گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑے گھڑی کی سوئیوں کو کوسنے لگتی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ نہ وہ کچھ سوچ پا رہی تھی نہ سمجھ پا رہی تھی۔

جب اس کا ذہن بیدار ہونے لگا تو اس نے خود کو کافی شاپ میں بیٹھے پایا۔ جانے کب وہ اندر آئی تھی اور کافی منگوائی تھی۔

بالآخر اس کے حواس کام کرنے لگے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کاؤنٹر تک گئی۔

''میں..... آپ کا کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہوں؟ پلیز تھوڑی دیر کے لیے۔'' اس کے انداز میں اتنی شدید لجاجت تھی کہ باریستا نے فوراً سے ایک لیپ ٹاپ اس کی میز پہ رکھ دیا۔

وہ وہاں بیٹھی کچھ دیر اسکرین کو تکتی رہی۔ اسے کیا معلوم کرنا تھا' اسے معلوم نہ تھا۔ بائیس جنوری ۲۰۱۷... کیا فاتح اور ایڈم چھ سال پہلے اس تاریخ میں جدید دنیا میں واپس پہنچ گئے تھے؟ ۲۲ جنوری کو جو بھی ہوا ہوگا' اس کی خبر اگلے روز کے اخبار میں چھپی ہوگی۔ اس نے اپنی خون سے سرخ انگلیوں سے ٹائپ کیا۔

۲۳ جنوری۔ 2017 ۔

تالیہ نے اس تاریخ کا آن لائن اخبار کھولا۔

''وان فاتح زخمی حالت میں جونکر اسٹریٹ کے کنارے پائے گئے۔''

''وان فاتح ہسپتال میں داخل۔ ان کی حالت تشویش ناک ہے۔ حملہ آور کا فی الوقت پتا نہیں چل سکا۔''

''وان فاتح چھ روز بعد ہسپتال سے ڈسچارج کر دیے گئے۔ اب وہ روبہ صحت ہیں۔''

وہ لبوں پہ ہاتھ رکھے بے یقینی سے پڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر ویٹر کو بلایا۔ وہ فوراً چلا آیا۔

''میں.... میں کافی عرصے بعد ملائیشیا آئی ہوں۔'' اب کے وہ قدرے سنبھل کے پوچھنے لگی۔

''وان فاتح وزیراعظم کب بنے تھے؟''

''پہلی دفعہ یا دوسری دفعہ؟'' وہ احتیاط سے پوچھنے لگا۔

''اوہ۔وہ دوسری دفعہ وزیراعظم بن رہے ہیں؟''

''جی میم۔پہلی دفعہ ۲۰۱۷ کے جون میں۔اور دوسری دفعہ پچھلے برس ۲۰۲۲ کے جون میں۔وہ پچھلے ساڑھے پانچ سال سے ہمارے پرائم منسٹر ہیں۔''

وہ ٹکر ٹکرا سے دیکھنے لگی۔اب کیا پوچھے؟

''آپ کہاں سے آئی ہیں؟''

''امریکہ سے۔اچھا مجھے بتاؤ....تم نے ایڈم بن محمد کا نام سنا ہے۔وہ ایک رپورٹر ہوتا تھا جس نے....''

''ہانگ کانگ پیپرز والا ایڈم بن محمد؟ ''اینکر پرسن''ایڈم بن محمد؟''

''اینکر پرسن؟'' اس نے دوبارہ سے لبوں پہ انگلیاں رکھ دیں۔آنکھیں بھیگنے لگ گئیں۔''ایڈم بن محمد اینکر بن گیا؟''

''جی....وہ ملائیشیا کا معروف اینکر ہے۔'' باریستا فخر سے امریکی سیاح کو بتانے لگا۔''اس کی تو چار پانچ بیسٹ سیلر کتابیں بھی ہیں۔اور وہ ایک پرائم ٹائم ٹاک شو کا اینکر پرسن ہے....وہ ہانگ کانگ پیپرز کی وجہ سے Pulitzer پرائز کے لیے بھی نامز ہوا تھا لیکن اسے پرائز نہیں ملا۔یونو.... پرائز آخر میں گوروں کو مل جاتا ہے۔''

''اس پہ....اس پہ ایک زمانے میں قاتلانہ حملے ہوتے تھے....''

''وہ تو پرانی بات ہے۔اب تو وہ اسٹار اینکر ہے۔اسے کون کچھ کہہ سکتا ہے۔خود پرائم منسٹر بھی نہیں۔آپ کو کچھ اور چاہیے۔''

''اونہوں۔'' اس نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔''مجھے اب اور کیا چاہیے ہوگا۔''

وہ واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ایڈم کا نام کپکپاتی انگلیوں سے ٹائپ کیا۔

سوٹ میں ملبوس۔مسکراتا ہوا ایڈم بن محمد....وہ اب سیلیبریٹی رپورٹر سے کہیں آگے بڑھ چکا تھا۔وہ دنیا گھومنے والا....محلوں میں اٹھنے بیٹھنے والا....ایوارڈز اور انعامات جیتنے والا ایڈم بن محمد تھا۔

اس کا لباس قیمتی تھا۔اس کا گھر شاہانہ تھا۔اس کی کلاس مختلف ہو چکی تھی۔وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس نے اسکرین فولڈ کر دی۔دماغ ایک دفعہ پھر سے ماؤف ہونے لگا۔نظریں اوپر ٹی وی اسکرین کی طرف اٹھیں تو وزیراعظم وان فاتح پھر سے دکھائی دینے لگا۔اب کے خبر مختلف تھی۔یہ اگلا بلیٹن تھا۔وہ بس ٹکر ٹکرا سے دیکھے گئی۔

وہ پہلے سے زیادہ باوقار لگتا تھا۔گرے سوٹ میں ملبوس روسٹرم پہ کھڑا تقریر کر رہا تھا۔وہی اعتماد۔وہی بے نیازی۔وہی حکمرانی کا سا انداز۔

تالیہ نے سر میز پہ گرا دیا۔یہ سب غیر حقیقی تھا۔اس کا دماغ مزید کچھ قبول کرنے سے انکاری تھا۔وقت نے اس کو بہت بڑی سزا دی تھی۔بلکہ ان تینوں کو۔ان تینوں کو ایک دوسرے سے چھین کے ان تینوں کو ادھورا کر دیا تھا۔

ابھی چند لمحے پہلے وہ تالیہ کے ساتھ تھے۔اور اب....سب بدل چکا تھا۔وہ دونوں بہت آگے نکل چکے تھے۔اور وہ کہاں تھی؟

اس نے کرنٹ کھا کے سر اٹھایا۔ایک منٹ۔تالیہ مراد کہاں تھی؟

اس نے تیزی سے اسکرین کھولی۔پھر جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگی.....

تالیہ بنتِ مراد۔

خبریں سامنے آنے لگیں۔ایک کے بعد ایک صفحہ کھلنے لگا۔

2017 کے آغاز میں عصرہ محمود کے قتل کے بعد روپوش ہونے والی مفرور ملزمہ تالیہ مراد ابھی تک نہیں ملی تھی۔غالباً وہ ملک سے بھاگ چکی تھی اور گمنامی کی زندگی گزار رہی تھی۔

عصرہ محمود کے قتل کا کیس ابھی تک بند نہیں ہوا تھا۔ وہ فائل پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کھلی تھی اور اشعر محمود نے ہر طرح سے زور لگا کے اس کو کھلا دہنے دیا تھا۔

تالیہ مراد آج بھی ایک مفرور ملزمہ تھی۔

ایک بات وہ جانتی تھی۔ ملائیشیاء کے قانون میں کرمنل کیس کا کوئی statue of limitation (قانون میعاد سماعت) نہ تھا۔ اس قانون کے تحت ایک مقررہ مدت گزرنے کے بعد اگر مجرم پکڑا نہ جائے تو کیس بند ہو جاتا ہے اور مجرم بعد میں آجائے تب بھی اس پہ مقدمہ نہیں چلتا۔

مگر ملائیشیاء میں قتل کے کیس پہ کوئی قانون میعاد سماعت لاگو نہیں ہوتا تھا۔ اگر مجرم چھ برس بعد بھی آئے تو وہ مجرم ہی ہوگا۔

تالیہ کی زندگی کے دونوں ستون آگے بڑھ چکے تھے۔ وہ دونوں اپنے اپنے خواب پا چکے تھے مگر چھ سال گزرنے کے بعد بھی تالیہ مراد ایک مفرور ملزمہ تھی اور پولیس آج بھی اس کی تلاش میں تھی۔

باریستا نے ایک گاہک کو آرڈر تھماتے ہوئے گردن موڑ کے اس گم صم سی لڑکی کو دیکھنا چاہا تو ٹھٹھک گیا۔

کافی کا کپ اَن چھوا رکھا تھا۔

لیپ ٹاپ بند پڑا تھا۔

اور کرسی خالی تھی۔

اسے علم بھی نہ ہوا۔ وہ لڑکی جانے کب وہاں سے نکلی اور جونکر اسٹریٹ کے ہجوم میں گم ہوگئی۔

بنا کسی چاپ کے۔

بنا کسی آواز کے۔

☆☆☆

''وقت مہربان''

اس کی بند آنکھوں کے پار صرف اندھیرا تھا۔ ذہن کا پردہ کسی بھی خواب سے خالی تھا۔

کھڑکی کے باہر کسی کار کا ہارن سنائی دیا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ پھر ارد گرد دیکھا۔

وہ قدیم ملاکہ میں نہیں تھی۔ وہ کے ایل کے ایک موٹل روم میں نیند سے جاگی تھی۔ اور نیند بھی ایسی جو خوابوں سے خالی تھی۔

وہ گزشتہ رات جونکر اسٹریٹ کے ایک مین ہول سے واپس اپنی دنیا میں آئی تھی۔ اور یہاں آ کے معلوم ہوا تھا کہ باقی ساری دنیا آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے جنگجو کی مانند جو میدان جنگ میں پیچھے دیکھنے کی غلطی کی پاداش میں نمک کا مجسمہ بنا دیا جاتا ہے۔ دوست اور دشمن.... ہارتے جیتتے..... جھنڈے گاڑتے آگے بڑھ جاتے ہیں..... اور وہ نمک کا مجسمہ وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔ زمان و مکان کی قید سے آزاد۔

''چھ سال۔ وقت نے میرے چھ سال چھین لیے۔'' اس نے تنفر سے کھڑکی کے پار دیکھا جہاں نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

وہ قدیم ملاکہ سے جدید دنیا میں صرف ایک پوٹلی کے ساتھ آئی تھی جس میں چند زیورات تھے یا سونے کے سکے۔ جدید زمانے کی کرنسی اس کے پاس نہ تھی لیکن اسے اپنے چند کریڈٹ کارڈز کے نمبرز یاد تھے۔ رات جب اس نے انہیں استعمال کرنا چاہا تو وہ کام نہیں کر رہے تھے۔ شاید ایکسپائر ہو گئے تھے۔

پھر اس نے وہی کیا جو اسے کرنا آتا تھا۔ بس اسٹیشن پہ کسی کے پرس میں ہاتھ ڈالا..... تو کسی کا بٹوہ دھیرے سے نکالا۔ آج کوئی اس کو موردالزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ آج اسے کسی نہ کسی طرح سروائیو کرنا تھا۔

رات کے تیسرے پہر وہ کے ایل پہنچی۔ شہر کی فصیل ہو یا بس اسٹاپ..... کہیں کوئی تالیہ مراد کی تاک میں نہ بیٹھا تھا۔ چھ سال بعد نہ اس کے ''پولیس کو مطلوب'' والے پوسٹرز وہاں تھے نہ کسی کو وہ یاد تھی۔

پچھلی دفعہ فاتح اسے بھولا تھا۔ اس دفعہ ساری دنیا اسے بھول گئی تھی۔

کے ایل پہنچ کے وہ اپنی اسٹریٹ میں پہنچی تو

اسے دھکا سا لگا۔ حالم کا بنگلہ وہاں نہیں تھا۔ اس کی گرفتاری کے وقت حکومت نے اس کے اثاثے ضبط کر لیے تھے۔ بعد میں قانونی یا غیر قانونی طور پہ اس کے گھر کو غالباً سرکاری املاک شمار کر کے اس کو منہدم کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اب وہاں ایک سرکاری دفتر بنا تھا۔ اس کا گھر اس کا نہیں رہا تھا۔ وقت.... وقت نے اس کے ساتھ بہت ناانصافی کی تھی۔

پہلی رات ایک فرضی نام کے ساتھ موٹل میں گزار دی۔ صبح میں وہ نیچے ریسپشن پہ آئی تو ریسپشنسٹ نے مسکرا کے اسے سلام کیا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ سیاہ بالوں کو پونی میں باندھے' آنکھوں پہ چشمہ لگائے' وہ سفید ٹراؤزرز پہ گھٹنوں تک آتا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ وہ ریسپشنسٹ سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی مگر تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے نہیں پہچانتا تھا۔ کسی کو اس میں دلچسپی نہ تھی۔

تالیہ موٹل سے باہر نکلی اور ٹیکسی میں بیٹھی۔ اسے آج شہر میں مختلف جگہوں پہ چھپائے اپنے ''گو بیگز'' ڈھونڈنے تھے۔ کرنسی' پاسپورٹ' چند ضروری چیزیں جو برے وقت میں کام آنی تھیں۔ اور برا وقت آن پہنچا تھا۔

سڑک پہ بھاگتی ٹریفک.... گاڑیوں کا شور.... بہت تیزی سے چلتی دنیا.... ہر شے اس کے اندر عجیب سا خوف پیدا کر رہی تھی۔

ریلوے اسٹیشن کا لاکر خالی تھا۔ اتنے برس گزرنے کے بعد اس کا گو بیگ وہاں کیسے موجود ہو سکتا تھا؟ ہونہہ۔ دوسری منزل ایک بینک اکاؤنٹ کا سیف تھا۔ جس آئی ڈی کارڈ پہ اس نے یہ بینک میں یہ سیف لیا تھا' وہ آئی ڈی کارڈ ایک پوسٹ آفس کے لاکر میں چھپا کے رکھا تھا۔ مگر وہ وہاں گئی تو وہ کارڈ بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ انسانوں نے چھپے خزینے کب چھوڑے ہیں؟ جس کو جہاں موقع ملا' ہاتھ صاف کر لیا۔

اور اب اسے اپنا آخری گو بیگ ڈھونڈنا تھا اور وہ جانتی تھی' وہ وہیں ہوگا جہاں اس نے اسے چھپایا تھا۔

جب رات گہری ہو گئی تو وہ اس قبرستان میں گئی جہاں اس نے اپنا سب سے قیمتی گو بیگ چھپایا تھا۔ وہ قبر اب بھی ویسی تھی۔ اس پہ نصب صلیب اسی طرح کھڑی تھی۔ سیاہ ہڈ میں ملبوس تالیہ نے کدال سے قبر کھودنی شروع کی۔

اندر ایک لکڑی کا تابوت تھا جس کے اوپر ہر جگہ مٹی لگی تھی۔ تالیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈھکن ہٹایا۔

اس کا گو بیگ اندر موجود تھا۔ اس نے تیزی سے زپ کھولی۔

پاسپورٹ' آئی ڈی' نوٹوں کے بنڈل' اور چند سفری دستاویزات۔ سب کچھ پلاسٹک کی تہوں میں محفوظ تھا۔ تالیہ نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی اور آسمان کو دیکھا۔

اس رات اپنے موٹل روم میں بیٹھے اس نے سوچا.... اسے فاتح سے بات کرنی تھی۔ ایڈم سے بات کرنی تھی۔ داتن سے بات کرنی تھی۔ انسان بات کیے بغیر چوبیس گھنٹے نہیں گزار سکتا.... اور اس کو کسی سے ڈھنگ سے بات کیے بتاتیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

فاتح' ایڈم' داتن.... کسی کا پرانا نمبر اب استعمال میں نہ تھا۔ فاتح کے ای میل ایڈریس پہ ای میل جا کے پلٹ آئی کیونکہ وہ ایڈریس اب بلاک ہو چکا تھا۔ سیکیورٹی پروٹوکول شاید۔ اُف۔ ایڈم کا ای میل اسے یاد نہ تھا۔ داتن کو اس نے ایک میسج بورڈ پہ پیغام چھوڑا اور پھر پوری رات بار بار اس میسج بورڈ کو چیک کرتی رہی۔ کوئی ردعمل' کوئی جواب' کچھ بھی اس کی طرف نہ آیا۔

رات کے تیسرے پہر تالیہ نے ایک دفعہ پھر وان فاتح کو گوگل کرنا شروع کیا۔ وہ اس کی ہر ویڈیو' ہر تصویر میں اس کے چہرے پہ بے قراری سے کوئی تاثر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہیں اس نے تالیہ کا نام لیا ہو.... کہیں اس نے کہا ہو کہ وہ اس کو یاد

کرتا ہے....لیکن ایسا کچھ نہ تھا۔ پرائم منسٹر بننے کے بعد اس نے انٹرویوز دینے چھوڑ دیے تھے۔ چھ سالوں میں درجن بھر سے زائد انٹرویوز اسے نہیں ملے تھے۔ البتہ تقاریر بہت تھیں۔ ان کا وہ کیا کرتی؟

وہ وزیر اعظم تھا۔ ملک کا سب سے طاقتور آدمی۔ اس تک رسائی ناممکن تھی۔ ایک عام لڑکی بھلا کیسے اس تک کوئی پیغام پہنچا سکتی تھی؟

اس نے ایڈم بن محمد کو سرچ کیا۔ وہ سلیبریٹی والی زندگی گزار رہا تھا۔ ایوارڈ شوز' انٹرویوز' بک سائننگ تقاریب....وہ اپنی دنیا میں گم تھا۔ البتہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ ایک انٹرویو میں اینکر نے اس وجہ پوچھی تو وہ اس بات پہ اداسی سے مسکرا دیا۔ بیڈ پہ بیٹھی' موبائل پہ انٹرویو دیکھتی تالیہ دم سادھ کے اس کا جواب سننے لگی۔

اسکرین پہ ایڈم ایک آرام دہ صوفے پہ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے نیلی جینز پہ سفید ہائی نیک پہن رکھی تھی اور ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' بازو صوفے کی پشت پہ پھیلا رکھا تھا۔ ایڈم کی پشت پہ دیوار میں کتابوں سے سجے شیلف بنے تھے۔ یہ اس کی اسٹڈی تھی جس کے وسط میں رکھے صوفوں پہ ایڈم اور خاتون اینکر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

جب کیمرہ خاتون اینکر کو دکھاتا (جو ایڈم سے شادی کے متعلق سوال پوچھ رہی تھی) تو اس کے پیچھے اسٹڈی کا وہ حصہ نظر آتا جہاں اسٹڈی ٹیبل اور اونچی کرسی رکھی تھی۔ میز پہ ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ پین ہولڈر۔ چند ترتیب سے رکھی کتابیں اور لیپ ٹاپ۔ یہاں بیٹھ کے وہ کتابیں لکھتا ہوگا۔ اور کتابیں پڑھتا ہوگا۔

ساری دنیا سے ہٹ کے وہ اس میز پہ بیٹھا' کتابوں میں پناہ ڈھونڈتا ہوگا۔ اوہ پیارا ایڈم بن محمد۔ وہ اس سے کیسے رابطہ کرے۔

اینکر کی آواز پہ اس کا ارتکاز ٹوٹا۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ یا پھر.... کب کرنے کا ارادہ ہے؟''

وہ مسکرایا اور ہلکے سے شانے اچکائے۔ ''کوئی ملا ہی نہیں جس کے بارے میں سوچتا۔ شاید مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ میں لائف پارٹنر میں کیا تلاش کر رہا ہوں۔''

گفتگو کا رخ وان فاتح اور موجودہ حکومت کی طرف مڑ گیا تو ایڈم نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

''پردھان منتری اس سے اچھا پرفارم کر سکتے تھے۔ اس سے بہتر پالیسیز بنا سکتے تھے۔ لیکن پانچ سالوں میں انہوں نے ڈھنگ سے ایک بل پاس نہیں کروایا۔''

''کیا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس پچھلی حکومت میں واضح اکثریت نہیں تھی؟''

''چلیں اس دفعہ تو ہے۔ میرے جیسے لوگ اب دیکھنا چاہیں گے کہ اس دفعہ وان فاتح کیا کرتے ہیں۔'' اس کے انداز میں اجنبیت اور بے گانگی تھی۔ تالیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ کیا وہ دونوں اب دوست نہیں رہے تھے؟ کیا ایڈم نے فاتح کی مخالفت شروع کر دی تھی؟ ظالم وقت نے ان دونوں کی دوستی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ وہ الجھ کے رہ گئی تھی۔

اس نے ایڈم اور فاتح کا نام لکھ کے گوگل کیا تو سامنے ایڈم کے کئی آرٹیکلز کھل گئے جن کی شہہ سرخیاں وان فاتح پہ کھلم کھلا تنقید کرتی نظر آتی تھیں۔ اس نے موبائل بے دلی سے سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا۔

وہ کس سے بات کرے؟ داتن' فاتح اور ایڈم کے علاوہ صرف ذوالفقار تھا لیکن جس طرح تالیہ نے اسے دھوکہ دیا تھا' وہ اس کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ اس سارے شہر میں اور کون تھا جس سے وہ بات کر سکتی تھی؟

صرف ایک نام تھا جو ذہن میں آتا تھا۔ اسے اس ایک شخص کا پتا تلاش کرنا تھا۔ کم از کم یہ کام تھا جو وہ چھ سال بعد بھی کر سکتی تھی۔

☆☆☆

کے ایل کے ایک پوش علاقے میں بنے اس

گھر کی چھت مخروطی تھی۔ آج صبح کاذب کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی تیز بارش ہوئی تھی۔ اس لیے مخروطی چھت کے کناروں سے پانی کے قطرے ہنوز ٹپک رہے تھے۔ سامنے پھیلا چھوٹا سا لان بھی ابھی تک گیلا تھا۔

تالیہ نے دروازے پہ لگی بیل بجائی اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی انتظار کرنے لگی۔ اس نے لمبے رین کوٹ کی ہڈ سر پہ ڈال رکھی تھی اور احتیاط سے ادھر ادھر بھی دیکھتی تھی۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور گھر کا مالک باہر نکلا۔

''یس؟'' انہوں نے رسمی انداز میں سامنے کھڑی لڑکی سے پوچھا۔ پھر ٹھٹک کے رکے۔ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑیں۔ بمشکل دو سیکنڈ لگے تھے انہیں تالیہ مراد کو پہچاننے میں۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہ سکے۔

''تالیہ مراد؟''

''جی' پراسیکیوٹر احمد نظام۔ میں تالیہ ہوں۔ لانگ ٹائم ہاں؟'' وہ آزردگی سے مسکرائی۔

احمد نظام پہلے سے زیادہ بوڑھے اور دبلے ہوگئے تھے۔ کتنی ہی دیر تحیر سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر سر جھٹکا۔

''میں اب پراسیکیوٹر نہیں ہوں۔''

''جانتی ہوں۔ آپ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ ایک پرائیوٹ وکیل کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اور ان چھ سالوں میں آپ نے تین گھر بدلے ہیں اس لیے پتا معلوم کرنے میں مجھے پورا دن لگا۔ اندر آسکتی ہوں؟'' انہوں نے بنا پلکیں جھپکے اسے دیکھتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ کیا یہ لڑکی واقعی وہی تالیہ تھی؟ آج بھی ویسی ہی تھی۔ نہ اس کی صورت بدلی تھی نہ انداز۔

مگر نہیں۔ وہ خوف زدہ تھی۔ اس کو اپنے سٹنگ روم میں بٹھا کے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے احمد نظام نے سوچا۔ وہ چوکنی سی بار بار اطراف میں دیکھتی تھی۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ احمد نظام نے جالی دار پردے ہٹائے تو سبز لان دکھائی دینے لگا۔ وہ کھڑکی کے مقابل صوفے پہ بیٹھی تھی۔ اس کی نظر بیک کوٹ کھڑکی اور داخلی دروازے دونوں پہ تھی۔

''اتنے سال بعد.... کیسے آئیں آپ' تالیہ؟''

''بس یوں سمجھیں کہ وقت میرے لیے بہت سفاک ثابت ہوا ہے۔'' تالیہ نے بھیگی ہوئی ہڈ پیچھے ڈالی۔ اور چہرے پہ آتی لٹیں کان کے پیچھے اڑسیں۔ وہ اداس اور مضطرب لگتی تھی۔

''اتنے سال کہاں رہیں آپ؟''

''جانتی تھی آپ کا پہلا سوال یہی ہوگا۔ ہر اس شخص کا پہلا سوال یہی ہوگا جس سے میں آج کے بعد میں ملوں گی۔ اس لیے اس کا جواب گھڑ لیا ہے میں نے۔ یوں سمجھیں کہ ایک دوسرے ملک میں پھنس گئی تھی جہاں سے اتنے برس تک میں نکل ہی نہ پائی۔ اب بالآخر نکلی ہوں تو فوراً کے اپل کا رخ کیا۔''

''اور کیا یہ سچ ہے؟'' اپنی ابتدائی حیرت پہ قابو پا کے اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''یہ سچ کے قریب ترین ہے۔ سچ پہ آپ یقین نہیں کریں گے۔''

تالیہ نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

سادہ شرٹ اور پینٹ میں ملبوس وہ اسے بہت مختلف لگے تھے۔ بالوں کی سفیدی بڑھ گئی تھی اور چہرے کی جھریاں بھی۔ یعنی یہ طے تھا کہ ہر شخص اسے مختلف لگے گا لیکن وہ سب کو پہلے جیسی لگے گی۔

''اتنے برس بعد آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟''

''کوئی اور تھا نہیں جو میری بات سنتا۔ میں اپنے اوپر بنے کیس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ اور میں....'' اس کا گلا رندھا۔ ''میں خود کو اس الزام سے پاک کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے عصرہ محمود کا قتل نہیں کیا تھا۔''

''اگر آپ اس وقت فرار نہ ہوتیں تو یہ ثابت

کرنا آسان ہوتا۔ آپ کے فرار نے آپ کو مجرم بنا دیا ہے' تالیہ۔'' وہ افسوس سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''مگر کوئی تو راستہ ہوگا۔'' وہ بے چین ہوئی۔ یوں لگتا تھا وہ بغیر پلان کے یہاں آ گئی تھی۔

''آپ اتنے سال تک چھپی کیوں رہیں۔ پہلے کیوں نہیں آئیں؟''

''وقت نے میرا ساتھ نہیں دیا' نظام صاحب۔ مگر آپ بتائیں.... کیا آپ کو لگتا ہے میں عصرہ کی قاتل ہوں؟''

''تالیہ....'' انہوں نے گہری سانس اندر کھینچی۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے.... آپ کے خلاف بہت سے شواہد موجود تھے۔ میرے پاس اس کیس کی فائل اب تک پڑی ہے۔ میں لاتا ہوں۔''

وہ اٹھے تو وہ ان کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا آپ اندر جا کے پولیس کو کال کریں گے؟ آپ جانتے ہیں میں پولیس کے آنے سے پہلے غائب ہو چکی ہوں گی۔''

''اگر آپ اتنے عرصے بعد آ گئی ہیں تو اس کا مطلب ہے آپ خود کو قانون کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں فائل لے کر آتا ہوں۔''

''میں چاہتی ہوں پولیس کے پاس جانے سے پہلے آپ میری بات سنیں۔ اگر میں آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین نہ دلا سکی تو کسی کو نہیں دلا سکوں گی۔''

''اس کے لیے ہمیں آپ پہ لگے الزامات اور موجودہ شواہد کا جائزہ لینا ہوگا۔ مجھے فائل تلاش کرنے میں دیر لگے گی کیونکہ سینکڑوں کی تعداد میں کیس فائلز میرے اسٹور میں رکھی ہیں۔ آپ خود میرے ساتھ آ سکتی ہیں۔'' ان کے انداز سے لگتا تھا وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھی۔ وہ ان کے پیچھے چل آئی۔

احمد نظام کا اسٹور روم کافی کشادہ تھا۔ وہاں شیلف در شیلف بنے تھے اور ان میں رکھے باکسز میں فائلز پڑی تھیں۔ ہر باکس کو حروف تہجی اور سن کے اعتبار سے لیبل کیا گیا تھا۔

''ہم نے شفٹنگ کے بعد سے ان کو نہیں کھولا۔ مگر انہی میں ہوگی فائل۔ میں نے ایک زمانے میں آپ کے کیس پہ اپنے تئیں بہت تحقیق کی تھی۔ پھر آپ منظر عام سے غائب ہو گئیں تو آہستہ آہستہ میری تفتیش ٹھنڈی پڑ گئی اور.....''

''اور تالیہ مراد صرف ایک فائل بن کے رہ گئی۔'' اس نے ایک شیلف کے اوپر سے ایک باکس اٹھایا اور پھونک مار کے گرد اڑائی۔ اس باکس پہ صرف ایک نام لکھا تھا۔

تالیہ مراد۔ 2010ء تا 2017ء

تالیہ باکس اٹھائے سٹنگ روم میں واپس آئی۔ کھلی کھڑکی سے نظر آتے لان کی گھاس پہ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ تالیہ نے باکس میز پہ رکھا اور ڈھکن کھولا۔ اندر کاغذات ہی کاغذات تھے۔

احمد نظام اس کے سامنے بیٹھے اور ایک ایک تراشے کو نکالنے لگے۔ وہ یاسیت سے اپنا اعمال نامہ کھلتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''قتل کے کیس میں تین چیزیں اہم ہوتی ہیں' چے تالیہ۔'' وہ عینک لگائے' کاغذات الٹ پلٹ کرتے ہوئے بتانے لگے۔ ''ثبوت۔ آلہ قتل۔ اور قتل کی وجہ۔ آپ کے کیس میں تینوں آپ کے خلاف جاتے تھے۔''

''او کے۔ ثبوت کیا تھے؟''

''آپ فارح صاحب کے گھر چاکلیٹ کیک بھیجتی تھیں۔ ان کیس کا آرڈر آپ کے کریڈٹ کارڈ سے کیا گیا تھا۔ بہت سے گواہوں کے مطابق عصرہ محمود نے انہیں خود کہا تھا کہ وہ کیک آپ کی طرف سے آتے تھے اور عصرہ ان کو کھا لیتی تھیں۔ عصرہ کی شہادت بھی اہم ہے۔ انہوں نے....'' احمد نظام عینک لگائے ایک نام پڑھ کے بتانے لگے.... ''انہوں نے دولت امان نامی آفیسر سے اپنی موت والے دن کہا تھا کہ انہیں شک ہے تالیہ مراد انہیں مروانا چاہتی ہے۔ یہ گواہی بہت اہم ہے۔ اسی

دن آپ کا اور عصرہ کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ملازم اس کے گواہ تھے۔'' انہوں نے عینک اتاری اور تالیہ کو دیکھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''میرا سوال اب بھی وہیں ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''مجھے تب بھی معلوم تھا۔ اب بھی معلوم ہے۔ آپ نے عصرہ کو قتل نہیں کیا۔''

وہ اس جواب کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکی۔

''کیوں؟ کیا یہ ثبوت کمزور ہیں؟''

''نہیں۔ کیونکہ یہ ثبوت ''پرفیکٹ'' ہیں۔ یہ آپ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جبکہ جتنی ذہین آپ ہیں.... آپ اتنے بڑے بڑے ثبوت نہیں چھوڑ سکتیں۔ آپ کے پاس تو درجنوں شناختیں تھیں۔ پھر آپ نے اپنے ہی کریڈٹ کارڈ سے کیک کیوں آرڈر کیے؟ آپ کو عصرہ کو مارنا ہوتا تو کسی اور طریقے سے بھی مار سکتی تھیں۔ ساری دنیا کے سامنے ان سے جھگڑا نہ کرتیں۔ آپ عصرہ کی قاتل نہیں ہو سکتیں۔ اور میں جانتا ہوں ان دنوں آپ مصر میں تھیں۔ آپ کو صوفیہ رحمٰن سے معافی نامہ چاہیے تھا۔ ایسے میں آپ ایک قتل کیسے پلاٹ کر سکتی ہیں؟''

بارش کی بوندیں اب کھڑکی کے شیشے پہ ٹپکتی نیچے کو لڑھک رہی تھیں۔ سبز لان دھندلا گیا تھا۔

''درست۔ دوسری چیز..... آلہ قتل؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیک کا آخری ٹکڑا جو پولیس کو ملا تھا۔ اس پہ آرسینک چھڑکی ہوئی تھی۔ آلہ قتل آپ کے کارڈ سے آرڈر ہوا تھا تو اس کا سرا بھی آپ تک جاتا تھا۔''

''یعنی ہر چیز میرے خلاف جاتی ہے۔ لیکن میرے پاس ایلی بائی تھی۔ جس وقت کیک آنے شروع ہوئے میں مصر میں تھی۔''

''جس دن عصرہ کی ڈیتھ ہوئی' اس دن آپ کے ایل میں تھیں۔ اس دن آپ کا ان سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ مسئلہ یہ ہے چے تالیہ کہ عام دنیا کی پولیس فلموں والی پولیس سے مختلف ہوتی ہے۔ عام دنیا میں جس کے کارڈ سے آلہ قتل آرڈر کیا جاتا ہے' وہی قاتل نکلتا ہے۔ 99 فیصد کیسز میں ظاہری شواہد جس کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہی قاتل ہوتا ہے۔ پولیس ہمیشہ ظاہری شواہد کا پیچھا کرتی ہے۔''

''اور مرڈر مسٹریز کا کیا؟''

''مرڈر مسٹریز اور فلمیں صرف اس ایک فیصد کے لیے لکھی جاتی ہیں جہاں قاتل ہوشیار ہوتا ہے اور اپنا سراغ مٹا لیتا ہے۔ ورنہ 99 فیصد قاتل اتنے ہوشیار نہیں ہوتے۔ یہاں کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ تالیہ اتنی ذہین تھی تو ثبوت کیوں چھوڑا؟ پولیس یہ سوچے گی کہ چونکہ ہم بہت ذہین ہیں' اس لیے ہم نے کیک آرڈر کرنے والے کا کارڈ نمبر حاصل کیا اور بینک سے اس کا نام معلوم کیا تو وہ تالیہ مراد نکلی۔ وہ اس کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔''

''یعنی مجھے اپنا نام کلیئر کروانے کے بجائے ملک سے فرار ہو جانا چاہیے؟ کیونکہ یہاں کوئی میرا یقین نہیں کرے گا۔'' وہ تلخی سے بولی۔ اس کے انداز میں واضح بے بسی تھی۔

''یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میں آپ کی رپورٹ نہیں کروں گا کیونکہ آپ اس کیس میں بے قصور ہیں۔'' انہوں نے فائل بند کی اور عینک اتار کے رکھی۔ چند لمحے کے لیے اس روشن سٹنگ روم میں خاموشی چھائی رہی۔

''وان فاخ کے یہ چھ سال کیسے گزرے؟''

اس نے کھڑکی سے باہر دھندلے لان کو دیکھتے ہوئے سوال پوچھا تو احمد نظام چونکے۔

''کیا آپ ان سے رابطے میں نہیں ہیں؟''

تالیہ نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔ ''میں نے کہا نا' وقت نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ وہ دو دفعہ وزیراعظم بن چکے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔''

''تو کیا اتنے برس آپ نے نیوز یا ان کا سوشل میڈیا کچھ نہیں دیکھا؟''

''آپ تو دیکھتے رہے ہوں گے۔ آپ بتائیں۔ جب وہ جونکر اسٹریٹ پہ زخمی حالت میں ملے تھے.... اس کے بعد.... انہوں نے کیا کیا؟'' وہ اب احمد نظام کو دیکھ کے پوچھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''انہوں نے کچھ عرصے کے لیے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ غالباً عصرہ بیگم کے انتقال کے باعث۔'' وہ یاد کر کے بتانے لگے۔ ''پھر سننے میں آیا کہ وہ دوستوں' رشتے داروں سب سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ وہ زیادہ وقت اپنے ملاکہ والے گھر میں گزارنے لگے تھے۔ میڈیا پہ آنا چھوڑ دیا۔ کوئی پاپارازی ان تک پہنچ کے تصویر اتار لاتا تو لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وان فاخ بھی وجود رکھتے ہیں ورنہ نہیں۔ مجھے یاد ہے وہ کثرت سے سگریٹ نوشی کرنے لگے تھے۔ ان کی سمندر کنارے تصاویر منظر عام پہ آئی تھیں جن میں وہ بیمار چہرے کے ساتھ سگریٹ پیتے دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے وہ ڈرگز کا استعمال بھی کرنے لگے ہیں۔ دواؤں کا بھی شاید۔ لیکن کچھ عرصہ وہ بالکل دنیا سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔''

اس کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کے بہنے لگی۔

''پھر معلوم نہیں کیا ہوا..... وہ سنبھل گئے۔ دوبارہ سے خبروں میں آنے لگے۔ صحت بھی بحال ہو گئی۔ الیکشن قریب آئے تو وہ واپس اپنی پارٹی کو سنبھالنے لگے۔ عصرہ کی موت اور وان فاخ کے اس غمگین فیز نے ان کو بہت کثیر تعداد میں ہمدردی کے ووٹ سے بھی نوازا۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ آدمی ایک بہت بڑے غم سے نکلا ہے۔ لوگوں نے اس آدمی کو اپنا غم گسار سمجھا اور اسے ووٹ دیا۔''

''تو کیا انہوں نے لوگوں کے لیے کام کیا؟''

''انہوں نے اچھے کام بھی کیے۔ اور بہت سے اچھے کام نہیں بھی کیے۔ میں ذاتی طور پہ کبھی بھی وان فاخ کا فین نہیں رہا۔ اپوزیشن ان سے ناخوش ہے اور ان کے ووٹرز خوش ہیں۔ لیکن یہ تو ہر وزیر اعظم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے سب خوش کبھی نہیں ہوتے۔ مگر ان کی تعلیمی پالیسیاں جو اس وقت تنقید کا نشانہ بنتی تھیں' پانچ سال بعد ان کا پھل لوگوں کو نظر آنے لگا۔ تبھی وہ آج دوبارہ اقتدار میں ہیں۔''

''اور ان کے بچے؟''

''وہ ماں کے انتقال کے بعد امریکہ میں کچھ عرصہ رہے لیکن جب وان فاخ زندگی کی طرف لوٹ آئے تو انہوں نے بچوں کو بھی واپس بلا لیا۔ ان کے بچے اب ان کے ساتھ ہی قیام پذیر ہیں۔''

تالیہ نم آنکھوں سے مسکرائی۔

☆☆☆

پترا جایا ملائیشیا کا دارالحکومت ہے۔ یہ کے ایل کے پڑوس میں واقع ہے۔

وزیر اعظم ہاؤس اسی شہر میں تھا اور اسے سری پردھانہ کہتے تھے۔ سری پردھانہ کسی محل سے کم نہ تھا۔ عالی شان' اونچا' خوب صورت۔ لیکن گزشتہ کافی عرصے سے وزرائے اعظم نے سری پردھانہ میں رہائش ترک کر رکھی تھی۔

وان فاخ کی اپنی رہائش گاہ پترا جایا میں واقع تھی۔ وہ دو منزلہ بنگلہ تھا جس کے چاروں طرف سبزہ زار تھا۔ اس کی فصیل اونچی چار دیواری کی شکل بنائی گئی تھی جہاں سیکیورٹی سخت نظر آتی تھی۔

اس صبح گیٹ سے ایک کار داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ سفید کار کی کھڑکی سے ایک نسوانی ہاتھ آئی ڈی کارڈ سیکیورٹی آفیسر کو دکھا رہا تھا۔ آفیسر نے رسماً آئی ڈی دیکھی اور مسکرا کے سر کو خم دیا۔ پھر ایک ڈیوائس سامنے کی تو نسوانی ہاتھ نے ایک انگلی اس پہ رکھ دی۔ ہر اسگنل بجا تو آفیسر نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اس مہمان سے واقف تھا۔ کار آگے بڑھ گئی تو افسر ہاتھ میں پکڑے آلے میں بولا۔

''مسز یشا تاج آچکی ہیں۔''

کار بنگلے کے داخلی حصے کے عین سامنے آ رکی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی۔ اس نے لمبی اسکرٹ پہ سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ گردن میں

پھولدار رومال لپیٹا تھا۔ شہد رنگ بال کندھوں تک آتے تھے۔ وہ صاف رنگت کی دراز قد اور خوب صورت عورت تھی۔ کہنی پہ بیگ اور ہاتھ میں دو کتابیں تھیں۔ کار سے نکلتے ہوئے اس نے سن گلاسز اوپر ماتھے پہ ٹکائیں اور دروازے پہ کھڑے گارڈ کو مسکرا کے سلام کرتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

بنگلے کے اندر ایک خوبصورتی سے آراستہ ڈائننگ ہال تھا۔ طویل میز کی سربراہی کرسی پہ فاتح بیٹھا' چائے پی رہا تھا۔ ساتھ ہی موبائل دیکھ رہا تھا۔ فاتح کے دائیں ہاتھ اشعر کرسی کھینچ رہا تھا۔ باقی تمام کرسیاں خالی تھیں۔

''بچے کہاں ہیں؟'' اس نے خالی کرسیوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سکندر صبح جلدی چلا گیا تھا۔ جولیانہ کا اسکول ٹرپ تھا۔ وہ شام کو واپس آئے گی۔'' فاتح موبائل دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اشعر نے جھرجھری سی لیتے ہوئے پلیٹ اپنی طرف کی۔

''آپ نے کل انٹرویو میں تھوڑی سخت باتیں کہہ دی ہیں۔ مجھے رات سے ناراض اراکین کے فون آرہے ہیں۔''

''میں نے عرصہ ہوا لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دی ہے۔ نہ ووٹرز کی' نہ اپنے اراکین کی۔ میں پردھان منتری ہوں' اور وہ نہیں ہیں۔ ملک مجھے چلانا ہے' انہیں نہیں۔'' وہ بے نیازی سے ناشتہ کر رہا تھا۔

اشعر نے شانے اچکا دیے۔ ''خیر میں نے فون آف کر دیا ہے۔ شاید چند سال بعد لوگ احساس کر لیں کہ ہم ان کے لیے کتنی جان مارتے ہیں۔''

وان فاتح نے صرف شانے اچکا دیے۔ ''نہ بھی کریں تو کیا۔''

ہیل کی ٹک ٹک سنائی دی تو فاتح نے چہرہ اٹھایا۔ دربان نے دروازہ کھول دیا تھا اور باہر سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے چہرہ واپس نہیں جھکایا۔ وہ راہداری کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ آواز قریب آئی اور وہ بالآخر نظر آئی۔

''السلام علیکم' داتو سری۔ سلام' اشعر صاحب۔''

وہ مسکراتی ہوئی ان کے سامنے آرکی۔ اس کے سیاہ جوتے اتنے چمک دار تھے کہ چھت کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ یوں رکے تھے جیسے دوبارہ چلنے کو بے تاب ہوں۔

''وعلیکم السلام' میشا۔ کیسی ہیں آپ؟'' فاتح نے مسکرا کے جواب دیا۔ اشعر نے بھی اسی کے انداز میں مسکرا کے جواب دیا۔

''میں ٹھیک ہوں' داتو سری۔'' سر کو تعظیماً جھکا کے وہ بولی اور پھر مسکرا کے مڑی۔ ''ایکسکیوزمی۔''

''جولیانہ گھر پہ نہیں ہے' میشا۔''

سیاہ جوتے واپس گھومے۔ میشا کے چہرے پہ الجھن در آئی۔ ''جولیانہ نہیں ہے؟''

''نہیں۔ آج اس کا اسکول ٹرپ تھا۔ اس نے آپ کو انفارم نہیں کیا؟'' اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے نرمی سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ حیرت ہے۔'' میشا نے فون نکالا۔ اسکرین پہ انگلی پھیری۔ پھر چونک کے سر اٹھا کے دیکھا۔ میز پہ موجود دونوں افراد اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ جھینپ گئی۔

''سوری میں نے آپ لوگوں کو ڈسٹرب کر دیا۔'' لب دانت سے کاٹتے ہوئے اس نے اسکرین دیکھی۔ پھر اس کے گال سرخ ہوئے۔ ''جولیانہ نے لیٹ نائٹ میسج کیا تھا۔ میں نے نہیں دیکھا۔ مائی فالٹ۔''

''جولیانہ کو کال کر کے بتانا چاہیے تھا۔ غلطی اس کی ہے۔'' فاتح نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔

وہ ایک دفعہ پھر سے معذرت کر کے ایڑیوں پہ الٹی گھومی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ راہداری عبور کی اور مرکزی دروازے تک آئی اور دربان کے پاس رکی۔

''اف.... دانش.... اف.... آپ نے مجھے دروازے پہ ہی کیوں نہیں بتا دیا کہ جولیانہ کو آج نہیں

پڑھانا؟'' ماتھے کو چھوتی وہ خفت سے کہہ رہی تھی۔

''میں نے سوچا تھا لیکن دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ سادگی سے مسکرا دیا۔

''یا اللہ۔ مجھے دا تو سری کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ حد ہے۔'' میشا ماتھے کو پھر سے چھوا اور اسے خدا حافظ کہتی باہر نکل گئی۔ باہر کھڑے دوسرے دربان کو بھی اسی پریشان چہرے کے ساتھ ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی مسکرا کے سر کو خم دیا۔

وہ سب میشا کے عادی تھے۔ میشا کی باتوں' میشا کی عادتوں سے واقف تھے۔

''یہ جولیانہ کی ہوم ٹیوٹر میشا..... یہ اچھی عورت ہے۔ ہے نا؟'' اشعر نے پھل کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بظاہر سرسری سا کہا اور غور سے فاتح کو دیکھا۔ وہ اب چائے کے آخری گھونٹ بھر رہا تھا۔

''ہاں۔ بہت قابل ہے۔ دو سال سے جولیانہ کو پڑھا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے جولیانہ کا اعتماد بحال ہوا ہے۔ ورنہ تم تو جانتے ہو' اس نے چھوٹی عمر سے اسکول چھوڑ دیا تھا۔''

''ہوم اسکولنگ راس آ گئی ہماری جولیانہ کو۔ شکر ہے۔'' اشعر نے گہری سانس لی۔ ''وہ سکندر جیسی نہیں تھی۔ ہر طرح کے بچوں کے ساتھ گھل مل کے نہیں پڑھ سکتی تھی۔ پھر کاکا کی موت نے بھی شاید اسے ایسا کر دیا تھا۔ مگر یہ ٹیوٹر..... یہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی وجہ سے گھر میں رونق لگ جاتی ہے۔''

''ہاں۔ یہ اچھی لڑکی ہے۔ سادہ اور خوش اخلاق۔ اس کی بیٹی جولیانہ کی کلاس فیلو ہے۔''

''سب اس کو مسز کہتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی اس کا شوہر نہیں دیکھا۔''

''غالباً اس کی شادی ختم ہو گئی تھی۔ جولیانہ نے بتایا تھا۔ تم اتنے تجسس کیوں ہو؟'' فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ''کیا دوسری شادی کا ارادہ ہے؟''

اشعر نے ابرو اکٹھے کر لیے۔ ''کیا میں ایک تجربہ کر کے بھگت نہیں رہا۔ میری ایکس وائف میرے بیٹے سے مجھے ملنے تک نہیں دیتی۔ وزٹنگ آورز مائی فٹ۔'' اس نے نیپکن گول مول کر کے پرے پھینکا۔ ''کل اس کی سالگرہ ہے۔ جانتے ہیں کتنی مشکل سے ہم دونوں نے ایک میز پہ اکٹھے بیٹھ کے پارٹی پلانرز کے ساتھ کام کیا ہے؟''

''ریلیکس۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا بیٹا بڑا ہو گا تو اس سے ملنا آسان ہو جائے گا۔'' وہ کرسی دھکیل کے کھڑا ہوا اور کوٹ کا بٹن بند کیا تو اشعر بھی ساتھ ہی اٹھا اور گہری سانس لے کر سنجیدگی سے فاتح کو دیکھا۔

''میں آپ کے لیے کہہ رہا تھا' آبنگ۔ اب تو آپ کے بچے بھی بڑے ہو چکے ہیں۔ آپ کو کسی نہ کسی عورت کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''یہ طے ہے کہ ہر دوسرے تیسرے ماہ بعد تم اس ٹاپک کو ضرور چھیڑو گے۔'' وہ مسکرا کے بولا تو اشعر بھی مسکرا دیا۔

''آبنگ۔ ہم نے اتنے برسوں سے ایک ساتھ کتنے خٹھن دریا عبور کیے ہیں۔ اب ہم ہموار زمین پہ آ چکے ہیں۔ آپ کو اب ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ کب تک کام میں خود کو مصروف رکھیں گے۔'' پھر اشعر نے راہداری کی طرف دیکھا جہاں سے وہ گئی تھی۔ ''اگر کوئی سادہ' نیچرل اور اچھی سی عورت ملے تو اس کے بارے میں سوچیے گا ضرور۔'' اس نے خلوص سے کہا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔

''میں سوچوں گا۔'' اس کے چہرے پہ کوئی سایہ' کوئی یاد' کچھ نہ تھا۔ وہ بالکل مطمئن اور اپنی زندگی سے قانع لگتا تھا۔ اشعر کے لیے اس کی یقین دہانی نئی تھی۔ وہ مسکرا دیا اور پھر دونوں ایک ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

لاؤنج عبور کرتے ہوئے فاتح نے کھڑکی کے باہر بھیگتے منظر نامے کو دیکھا اور سوچا..... آج پتر اجایا میں ہر دوسرے روز کی طرح بارش شروع ہو چکی تھی۔ اور یقیناً کے ایل میں بھی۔

☆☆☆

احمد نظام کے مہمان خانے کی کھڑکی سے نظر آتا سبزہ زار ہنوز بارش میں بھیگ رہا تھا۔ پانی نے کھڑکی کے شیشے کو دھندلا دیا تھا۔ وہ ابھی تک باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔

''کیا انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی؟ یا ان کی زندگی میں کوئی اور عورت نہیں آئی؟'' وہ باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''نہیں۔ اشعر کی بیوی واحد عورت تھی جو فیملی فوٹوز میں نظر آنے لگی تھی لیکن اشعر اور اس کی علیحدگی کے بعد وہ بھی منظر سے ہٹ گئی۔ وان فاتح اپنے بچوں اور اشعر کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔'' انہوں نے موبائل نکال کے چند بٹن دبائے پھر اسکرین کا رخ اس کی طرف کیا۔ وہ جھک کے دیکھنے لگی۔ فاتح کے کسی فین پیج کی تصاویر سامنے کھلی تھیں۔ یہ پچھلے برس کی تھیں۔ جولیانہ کی سالگرہ کا کیک کاٹا جا رہا تھا۔ فاتح، سکندر اور اشعر کے علاوہ وہاں صرف کم عمر لڑکیاں تھیں جو یقیناً جولیانہ کی سہیلیاں تھیں۔

البتہ ایک عورت ان سب میں نمایاں تھی۔ اس نے سر پہ ترچھا ہیٹ پہن رکھا تھا اور مسکرا کے تالی بجا رہی تھی۔

''یہ عورت کون ہے؟'' اس نے انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کیا تو احمد نظام نے موبائل اپنی طرف موڑا۔

''بیشا تاج۔ یہ جولیانہ فاتح کی ہوم ٹیوٹر ہے۔ چند سالوں سے ان کی فیملی کا حصہ ہے۔ اس کو دو چار دفعہ میں نے ان کی فیملی فوٹوز میں ہی دیکھا ہے۔''

تالیہ پتلیاں سکوڑے غور سے اس عورت کا خوب صورت چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال بہت خوب صورتی سے اسٹائل کیے گئے تھے۔ کندھوں تک آتے شہد رنگ بال... کانوں میں ننھے ہیرے.... سفید اسکرٹ کے اوپر نیلا منی کوٹ.... اور مسکراتے ہوئے گال میں پڑنے والا معصوم سا ڈمپل.....

''یہ کیا کرتی ہے؟ ٹیوٹر ہونے کے علاوہ؟'' پھر نظریں اٹھا کے انہیں دیکھا۔ ''ایک منٹ.... یہ آرٹسٹ ہے نا؟''

''اس کی لنکڈ ان پروفائل چیک کرلیں۔'' کہنے کے ساتھ انہوں نے موبائل پہ چند بٹن دبائے۔ پھر پڑھ کے بتانے لگے۔ ''جی۔ یہ ایک آرٹسٹ ہے۔ پینٹ بھی کرتی ہے اور فوٹو گرافی بھی۔ اس کی ایک دو نمائشیں بھی ہو چکی ہیں۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

''ہوں۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔ معروف سوشلائٹ۔ آرٹسٹ۔ خوش اخلاق۔ ذہین۔ غیر شادی شدہ۔'' پھر رکی اور جیسے تصحیح کی۔ ''نہیں۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ بلکہ علیحدگی بھی ہو چکی ہے۔''

''اگر آپ اس کو جانتی ہیں تو اس کے توسط سے وان فاتح سے ملاقات کرسکتی ہیں۔''

''میرا خیال تھا، آپ بھی اس کو جانتے ہوں گے۔'' وہ جیسے حیران ہوئی تھی۔

''نہیں۔ میں نے اس کو سوشل میڈیا پہ ہی تھوڑا بہت دیکھا ہے۔ میں اسے کیسے جانوں گا؟ میں ٹھہرا مڈل کلاس آدمی اور یہ خاتون ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہیں۔'' وہ اس کی حیرت پہ حیران ہوئے تھے۔

''لیکن آپ چھ سال کے لیے اس ملک سے دور تھیں۔ آپ ان کو چھ سال پہلے سے جانتی ہیں کیا؟'' وہ متجسس ہوئے۔

''ایڈم کیسا ہے؟ ایڈم بن محمد؟'' وہ اس کا سوال نظر انداز کرگئی۔

''وہ اینکر؟''

''جی۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔'' وہ مسکرا کے بولی تو احمد نظام چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی نظروں میں کچھ تھا جو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''ایڈم کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ؟''

''آپ نے پھر کبھی اس سے رابطے کی کوشش نہیں کی؟''

''نہیں۔ کیوں؟''

''میں اس سے عصرہ محمود کی موت کے بعد ایک دو دفعہ ملا تھا جب میں اپنے تئیں اس کیس کی تحقیق کر رہا تھا۔ اور تب ہی مجھے معلوم ہوا تھا اس کے حادثے کا۔''

''کیسا حادثہ؟'' وہ سیدھی ہو کے بیٹھی۔

''جب وان فاخ زخمی حالت میں ملے تھے جونکر اسٹریٹ پہ....اس کے آس پاس کی بات ہے....ایڈم ملاکہ کے ایک ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے کر آئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نہیں جانتا وہ جونکر اسٹریٹ تک کیسے پہنچا۔ اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔''

''یادداشت؟'' وہ پلک جھپکنا تک بھول گئی۔ اس کا سانس رک گیا۔

''جی۔ اس کو پچھلے چند ماہ کے واقعات بھول چکے تھے۔ کوئی ذہنی صدمہ تھا یا کیا۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک سلیبریٹی رپورٹر بن چکا ہے۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ وان فاخ کے گھر باڈی مین بن کے گیا تھا۔ اس کے بعد کے تمام واقعات ذہن سے محو ہو چکے تھے۔ عجیب بات ہے۔''

''اسے....اسے سب بھول گیا تھا؟'' وہ ٹکر ٹکر ان کو دیکھ رہی تھی۔

''اس نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا۔ ہانگ کانگ پیپرز اس کو کیسے ملے، اسے یہ تک معلوم نہ تھا۔ میں اس سے آپ کے سلسلے میں ملا تھا۔ پولیس نے بھی بار بار اس سے آپ کے لیے رابطہ کیا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ کسی تالیہ مراد کو نہیں جانتا۔ البتہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ تالیہ مراد کون تھی جس کے بارے میں ہر کوئی اس سے سوال کرتا تھا۔ وہ کافی عرصے تک تھراپی کرواتا رہا تھا۔ پھر بالآخر وہ تندرست ہوا اور واپس رپورٹنگ کی طرف آ گیا۔''

''کیا اس کی یادداشت واپس آئی؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، نہیں آئی۔ جب وہ واپس رپورٹنگ کی طرف آیا تو بہت ڈسٹرب لگتا تھا۔ وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ ہانگ کانگ پیپرز کی شہرت' کامیابی' دو کتابوں کی تصنیف سب ختم ہو گئی۔ اس زمانے میں اس نے کئی انٹرویوز میں یہ بات کہی تھی۔ وہ ایک رات باڈی مین تھا اور اگلی صبح وہ جاگا تو لوگوں نے کہا وہ رپورٹر ہے۔ لیکن چونکہ ذہین لڑکا تھا۔ کام اور ماحول کے ساتھ ایڈاپٹ کر گیا اور آج دیکھو، وہ کہاں پہنچ گیا ہے۔''

وہ گم صم سی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ''ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ اداکاری کر رہا ہو۔''

''جب اس نے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو میں نے بھی یہی سمجھا۔ پولیس نے بھی یہی سمجھا۔ لیکن ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ شاید یہ آپ کے کیس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔''

''نہیں۔ وہ مذاق کر رہا ہوگا۔'' وہ زرد پڑتے چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ ''وہ مجھے نہیں بھول سکتا۔ وہ....وہ تمام دن....نہیں بھول سکتا۔''

احمد نظام نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ''یا شاید آپ یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ وقت آگے بڑھ گیا ہے اور لوگ بھی۔''

تالیہ نے کنپٹی کو انگلی سے مسلتے ہوئے چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ساتھ ہی مسلسل نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

''میں نے کہا نا....وہ اداکاری کر رہا ہوگا۔ وہ مجھے نہیں بھول سکتا۔ نہ وہ بدل سکتا ہے۔'' اس کی نظریں باہر لان کی گھاس پہ جمی تھیں۔ ''وہ اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ کتابیں پڑھنے والا۔ کتابیں اس کی بہترین دوست ہوں گی۔ وہ ان میں پناہ ڈھونڈتا ہوگا۔ ان سے سارے مسئلوں کے حل مانگتا ہوگا....وہ اب بھی ویسا ہی ہوگا....''

☆☆☆

ایڈم بن محمد کا اپارٹمنٹ ایک شیشوں سے ڈھکی

طویل قامت عمارت کی بالائی منزلوں میں سے ایک میں تھا۔ لاؤنج کی شیشے کی دیوار سے دور تک شہر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اسٹڈی روم میں اس کی کرسی کے پیچھے بھی شیشے کی دیوار تھی۔ کرسی پہ ایڈم بیٹھا تھا اور کی بورڈ کو دیکھے بغیر' اسکرین پہ نگاہیں مرکوز کیے ٹائپ کر رہا تھا۔

ایڈم کے دائیں بائیں دونوں اطراف میں کتابوں کے ریکس رکھے تھے۔ کچھ ریکس اونچے تھے۔ کچھ نیچے تھے۔ کچھ سیڑھیوں کی مانند ایک طرف سے چھوٹے ایک طرف سے اونچے تھے۔ اس ڈیزائن کے باعث اسٹڈی کے وسط میں کھڑے ہو کے تمام ریکس نظر آتے تھے۔

سامنے کاؤچ رکھے تھے جن پہ مہمان بیٹھ سکتے تھے۔ وہیں دروازہ بھی تھا۔ وہ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کے دروازے کو دیکھ لیتا پھر واپس کام کرنے لگ جاتا۔ سیاہ ہائی نیک شرٹ پہنے' ماتھے پہ بال بکھیرے' ہلکی بڑھی شیو والا ایڈم بن محمد پہلے سے زیادہ پرکشش ہو چکا تھا۔

''باس۔'' دروازہ کھلا اور ایک چینی نقوش کی حامل لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کا قد درمیانے سے ذرا چھوٹا تھا اور بالوں کا بوائے کٹ تھا۔ کانوں میں گول سلور بالیاں تھیں۔ اس نے ٹھک ٹھک دوازہ کھٹکھٹایا' مسکرائی اور بیک وقت بہت سی چیزیں سنبھالتی تیزی سے اندر آئی۔

''فلائیٹ کیسی رہی تمہاری' صوفی؟'' وہ ٹائپ کرتے ہوئے خوش گوار انداز میں بولا۔ لڑکی افسوس سے سر جھٹکتی آگے آئی اور جلدی سے کپ اس کے سامنے رکھا۔

''آپ کی آئسڈ امیریکانو۔'' اس نے لمبا سا کپ ایڈم کے سامنے رکھا جس پہ سیاہ قلم سے ''رائٹر'' لکھا تھا۔

''تھینک یو۔ اور کیسے تھے افریقہ کے جنگلات جہاں سے تم کافی لانے گئی تھیں۔''

''اگر آپ مجھے ایک ساتھ بہت سے کام نہ تھمایا کریں تو مجھے اتنی دیر نہ لگا کرے۔'' بوائے کٹ والی لڑکی اس کے طنز کو نظر انداز کر کے تحمل سے بولی۔ ''یہ رہے آپ کے پرنٹ آؤٹس۔ یہ آپ کا ریسرچ ڈیٹا۔ یہ نئے وزیٹنگ کارڈز کا سیمپل''۔ اس نے باری باری کاغذوں کے چند پلندے سامنے رکھے۔ اب بغل میں صرف ایک پھولا ہوا پیکٹ دبا رکھا تھا۔ پھر سیدھی ہوئی اور گہری سانس لی۔ ''آپ کو آفس جانے سے پہلے کچھ اور چاہیے؟''

ایڈم نے ٹائپنگ روک کے چھت کو دیکھا۔ ''دو تین چیزیں چاہئیں لیکن سوچ رہا ہوں کہ وہ قریبی ممالک سے مل سکیں گی یا نہیں۔'' اور پھر آنکھیں گھما کے ایک ناراض نظر اس پہ ڈالی اور واپس ٹائپ کرنے لگ گیا۔

''گڈ۔ اگر ملائیشیا سے کچھ نہیں لانا تو مجھے آج آف دے دیں۔''

ایڈم نے آنکھیں گھما کے اسے دیکھا تو اس نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکائیں۔ ''باس آج میری فرینڈ کی برتھ ڈے ہے۔ میں آپ کے ساتھ آفس نہیں جا سکوں گی۔''

''کون اتنی صبح برتھ ڈے مناتا ہے؟''

''اور آپ اتنی صبح کب سے آفس جانے لگے؟ دوپہر میں ہی جائیں گے۔ اتنا فاصلہ ہے ریستوران تک۔ اور مجھے لنچ پہ پہنچنا ہے وہاں۔''

ایڈم نے افسوس سے سر جھٹکا اور واپس اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے سے چھٹی لے ہی لیتی ہو۔''

''میرے نہ ہونے سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کو بار بار چائے، کافی نہیں ملے گی۔ اور آپ لکھ نہیں سکیں گے۔ تو خیر ہے۔ ویسے ہی آپ رائٹرز بلاک کی وجہ سے کتنے ہی ہفتے سے نہیں لکھ رہے۔'' وہ مسکراہٹ دبائے بک ریک کی طرف بڑھ گئی تو ایڈم بن محمد نے تلملا کے اسے دیکھا۔

''رائٹرز بلاک کے بارے میں ایک لفظ نہیں' صوفی۔ جس کو لکھنا نہیں آتا وہ اس بارے میں کوئی

رائے نہ دے تو اچھا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، آپ کتنے دنوں سے نئی کتاب نہیں لکھ رہے۔ بس یہ چھوٹے موٹے آرٹیکلز لکھتے رہتے ہیں۔ مگر خیر.... چھپا لیں۔ بے شک چھپا لیں۔'' ریک کے ساتھ کھڑی صوفی اس کی طرف پشت کیے پیکٹ کھولنے لگی۔

''آپ نے جو کتابیں آرڈر کی تھیں، وہ آ گئی ہیں۔'' ریپر اتارتے ہوئے اطلاع دی۔

''میں نے کی تھیں؟'' وہ ہنوز ٹائپ کر رہا تھا۔

''یعنی کہ میں نے آپ کے ایمزون اکاؤنٹ سے کی تھیں آرڈر، باس۔ یہ اس سال کی مین بکرز پرائز کی شارٹ لسٹ کردہ پانچ کتابیں ہیں۔ اور بطور رائٹر آپ کے لیے مہینے میں دس نئی کتابیں پڑھنا ضروری ہے۔'' اس نے ریپر ڈسٹ بن میں اچھالا اور نئی نکور پانچ دبلی پتلی کتابیں الٹ پلٹ کے دیکھیں۔ پھر ناک کے قریب لے جا کے آنکھیں بند کیے انہیں سونگھا۔

نئی کتاب کی مہک اندر تک روح کو سرشار کر گئی۔

''اچھا۔ رکھ دو۔ تھینکس۔'' وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

''رکھ دوں گی۔ ہر ہفتے ان کی ڈسٹنگ بھی کر دوں گی۔ لیکن نہ کبھی یہ جگہ سے ہلیں گی۔ نہ ان کے کونے مڑیں گے۔ جب کتاب کا مالک کتاب کو پڑھے ہی نہ تو یہ سب کیسے ہوگا۔'' ان کو ریک میں سجاتے ہوئے شکایتی انداز میں بولی۔

''اب تک مجھے تمہاری تقریریں یاد ہو چکی ہیں جو تم نیا بک آرڈر موصول ہونے پہ کرتی ہو، صوفی۔''

صوفی نے ٹھک سے کتابیں اندر گھسائیں اور اس کی طرف گھومی۔ اس کی بالیاں بھی ساتھ ہی گھومیں۔

''کتابیں پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں، باس۔ اتنی بڑی لائبریری میں سجا کے انٹرویوز پہ دکھاوے کے لیے نہیں۔''

''میں کیا کروں، صوفی! مجھے وقت نہیں ملتا۔'' اس نے لکھتے ہوئے شانے اچکائے۔

''مگر آپ کو سوشل میڈیا اسکرول کرنے کے لیے وقت مل جاتا ہے۔ آپ کو ویڈیو گیمز کھیلنے کے لیے وقت مل جاتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ باربی کیو کرنے اور پارٹیز اٹینڈ کرنے کے لیے وقت مل جاتا ہے۔ ٹھیک۔ ٹھیک۔''

''لے لو بھئی تم چھٹی۔ جاؤ پلیز۔ مجھے کام کرنے دو۔'' وہ ناک سکوڑ کے بولا اور سر جھٹک کے تیز تیز ٹائپ کرنے لگا۔

''جا رہی ہوں۔ لیکن ویک اینڈ پہ ان کو پڑھیے گا ضرور۔ رات میں سونے سے پہلے بے شک ایک صفحہ....''

''تمہیں اگلے دو دن کی چھٹی بھی چاہیے؟'' نظریں اٹھا کے گھورا۔ اسی وقت صوفی کا فون بجنے لگا۔

''جا رہی ہوں۔'' بوائے کٹ والی اسسٹنٹ سر جھٹک کے باہر نکل گئی۔ اس نے کافی کا کپ لبوں سے لگایا، گھونٹ بھرا اور مسکرا کے دوبارہ سے لکھنے لگ گیا۔

کتابیں خاموشی سے اسے کام کرتے دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

وہ اب بھی باہر لان کی نم گھاس کو دیکھ رہی تھی۔ یا شاید آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔ بارش تھم چکی تھی لیکن تاریک بادل ہنوز چھائے تھے۔

''ایڈم.... وہ اب بھی ویسا ہوگا۔ شاید۔'' چند ثانیے خاموشی سے بیت گئے۔ پھر اس نے چہرہ ان کی طرف موڑا۔

''کیا میں کسی طرح وان فاتح سے مل سکتی ہوں؟ کیا آپ کوشش کر سکتے ہیں؟''

سامنے بیٹھے احمد نظام نے کندھے ہلکے سے اچکائے۔ ''وزیر اعظم سے ملنا اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ اپائنٹمنٹ کے لیے مہینوں کا

پراسیس ہے اور پھر درخواست ریجیکٹ ہو جاتی ہے۔ پی ایم کے گرد سیکیورٹی اور پروٹوکول کی بہت سی دیواریں ہیں جن کو پھلانگنا میرے قد سے اوپر کی بات ہے۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن کیا آپ مجھے ایڈم بن محمد سے ملوا سکتے ہیں۔''

''وہ بھی ایک سیلیبریٹی ہے۔ عام جگہوں پہ نہیں جاتا۔ کافی شاپس' ریستورانوں تک میں اسے ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ لیکن میں اس سے اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کر سکتا ہوں کیونکہ میں اس کی سیکرٹری کو جانتا ہوں۔ وہ میری بھانجی کے ساتھ پڑھتی تھی۔'' انہوں نے موبائل پہ ایک نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔ ''امید ہے وہ میرا فون اٹھا لے گی۔''

''واؤ۔ اب مجھے ایڈم سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینی پڑے گی۔'' اس نے دل میں سوچا لیکن بولی کچھ نہیں۔ منتظر نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

''صوفی.... کیسی ہیں آپ؟ میں احمد نظام بات کر رہا ہوں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ جی میں نے آپ کا نمبر پہچان لیا تھا۔'' اسپیکر آن تھا، اس لیے وہ سن سکتی تھی۔

''صوفی.... مجھے ایڈم بن محمد سے ملنے کا وقت چاہیے۔ دراصل....'' انہوں نے تالیہ کو دیکھا جو سانس روکے بیٹھی تھی۔ ''ان سے کہہ دیں کہ تالیہ مراد ان سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''اوہو۔ میں تو ابھی ان کے گھر سے نکل رہی ہوں۔ ایک منٹ۔ میں واپس جاتی ہوں۔'' گہری سانس لے کر بولی۔ ''صرف آپ کے لیے۔ یاد رکھیے گا۔ اور تالیہ مراد کون ہیں؟''

''وہ پہچان جائیں گے۔ میں ہولڈ پہ ہوں۔ بہت شکریہ۔'' انہوں نے حوصلہ افزا مسکراہٹ سے تالیہ کو دیکھا لیکن وہ بالکل دم سادھے بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر بعد صوفی کی ہانپتی ہوئی آواز اسپیکر میں گونجی۔ ''وہ پوچھ رہے ہیں کہ عصرہ محمود کے قتل کیس والی تالیہ مراد؟''

تالیہ کا دل ڈوب کے ابھرا۔ کیا اب یہی تعارف رہ گیا تھا دونوں کے درمیان؟

''جی وہی۔''

''اوکے اور ان کو کس سلسلے میں ملنا ہے؟''

تالیہ بالکل چپ بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ پھر اس نے فون ان کے ہاتھ سے لیا۔

''دیکھیے مس صوفی.... میرا کیس نئے سرے سے کھلنے جا رہا ہے۔ میڈیا اس کو کور کرے گا۔ لیکن میں اپنی اسٹوری صرف ایڈم بن محمد کو بتانا چاہتی ہوں۔ Exclusive scoop۔ پی ایم کی بیوی کا قتل کیس ہے یہ۔ آپ سوچ لیں۔ اگر آپ کے باس میری کہانی لکھنا چاہیں تو مجھے ملاقات کا وقت دے دیں ورنہ میں کسی اور سے رابطہ کر لوں گی۔''

''اوکے ویٹ ویٹ۔'' وہ خالصتاً کسی اینکر کی سیکرٹری کی طرح جلدی سے بولی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ غالباً وہ فون میوٹ کیے پیچھے اپنے باس سے بات کر رہی تھی۔ پھر اس کی آواز گونجی۔

''آج تو ایڈم صاحب مصروف ہیں۔ لیکن کل شام میں ہم مل سکتے ہیں۔ میں جگہ آپ کو ٹیکسٹ کر رہی ہوں۔ لیکن مجھے گارنٹی چاہیے کہ تالیہ مراد سب سے پہلے ہمیں انٹرویو دیں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ.....''

صوفی کے ساتھ معاملات طے کرنے میں چند منٹ لگے۔ فون بند ہوا تو وہ پھر سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اسے جیسے چپ لگ گئی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا۔ وہ آپ کو نہیں پہچانتا۔ اگر وہ اداکاری کر رہا ہوتا تو کہتا' کون تالیہ مراد۔ لیکن اس کو یاد تھا کہ اس کی یادداشت کھونے کے بعد اس سے آپ کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ اس لیے اس نے اتنا کہا جتنا اس کو یاد تھا۔''

''یعنی اب میری پہچان صرف عصرہ محمود کی قاتل کی حیثیت سے کروائی جائے گی۔ واہ۔'' وہ طنز سے کہتی اٹھی۔ ''وہ قتل جس کے لیے میرے پاس کوئی

وجہ نہیں تھی۔''

اور پھر وہ اپنے الفاظ پہ خود ہی چونکی۔

''آپ نے کہا تین چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ ثبوت۔ آلہ قتل۔ اور motive (قتل کا سبب)۔ ثبوت اور آلہ قتل پولیس کے پاس ہیں لیکن ''وجہ'' کوئی نہیں ثابت کر سکا۔ میں آخر عصرہ محمود کا قتل کیوں کروں گی؟''

احمد نظام نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے بولی۔ ''عصرہ کو مار کے میں پارٹی کی چیئر پرسن نہیں بن سکتی تھی۔ نہ ہی میرے' عصرہ اور فاتح کے درمیان کوئی لو ٹرائینگل تھی۔''

''تالیہ.... آپ....'' لیکن وہ سنے بغیر بولتے ہوئے کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہی تھی۔

''اگر لو ٹرائینگل ہوتی تو عصرہ مجھے مارتیں۔ نہ کہ میں عصرہ کو۔ اور کون سا عصرہ کو مار کے ان کی جائیداد میں سے مجھے کچھ مل جانا تھا۔ پھر میں کیوں ماروں گی انہیں؟'' اس نے بیگ اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا آپ کو عصرہ محمود کی وصیت کے بارے میں نہیں معلوم؟'' احمد نظام نے تعجب سے اس لڑکی کو دیکھا جو کندھے پہ بیگ اٹھائے ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑی تھی۔ وصیت کے ذکر پہ اس کی آنکھیں پھیلیں۔

''کیسی وصیت؟'' وہ دھپ سے صوفے کے اس کونے پہ بیٹھی جو ان کے قریب ترین تھا اور بے یقینی سے پوچھا۔ ''میرے ہوتے ہوئے کسی وصیت کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔''

''لیکن آپ نے آن لائن یا اخبارات میں کہیں تو پڑھا ہوگا کہ....''

''سمجھیں، میں مر گئی تھی چھ سال کے لیے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا تھا۔ ٹھیک؟ اب بتائیں.... کون سی وصیت؟ کیسی وصیت؟''

اس کے پریشان چہرے کے دونوں اطراف سیاہ لٹیں جھول رہی تھیں۔ وہ ان کو کان کے پیچھے اڑسنا بھی بھول گئی تھی۔

''واؤ۔ خیر آپ کو یاد ہوگا کہ اپنی موت والے دن عصرہ محمود نے دولت صاحب کو گھر بلایا تھا جب آپ ان سے جھگڑا کر کے گئی تھیں؟'' انہوں نے عینک ناک پہ پیچھے دھکیلتے ہوئے باکس سے ایک کاغذ نکال کے سامنے رکھا۔ ''دولت امان نے پولیس کو بتایا تھا کہ....''

''کیا وہ وصیت لکھوانا چاہتی تھیں؟''

''نہیں۔ وصیت وہ اس واقعے سے دس دن پہلے لکھوا چکی تھیں۔ وان فاتح اور دولت امان کو انہوں نے ایگزیکیوٹرز مقرر کیا تھا۔ دولت امان کے مطابق' وہ آخری روز وصیت میں تبدیلی کروانا چاہتی تھیں۔''

''نو.... نو....'' وہ کانوں پہ ہاتھ رکھنا چاہتی تھی لیکن ہاتھ گود میں دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ''پلیز یہ مت کہیے گا کہ عصرہ نے میرے نام وصیت میں کچھ لکھ دیا تھا جو ان کے مرنے پہ میرا ہو سکتا تھا۔'' وہ جانتی تھی اس بات کا کیا مطلب تھا۔ قتل کا اس سے بہتر سبب عصرہ تالیہ کے اوپر نہیں ڈال سکتی تھی۔ اوہ نو۔

احمد نظام نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ اپنی آرٹ کلیکشن سے کچھ نوادرات آپ کے نام چھوڑ گئی تھیں۔ ان کی موت کے چند دن بعد ان کی وصیت کھول کے سنائی گئی تھی۔ وہ نوادرات اسی وقت آپ کے نام کر دیے گئے تھے اور وصیت پہ عمل درآمد مکمل کر دیا گیا تھا۔ یہ کام وان فاتح نے کروایا تھا کیونکہ عصرہ ان کو ایگزیکیوٹرز بنا کے گئی تھیں۔ وہ اس وصیت سے ناواقف تھے لیکن اپنا فرض انہوں نے پورا کیا۔''

''یعنی عصرہ اس بات کا انتظام کر گئی تھیں کہ پولیس کو میرے خلاف قتل کا سبب بھی مل جائے گا۔'' اس نے سر ہاتھوں میں گرا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

''عصرہ بیگم کی وصیت آپ کے خلاف سب

سے بڑا ثبوت ہے۔لوگ ایک پینٹنگ کے لیے قتل کر دیتے ہیں یہاں تو وہ سات آٹھ نوادرات آپ کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔لیکن انہوں نے آخری دن دولت امان سے کہا تھا کہ انہیں شک ہے تالیہ ان کو مروانا چاہتی ہے اس لیے وہ اگلی صبح جا کے وصیت میں تبدیلی کروائیں گی۔دولت نے کہا تھا کہ وہ پیپرز تیار کروادے گا۔لیکن جب وہ گھر پہنچا تو دیر ہو چکی تھی۔ان کی وصیت ان کے جنازے اور سوگ کے ایام گزر جانے کے بعد مورخہ تیئیس جنوری 2017 کو نوٹری پبلک میں پڑھ کے سنائی گئی تھی۔'' وہ ایک کاغذ سے پڑھ کے بتا رہے تھے۔

(پہلا ورکنگ ڈے۔پہلا سوموار۔اور وہ اتوار کو غائب ہوئی تھی۔اور وہ اسی ایک اتوار میں کھو گئی تھی۔)

''وصیت منظر عام پہ آنے کے بعد میرے خلاف کیس مزید مضبوط ہو گیا ہوگا۔'' اس نے زرد چہرہ اٹھا کے انہیں دیکھا۔

''بالکل۔اور دولت امان کا یہ بیان کہ عصرہ وصیت کو بدلوانا چاہتی تھیں کیونکہ ان کی دوست ویسی نہ تھی جیسا وہ اس کو سمجھتی تھیں آپ کا سارا کیس خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔''

''اور وہ وصیت؟ اس کا کیا ہوا؟''

''اشعر محمود نے ان نوادرات کے لیے اخبار میں اشتہار دیا۔اور ایسے حربے آزمائے جن کے ذریعے نوادرات کو مہنگا بنا کے پیش کیا گیا تاکہ آپ ان کے لالچ میں واپس آجائیں۔حالانکہ وہ نوادرات کسی خاص قدر و قیمت کے حامل نہ تھے۔زیادہ سے زیادہ دو چار لاکھ میں بک جاتے۔اور بس۔جب آپ کو ان کا لالچ واپس نہ لا سکا تو وہ اشعر نے کسی میوزیم میں عارضی طور پہ رکھوا دیے۔''

''میں ان نوادرات کا کیا کروں گی؟''

''وہ آپ کو کبھی مل بھی نہیں سکتے' چے تالیہ۔کیونکہ اشعر محمود کو معلوم تھا عصرہ کی وصیت اس وقت بے کار ہو جائے گی جب وہ کورٹ میں اپیل دائر کر کے کہے گا کہ یہ وصیت عصرہ سے زبردستی لکھوائی گئی تھی۔''

''اور میرے اوپر قتل کا الزام دیکھتے ہوئے کورٹ ایک پیشی میں اشعر کے حق میں فیصلہ دے دے گا اور وہ بے کار نوادرات مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔عصرہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ وہ مجھے نہ ملیں۔انہوں نے جان بوجھ کے دولت کو ایسا بیان لکھوایا جو وصیت کو مشکوک بنا دے۔''

''آپ مسلسل مسز عصرہ کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں۔حالانکہ وہ مقتولہ ہیں۔''

''آپ نہیں یقین کریں گے۔کوئی بھی نہیں کرے گا۔'' اس نے سر جھٹکا۔''یقیناً اب تک اشعر اس وصیت کو منسوخ کرا چکا ہوگا۔''

''بالکل۔اس نے ایسا ہی کیا ہوگا۔''

''واؤ۔میں ان چند نوادرات کے لیے عصرہ محمود کا قتل کروں گی جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو کسی میوزیم میں سجے پڑے ہیں؟ واؤ۔'' وہ بیگ اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوئی تو اس کے چہرے پہ جھنجھلاہٹ اور غصہ نظر آ رہا تھا۔

''اس وصیت کے ہوتے ہوئے میں اپنی بے گناہی کبھی ثابت نہیں کر سکتی۔مجھے اس ملک سے دور چلے جانا چاہیے۔آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

وہ اسے خاموشی سے دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے تو تالیہ نے گویا چڑ کے پوچھا۔ان کی نظروں میں کچھ تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں' کہیں آپ نے واقعی یہ قتل تو نہیں کیا؟ کیونکہ چھ سال بعد آپ منظر عام پہ آئی ہیں۔چھ سال ایک مشکوک عرصہ ہوتا ہے' چے تالیہ۔''

☆☆

ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ

سسی جیسا پیار

اس گھر میں دو بھائی زبیر اور سرمد اپنی بیویوں ثمینہ اور ساجدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زبیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرمد اور ثمینہ کی دو بیٹیاں تھیں روشانے اور زوباریہ۔ روشانے کی منگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔

زوباریہ پورے گھر کی لاڈلی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا صائم، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زیبی اور صائم میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ فائقہ کو زیبی کا یوں چھت پھلانگ کر اپنے گھر آنا اور صائم سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا، ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زیبی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔

صائم کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زیبی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زیبی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا نمبر لے کر زیبی سے بات کرتا ہے۔ زیبی صائم کی غلط فہمی میں شہیر سے بات کرتی ہے اور تحفے وصول کرتی ہے، پتا چلنے پر

پریشان ہوتی ہے۔صائم کا شہیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔
زوباریہ کے کہنے پر صائم اپنا گٹار توڑ دیتا ہے۔صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔زیبی اس کے لیے اپنی پاکٹ منی سے گٹار خریدتی ہے۔اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ دیتی ہے۔صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔

صائم اور زیبی چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ فائقہ وہاں آجاتی ہیں اور زیبی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر ثمینہ کو کھری کھری سناتی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آجاتا ہے۔ فائقہ دانیال کو کہتی ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبھالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رائی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ ثمینہ زوباریہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہیں۔

گھر پہنچنے پر صائم فائقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی فائقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوباریہ کے گھر معافی مانگنے جاتا ہے مگر ثمینہ اسے سخت ست سنا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشانے کی شادی ہو رہی ہے زیبی اداس ہے کہ اس نے تو تمام پروگرام صائم کے ساتھ بنائے تھے۔

سب کے سونے کے بعد زیبی کھانا پلیٹ میں لے کر چپکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔ فائقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور مسیج کر کے دانیال کو اوپر بلاتی ہیں، دانیال دونوں کو آکر تھپڑ مارتا ہے اور زیبی کو لاکر روشانے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کمبائن اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو گولی لگی ہے۔ وہ ہاسپٹل جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زیبی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ فائقہ کے اصرار پر زیبی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دنگ رہ جاتا ہے۔

صائم فائقہ سے معافی مانگ کر کہتا ہے کہ وہ اب اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب فائقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیں گی۔

صائم ماں سے وعدہ کر لیتا ہے کہ وہ ان کی بات مان کر پڑھائی پر توجہ دے گا اور زوباریہ سے ملے گا نہیں ابراہیم صاحب کہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں ایسا کیسے ممکن ہے۔ زوباریہ کو صائم پر غصہ آتا ہے کہ اس نے ماں کی بات کیوں مان لی۔ فائقہ فون پر بات کی اجازت دے دیتی ہیں۔

روشانے اس بات پر بہت خوش ہوتی ہے کہ اب ان کے ملنے پر پابندی لگ گئی ہے اور صائم کا کمرہ نیچے شفٹ کر دیا گیا ہے۔

زوباریہ ایک دن سب کی آنکھ بچا کر صائم کے گھر پہنچ جاتی ہے سرمد صاحب بخار کی وجہ سے گھر میں ہوتے ہیں۔ روشانے غصے میں دروازے کی کنڈی لگا دیتی اور اب باپ سے کہتی ہے گھنٹی بجے تو دروازہ آپ کھولیے گا۔ ثمینہ کو پتا چلتا ہے تو وہ دم بخود رہ جاتی ہیں۔ زیبی صائم سے مل کر واپس آتی ہے دروازہ بند دیکھ کر گھنٹی بجاتی ہے۔ دروازہ پر زرد چہرہ لیے باپ کو کود یکھ کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ وہ موبائل لے کر چند میسجز دیکھتے ہیں اور اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ صائم سے کس حد تک رابطے میں ہے۔

گھر میں سب کو پتا چل جاتا ہے کہ صائم کا رشتہ زیبی کی مرضی سے آیا تھا۔ سرمد صاحب ابراہیم اور فائقہ کے پاس جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنی کم عمری میں اس کی شادی یا رشتہ نہیں کر سکتے۔ ان کے انکار پر وہ زوباریہ کا رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ صائم کو نانا کے پاس دوسرے شہر بھیج دیا جاتا ہے۔

منگنی کی رات سرمد ہٹی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ وہ باپ یا صائم میں سے کسے چنے گی۔ صبح وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ زیبی کی خوشی کا خیال کریں گے اس کی شادی صائم سے ہی کریں گے۔ زیبی صائم سے رابطہ کر کے اپنی منگنی کا بتاتی ہے دونوں بھاگ کر نانا کے پاس لاہور جا کر نکاح کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ زیبی اور صائم گھر چھوڑ دیتے ہیں۔

صائم اور زیبی رات کے دو بجے مراد کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہ انہیں اپنے سرونٹ کوارٹر میں رکھتا ہے۔ مراد کو زیبی بہت بری لگتی ہے جو اپنے گھر والوں کو یوں دھوکا دے کر آ گئی تھی۔ سرمد ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد انہیں دانیال اور ابراہیم اسٹیشن پر نظر آتے ہیں۔ وہ ٹرین سے اتر کر چھپ جاتے ہیں۔

زیبی اور صائم مسجد میں جا کر نکاح کرنا چاہتے ہیں لیکن مولوی صاحب منع کر دیتے ہیں کہ اتنی کم عمر لڑکی کا نکاح ولی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور انہیں اپنے گھر لے جاتا ہے۔ صائم اسے پیسے دیتا ہے وہ ان کا نکاح کروا دیتا ہے۔ پولیس اس کے گھر آ جاتی ہے۔ وہ دونوں وہاں سے بھی بھاگ جاتے ہیں۔

دسویں قسط

''مجھے تم سے صرف ایک بات پوچھنا ہے۔'' ستارہ خالہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''جی خالہ!''

''بتاتائے چلی جاؤ گی تو ساری زندگی خلش رہے گی۔''

زوباریہ نے الجھ کر ستارہ کو دیکھا۔

انہوں نے ملکے سے توقف کے بعد ایک دم پوچھ ڈالا۔

''تم صائم کو پہلے سے جانتی ہو؟''

سیماب دروازے میں کھڑی ہوگئی۔

یہی تو وہ سوال تھا جو اس کے اندر کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔

''کیا صائم وہی لڑکا ہے جس سے تم محبت کرتی تھیں؟''

زوباریہ نے بے اختیار سر اٹھا کر ستارہ کو دیکھا۔ وہ نگاہوں میں ہزاروں خدشات لیے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کو ایسا کیوں لگا؟'' زوباریہ نے بمشکل اپنی آواز کی کپکپاہٹ کو قابو کیا۔ دروازے میں کھڑی سیماب کی دھڑکنیں کسی ممکنہ خدشے سے کانپنے لگی تھیں۔

''میں تمہیں جانتی ہوں۔ اس پورے عرصے میں تم نے جو ردعمل دیا، وہ فطری نہیں تھا۔ تم نے ایک بار بھی نارملی بی ہیو نہیں کیا اور اس بات کے لیے میرا دل نہیں مانتا کہ تم یہ سب جیلسی میں کر رہی ہو۔''

زوباریہ کا دل چاہا وہ سب سچ کہہ دے۔ مگر اس سے ہونا کیا تھا..... کیا اب گھر والے صائم کو قبول کر لیتے۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو یوں بھی سیماب کی زندگی سے دور جا رہی تھی جب تک سیماب کو ساری حقیقت کا علم ہوتا، وہ دونوں اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ کوئی تو اس نامراد محبت کے ہاتھوں بامراد ہو۔

جو دکھ اس نے سہے ہیں، وہ سیماب کے حصے میں تو نہ آئیں۔

زوباریہ نے بے غرض بن کے سوچا اور نفی میں گردن ہلا دی۔

ستارہ خالہ اور سیماب نے لاشعوری طور پر سکون بھری سانس کھینچی۔ ستارہ نے اٹھ کر زیبی کو گلے لگا کر پیار کیا۔

''جہاں بھی رہو، خوش رہو۔''

''شکریہ نہیں کہوں گی ستارہ خالہ! جو آپ نے میرے لیے کیا، اس کا صلہ آپ کو اللہ ہی دے سکتا ہے۔''

زوباریہ کی آواز نم ہوئی تو آنسو سیماب کی آنکھوں میں بھی آ گئے۔ کچھ بھی تھا، دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ لیکن اس نے زوباریہ کے مڑنے سے پہلے ہی وہ سارے آنسو سمیٹ لیے۔

وہ زیبی سے اب بھی ناراض تھی۔

زوباریہ عین سیماب کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''جانتی ہوں تمہارے دل میں میرے لیے بہت سی بدگمانیاں ہیں۔ لیکن سیماب میں تمہارے لیے کبھی بھی

برا نہیں سوچ سکتی۔ اللہ کرے تم اپنی زندگی میں ہر خوشی سمیٹو۔ تم اور صائم خوش رہو۔''

''فائنلی! تم نے ہم دونوں کا رشتہ تسلیم کر ہی لیا۔''

''چلتی ہوں، اللہ حافظ۔ بوا کو میرا اسلام کہنا۔ جانتی ہوں وہ مجھ سے نہیں ملیں گی۔ ان کے دل میں جو تمہارے لیے محبت ہے، بہت خالص ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے بھی بہت کچھ سکھایا ہے، اس لیے شکریہ کہنا۔''

''ہوں۔'' سیماب نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور زیبی جس طرح اچانک آئی تھی، اسی طرح اچانک ان کی زندگی سے چلی گئی۔

☆☆☆

''جا رہی ہو۔'' محمود صاحب نے بہت افسوس اور محبت سے سپید لباس میں ملبوس زوباریہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جیسے انسان بہت سے دکھ جھیل کر دکھوں کا عادی ہو جائے۔

''جانے سے پہلے آپ سے ملنا چاہتی تھی اور.....'' وہ ایک لمحے کو رکی۔

''صائم کو ایک پیغام بھی دینا تھا۔''

''خود دے دو۔'' صائم دونگ لیے باہر آیا۔ محمود صاحب نے اپنا مگ اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے اسٹک پکڑی، کھڑے ہوئے اور لان میں اتر گئے۔ اوائل نومبر کی چمکیلی، روپہلی دھوپ گل دوپہری اور کلفہ کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

بچے بڑے ہو گئے تھے۔ انگلی پکڑ کر چلانے کا وقت گزر گیا۔ وقت آ گیا تھا کہ فیصلے کی ڈوران کے ہاتھ میں دے دی جائے۔

''تو بولو، کیا پیغام دینا تھا مجھے۔'' صائم عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

زوباریہ نے بہت سنبھل کر ایک خاموش نظر اس پر ڈالی۔

''میں واپس جا رہی ہوں۔''

''تمہیں عادت ہے، بیچ رستے میں سے واپس لوٹ جانے کی۔'' ایسا گہرا طنز تھا کہ زوباریہ بلبلا اٹھی۔

''میری بات سنو۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ ''بہت ہو گیا۔ ایک بات طے ہو گئی کہ ہمارے راستے کبھی ایک نہیں ہو سکتے..... تو سب کچھ بھول کر آگے بڑھتے ہیں۔ سیماب اچھی لڑکی ہے، تمہیں سنبھال لے گی۔''

''اور تمہیں کون سنبھالے گا؟'' صائم نے بے حد افسردگی سے زوباریہ کو دیکھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ سنا تم نے..... تم سے صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ وہ رشتہ جو ہم دونوں کے درمیان قائم ہوا تھا، اسے خاموشی سے ختم کر دینا۔''

صائم نے ایک گہری سانس بھری۔

''لگتا ہے خزاں بہت قریب ہے۔'' محمود صاحب نے سبز پتوں کے پیلے پڑتے کناروں پر نظریں جماتے ہوئے ہر منظر سے نظریں چرا لیں۔

''اتنا تو کر لو گے نا۔'' زوباریہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

صائم نے جواب نہیں دیا تھا۔

وہ بولنا بھول گیا تھا۔ وہ ادھورا سا رشتہ اب بھی اس کے پاس بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ تو ثابت ہوا وہ محبت میں اب بھی ثابت قدم تھا اور زوباریہ پھر سے اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے دور جاتی زیبی کو دیکھا۔

وہ تیزی سے جا رہی تھی اور اس کا ست رنگا دوپٹہ عقب میں لہرا رہا تھا۔

سارے رنگ کسی دبیز دھند کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔
یہاں تک کہ وہ گیٹ عبور کر گئی۔
صائم پھر کر محمود صاحب کے پاس آیا۔
''کیوں..... کیوں ہر بار وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے..... ہر بار مجھے ہی کیوں ٹھکراتی ہے۔''
''صائم!''
''لعنت ہے مجھ پر۔ جو اس جیسی لڑکی سے محبت کر بیٹھا تھا۔'' وہ خود کو کوستا، جلتا کڑھتا کمرے میں بند ہو گیا تھا۔
محمود صاحب کے پاس اس کے کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔
انہوں نے خاموشی سے سرخ گلابوں پر منڈلاتی سپید تتلی کو دیکھا۔
یہ سفر ہی لاحاصل تھا۔ وہ کبھی خوشبو نہیں چرا سکتی تھی۔

☆☆☆

کتنے عرصے کے بعد ماں کے ہاتھوں سر کو مالش نصیب ہوئی تھی۔ زیبی کے تھکے، ہانپتے اعصاب سکون پانے لگے۔ سب اس کے اچانک آنے پر حیران تھے مگر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید سب اسے اس کے حال پر چھوڑ چکے تھے۔ روشانے کی ڈیلیوری قریب تھی۔ اسے سہارا مل گیا۔ وہ سارا دن نور فاطمہ کے ساتھ لگی رہتی۔ دانیال نے بھی اس پر غصہ کرنے کے بجائے اگنور کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ماں باپ کے ساتھ والا کمرہ سیٹ کر لیا تھا۔
''تم نے جاب کیوں چھوڑی؟'' ثمینہ کو اس کے جاب چھوڑنے پر گہرا ملال تھا۔
اتنی محنت اس لیے تو نہیں کی تھی وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی۔
''ٹرانسفر کے چکروں میں بہت وقت ضائع ہوتا اور مجھے وہاں سے فوراً نکلنا تھا۔'' زوباریہ نے بند ہوتی آنکھوں سے جواب دیا۔
''فوراً کیوں نکلنا تھا؟'' ثمینہ ٹھٹھک گئیں۔
''وہاں سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا تا۔ اب اپلائی کروں گی۔''
''کوئی بات تو نہیں ہوئی نا۔'' کسی انجانے خدشے سے ثمینہ کا دل دھڑکا۔
''کیا بات ہوگی؟ بس آپ لوگوں کے پاس رہنا چاہتی تھی۔''
''ہمیشہ تو نہیں رہو گی۔'' ثمینہ نے بال سمیٹنے شروع کر دیے۔
''مجھے کہاں جانا ہے۔''
''زندگی بھر شادی نہیں کرو گی؟''
''مجھ سے کون کرے گا۔''
''ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ میں ہے، کہو تو صبح ہی بلا لیتی ہوں۔''
ماں تھیں، فوراً دل کی خواہش زبان پر آ گئی۔
''امی! کروں گی شادی..... پہلے وہ تو مجھے آزاد کر دے۔'' اس نے آخری جملہ دل ہی دل میں دہرایا۔ تب ہی نور فاطمہ اپنے کلرز اٹھا کر آ گئی۔ اسے زیبی خالہ سے ڈرائنگ بنوانی تھی۔ ثمینہ نے خوشی خوشی بال سمیٹ کر بینڈ چڑھا دیا۔ زوباریہ ان کی مرضی سے شادی پر تیار ہو گئی تھی۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا'' کا مفہوم شاید پہلی بار سمجھ میں آیا تھا۔ نہ راتوں کو نیند تھی، نہ دن کو چین۔ سیماب بولتی رہتی، وہ تھس سا اسے دیکھتا یا پھر چڑ کر کہہ دیتا۔

''تم لڑکیاں کتنا بولتی ہو یار!''

''کیا ہو گیا ہے، تمہیں تو میری باتیں ابھی سے بری لگنے لگی ہیں۔'' ایک دن سیماب چڑ گئی۔

''ایسی بات نہیں ہے مگر کبھی دوسروں کو بھی موقعہ دینا چاہیے۔'' وہ سیماب کے لہجے پر سنبھل گیا۔

''تو ٹھیک ہے تم بولو۔ میں سن رہی ہوں۔'' اس نے نوڈلز کا پیالہ اٹھایا اور کھانے میں مصروف ہو گئی۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی تو سیماب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا ہے، اب بول کیوں نہیں رہے۔''

صائم کو ہنسی آ گئی۔ اپنا پیالہ اٹھاتے ہوئے اس نے بات بدل دی۔

''تمہیں خاطر داری کے لیے یہ نوڈلز ہی ملتے ہیں۔''

''بوا گھر پر نہیں ہیں۔'' بوا اور ستارہ کچھ خریداری کے لیے مارکیٹ گئی تھیں کہ صائم آ گیا۔

''تو تمہیں کچھ بنانا نہیں آتا۔''

''آتا ہے نا۔''

''کیا؟''

''نوڈلز۔''

دونوں بے ساختہ ہنسے۔ کچھ بھی تھا سیماب کی باتیں اسے بہلا لیتی تھیں۔

''مطلب ہماری زندگی یوں گزرے گی۔ نوڈلز اور پزا کھا کر۔''

''نہیں۔ میں بوا کو جہیز میں لے کر آؤں گی۔''

''کیوں، میرے نانا کو بھگانا چاہ رہی ہو۔''

''نہیں بھاگیں گے۔ بوا کے ہاتھ کے کھانے نخرے تو کرتے ہیں مگر کھاتے شوق سے ہیں۔ تم بتاؤ، کہیں تمہاری مام کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔'' سیماب نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

ستارہ کو بھی تشویش ہو رہی تھی۔ کہاں تو فائقہ اتنی بے تاب تھیں کہ لگتا تھا ابھی انگوٹھی پہنا دیں گی اور کہاں ایک دو بار کال تو کی مگر منگنی کا ذکر تک نہ تھا۔

صائم نے پیالہ واپس رکھ دیا۔

کیسے کہتا کہ گھر میں ایک سرد جنگ جاری تھی۔

محمود صاحب نے صاف صاف کہہ دیا تھا، جب تک وہ سیماب کو خود ساری بات نہیں بتاتا، یہ منگنی نہیں ہو سکتی تھی۔ صائم نے فائقہ کو روکا تو وہ الگ ناراض ہو بیٹھیں۔ وہ آج آیا بھی اسی لیے تھا۔

''خود سوچو جب سیماب کو کسی تیسرے انسان سے ساری حقیقت کا پتا چلے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔ ابھی تو اسے لگتا ہے صرف زیبی نے دھوکا دیا ہے اور جب پتا چلے گا تم دونوں اس میں برابر کے شریک تھے تو وہ تم سے بھی بدگمان ہو جائے گی اور برخوردار! بدگمانی کبھی محبت کی موت بن جاتی ہے۔''

محمود صاحب کے کہنے پر صائم کا دل بے چین ہو گیا تھا۔

''لیکن میں کیسے بتا سکتا ہوں۔'' وہ شرارتی آنکھوں والی لڑکی اسے بہت عزیز تھی۔ وہ اسے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔

''اگر تم یہ کڑوا گھونٹ نہیں بھر سکتے تو ٹھیک ہے۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ پہلے ہی تمہیں اور زیبی کو دور رکھ کر

جو غلطی میں کر چکا ہوں، دوبارہ نہیں کروں گا۔" وہ ناراض ہونے لگے تھے۔
"پلیز نانا! آپ مت کیجیے گا، میں کوشش کروں گا۔"
اس نے فائقہ کو ابھی منگنی کے لیے منع کیا تھا، وہ الگ خفا تھیں۔
"لیکن اگر ان کا ارادہ بدل گیا ہوتا تو وہ مجھے گفٹس نہ بھجواتیں۔"
صائم سیماب کی آواز پر چونکا۔
"ممانے تمہیں گفٹس بھجوائے؟"
"ہوں۔ بہت سارے۔"
صائم رخ موڑ کر ناخن سے پیشانی کھرچنے لگا۔
"صائم! محبت کو پالینا اتنا آسان ہوتا ہے، ابھی تو میں نے تمہارے ساتھ کی خواہش ہی کی تھی کہ قدرت تمہیں مجھ سے ملانے کے اسباب پیدا کرنے لگی۔"
"اتنا آسان نہیں ہوتا سیماب! تم تو خوش قسمت ہو۔"
"تم بھی تو ہو۔" وہ ناز سے مسکائی۔
"ہاں، محبت ہم دونوں کا نصیب بنی۔"
(لیکن میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا)
صائم نے آخری جملہ دل میں سوچا تھا۔ اس کی سوچوں سے بے خبر وہ بس مسکراتی رہی۔
"سنو سیماب!" وہ فیصلہ کن انداز میں اس کی طرف جھکا۔
"اگر تمہیں یہ پتا چلے کہ میری زندگی میں تم سے پہلے بھی کوئی لڑکی تھی تو....."
سیماب نے چونک کر اسے دیکھا۔
وہ جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
(بے وقوف انسان مجھے جیلس کرنا چاہتا تھا)
"مسٹر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کون تھا۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پھر ہلکے سے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔
"تمہاری زندگی میں میرے بعد کوئی آئے، فرق اس سے پڑے گا۔"
صائم صم بکم اسے دیکھتا رہا۔
"پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہم پرانی زندگی ضرور شروع کرلیں۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ باتوں باتوں میں نوڈلز ختم کر چکی تھی۔ اس نے پیالہ میز پر رکھا۔ کشن گود میں، آلتی پالتی مار کر کشن پر ٹہنی جمائی۔ ایک ہتھیلی پر ٹھوڑی جما کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"میں ہمہ تن گوش ہوں۔ تم اپنے افیئرز مجھے سنا سکتے ہو۔ بٹ ویٹ آمنٹ۔ اس کے بعد تمہارے اندر اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ تم اپنی ہونے والی بیوی کے سابقہ افیئرز سن سکو۔ اسی تحمل اور اطمینان سے، جس سے میں سنوں گی۔"
ستارہ کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی اور بوا جی کے ہاتھ سے سارے شاپرز زمین بوس ہو گئے۔
"اللہ اللہ۔ سیماب گڑیا! کیا کیا بکتی جارہی ہیں آپ۔" بوا ہولا کر آگے ہوئیں۔
صائم اس ناگہانی پر ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔
"صائم بیٹا! یہ تو خواہ مخواہ اول فول بول جاتی ہیں۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری بٹیا تو بہت نیک پاک

اور پیاری روح ہیں۔ مجال ہے جو کسی غیر لڑکے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔''

''کیوں نہیں دیکھا۔'' سیماب مائل بہ شرارت ہوئی۔ ''لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہی ہوں، لڑکوں کے ساتھ آفس میں کام کرتی ہوں۔ آنکھیں بند کر کے تھوڑی بیٹھی رہتی ہوں۔''

بوا بے چاری ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھیں۔

''بٹیا خود اپنی لٹیا ڈبونے کو تیار تھیں وہ کیا کر سکتی تھیں۔''

ستارہ نے بیٹی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور صائم سے دعا سلام کرنے لگیں۔ بوا نے ہانپتے کانپتے شاپر جمع کیے، اندر جاتے جاتے صائم کے پاس رکیں۔

''ان کی باتوں کو دل پر نہ لینا۔ یہ تو بس کچھ بھی بولتی ہیں۔''

''جی۔'' صائم نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا اور ستارہ سے اجازت لینے لگا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ نے ناراض نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔

''اماں! مذاق کر رہی تھی۔''

''ایسے بے ہودہ مذاق کرنے کہاں سے سیکھے ہیں۔''

وہ چڑھ دوڑیں۔ سیماب نے دم سادھ لیا۔ ان کا غصہ اتنا ہی شدید تھا۔

☆☆☆

تاریک رات کچھ اور تاریک ہو گئی۔ گھور بادلوں نے اس رات کی ہیبت ناکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اپنے محفوظ کمرے میں سر تک کمبل تان کر بھی خوف تھا کہ دل میں پنجے گاڑے تھا۔ کتنے برس گزر گئے، بارش بھری رات آج بھی اس پر وحشت بن کر برستی تھی۔

ابھی بادل گرجے تھے۔

ابھی بجلی کڑکی تھی۔

اس نے کمبل کے اندر تکیے میں منہ چھپا لیا۔

آسمان نے دو دن سے قسم کھائی تھی، سانس لینے کو بھی نہیں رکے گا۔

شہر کے نالے ابل آئے، ریڈ الرٹ جاری تھا۔

لوگ غیر ضروری طور پر گھروں سے نہ نکلیں۔ زوبار یہ نے روشانے کی حالت کو دیکھتے ہوئے لاشعوری طور پر کچھ ضروری سامان منگوا کر گھر میں رکھ لیا تھا۔ دو دن سے بجلی غائب تھی۔ جنریٹر اور ایمرجنسی لائٹس جواب دینے لگی تھیں۔

''کیا بچپن میں بھی بارش ایسی ہی ہوتی تھی؟'' اس نے ذہن کو بھٹکانا چاہا۔

سوچ کی کشتی یادوں کے پانیوں میں ہلکورے کھانے لگی۔ جب وہ صائم کے ساتھ پانیوں میں کاغذ کی کشتیاں چلایا کرتی تھی۔

پھر لڑکپن کی بارشیں، جب لاشعوری طور پر محبت کی روپہلے رنگ قوس و قزح بن کر ان کے دلوں کو اپنی آغوش میں لینے لگے تھے۔

رات کی ہیبت ناکی کم ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگی۔

تب ہی کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا۔

زیبی نے کمبل اتار پھینکا۔ اس سرد موسم میں بھی وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔

باہر دانیال بھائی ایک تواتر سے اسے آوازیں دے رہے تھے۔

ان کی آواز کی گھبراہٹ.....
زیبی نے دوپٹہ اوڑھا اور ننگے پاؤں دروازہ کھولنے بھاگی۔
''زیبی.....روشانے.....''
زیبی ماؤف سی دانیال کو دیکھے گئی جس کے عقب میں بجلیاں چمکتی اور بادل گرج رہے تھے۔
نہیں.....وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ چکی تھی۔دانیال نے اسے بازو سے کھینچا اور کمرے میں جا پٹخا۔جہاں ساجدہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ثمینہ روئے جارہی تھی اور روشانے.....؟
اس کا پیلا چہرہ.....درد کی شدت سے نیلے پڑتے ہونٹ.....
''سارے رستے بند ہیں، میں کیا کروں؟'' دانیال پاگلوں کی طرح کبھی گاڑی کی طرف بھاگتے، کبھی روشانے کی ڈاکٹر کو کال کرتے۔جس کا فون بند مل رہا تھا۔
''زیبی.....'' روشانے نے امید کی طرح زیبی کو دیکھا۔
اس کی چیخ نے زیبی کو ہلا دیا۔اتنے سالوں میں کالے جادو کی طرح اس پر سایہ کیے خوف کو زوباریہ نے بے دردی سے جھٹکا۔بس یاد تھا تو روشانے کی تکلیف۔دانیال بھائی کی التجائیں۔ثمینہ اور ساجدہ کی دعائیں۔
سرمد اور زبیر کی بے قراریاں.....
وہ ڈاکٹر زوباریہ بن گئی۔
اور ڈاکٹر کو یوں ہی تو مسیحا نہیں کہا گیا تھا۔
وہ واقعی ان کے لیے مسیحا بن گئی۔
اللہ نے اسے چن لیا تھا۔
وہ اپنی غلطیاں سدھار چکی تھی۔
وہ ان کے دل جیت رہی تھی۔
وہ اپنے ماں باپ کی دعاؤں میں پھر سے زندہ ہوگئی تھی۔
اللہ نے اسے معاف کردیا تھا۔
فجر کے قریب.....جب بادل تھک گئے تھے.....بجلیاں دم سادھ گئی تھیں۔
فضا اللہ کے بابرکت نام سے آباد ہوگئی تھی۔
وہ سب زیبی کو گھیرے ہوئے تھے۔
کوئی گلے لگا رہا تھا۔کوئی ماتھا چوم رہا تھا تو کوئی ہاتھ.....
اور دانیال نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
''تم نے مجھے خرید لیا زیبی! مجھے ہر چیز کے لیے معاف کردو۔''
زیبی نے پرسکون ہوکر روشانے کو دیکھا اور اس کے ساتھ لیٹے عبدالہادی کو.....
''میری بیٹی میرا فخر ہے۔'' اس نے باپ کی بات کو سچ ثابت کردیا تھا۔

☆☆☆

بوا کی طبیعت موسم کی زد میں آکر خراب ہوگئی۔گویا گھر بھر کی مصیبت آگئی تھی۔اول تو وہ بیمار ہوتی نہ تھیں، اگر ہو جاتیں تو سب کا ناک میں دم کردیتی تھیں۔اور ڈاکٹر کے پاس جانا ہی عذاب لگتا، بس گھر میں جوشاندہ ابال ابال پیتی رہتیں۔
مگر جب بخار کے ساتھ کھانسی بھی رہنے لگی تو سیماب زبردستی انہیں ہسپتال لے آئی۔بدقسمتی سے ڈاکٹر

نے ٹیسٹ لکھ دیے۔
''سیماب! کیسی ہو تم؟'' یہ فضا تھی۔ زوباریہ کی کولیگ۔ سیماب کے ساتھ بھی ایک دو بار ملاقات ہوگئی تھی۔
''یہاں کیا کر رہی ہو، طبیعت ٹھیک ہے؟''
''میری تو ٹھیک ہے۔ مگر ہماری بوا جی بیمار ہیں۔'' سیماب زچ ہوگئی تھی۔ بوا جی نے نجانے کتنی بار پوچھ لیا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ کیوں کروائے ہیں، انہیں کوئی بڑی بیماری تو نہیں۔
''زوباریہ کیسی ہے؟ اس نے تو کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ جاب کر رہی ہے یا نہیں۔''
''اس نے واقعی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس لیے نہیں پتا جاب کر رہی ہے یا نہیں۔''
سیماب نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
''ہوسکتا ہے رخصتی ہوگئی ہو۔''
''نکاح ہوگا تب ہی رخصتی ہوگی نا۔'' سیماب نے کچھ دور بیٹھی بوا جی کو دیکھا جو رپورٹ آنے کے انتظار میں آیات پر آیات پڑھے جا رہی تھیں۔
''اس کا نکاح تو ہو چکا تھا۔''
سیماب نے چونک کر فضا کو دیکھا۔
''ایسا تو کچھ نہیں۔''
''اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ دراصل وہ مجھے اتنی پسند آئی تھی کہ میں اسے اپنی بھابھی بنانا چاہ رہی تھی۔ ہم بس رشتہ لے جانے ہی والے تھے کہ اس نے بتایا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔''
''جان چھڑانے کو کہہ دیا ہوگا۔''
''کیا مطلب؟''
''اسے تمہارا بھائی پسند نہیں ہوگا، اس لیے جھوٹ بول دیا۔''
''ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے بھائی اور فیملی میں کس بات کی کمی تھی، ویسے بھی اللہ کا شکر ہے اب میرے بھائی کی شادی ہوگئی ہے۔'' فضا برا منہ کر وہاں سے چلی گئی۔ سیماب الجھ سی گئی۔ زوباریہ نے جھوٹ کیوں بولا؟
اسی الجھن میں اس نے بوا کی رپورٹیں لیں۔ دیکھیں اور خاموشی سے پرس میں رکھ لیں۔
پورا راستہ بوا گپ چپ، دل ہی دل میں کانپتی ہولتی سیماب کی شکل دیکھتی رہیں۔
''بوا جی! ڈاکٹر نے کیا کہا۔'' سیماب پانی لینے کچن میں چلی گئی تھی۔ ستارہ کے پوچھتے ہی بوا نے پھپھک پھپھک کر رونا شروع کر دیا۔
''بہت بڑی بیماری ہے ستارہ بی بی! اتنی بڑی کہ سیمابی بی کی ہمت نہیں ہوئی مجھے کچھ بتانے کی۔''
''یا اللہ رحم۔'' ستارہ نے گھبرا کر سیماب کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ جو فریج میں گھسی کچھ کھانے کو ڈھونڈ رہی تھی، گھبرا کر باہر آئی۔
''کیا ہوا اماں؟''
''ڈاکٹر نے بوا کو کون سی بیماری بتائی ہے۔'' ستارہ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔
''موسمی بخار ہے۔''
''بٹیا! ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔ تم پریشان ہوگئی تھیں، مجھ سے رپوٹیں بھی چھپالیں۔ میں کون سا پڑھنا جانتی ہوں۔''

''افوہ بوا جی! کیا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے ملیریا یا ٹائیفائیڈ کا ٹیسٹ لیا تھا۔ نہیں نکلا۔ میڈیسن لیں، ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''گڑیا! ہم میں بڑی ہمت، بڑا حوصلہ ہے۔ کچھ بھی مت چھپاؤ۔ ڈاکٹر بلاوجہ ٹیسٹ نہیں لیتے۔''

سیماب نے جان چھڑائی تھی۔

بوا نئی سے نئی بیماریوں کے ڈانڈے اپنی کیفیت سے جوڑنے لگتیں۔

ستارہ نے تھک کر خود ہی رپورٹ دیکھنی شروع کر دی۔

تب تک سیماب بھی زچ ہوئی تھی۔

''دراصل بوا جی! میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی مگر آپ اصرار کر رہی ہیں تو بتا رہی ہوں۔ آپ کو.....'' اس نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔

بوا نے دل پر ہاتھ رکھا۔

''آپ کو کینسر ہے۔''

بوا کی آنکھیں ابل کر باہر آئیں۔ پھر وہ تیورا کر ستارہ کی گود میں گریں۔

''بوا بوا'' ستارہ اس ناگہانی پر گھبرا گئیں۔

''اب اٹھیں تو بتا دیجیے گا موسمی بخار ہے۔ پیناڈول سے اتر جائے گا۔'' وہ دوبارہ سے کچن میں جا گھسی۔

شام کو یہی قصہ محمود صاحب کے ساتھ انگور کھاتے مرچ مسالے کے ساتھ انہیں سنایا تو وہ ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے۔

''بہت اچھا کیا، اس عورت نے مجھے انتہائی بدمزا کھانے کھلائے ہیں۔''

''حد ہو گئی نانا! اس کی مروت کا یہ صلہ دے رہے ہیں۔'' وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ نکھرا ستھرا فریش چہرہ۔

سیماب نے اسے پہلی بار گرے شلوار قمیص میں دیکھا تھا۔ اس کی دراز قامت کچھ اور نمایاں ہو رہی تھی۔

سیماب نے نظریں چرالیں اور انار کے شربت سے بھرے جگ کو دیکھا۔

''پیو گے؟''

''ہاں، نکال دو۔'' صائم اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''آج ایک بہت عجیب بات ہوئی۔ مجھے پتا چلا ہے زوباریہ کا نکاح ہو چکا ہے۔'' سیماب نے گلاس صائم کو تھماتے بظاہر سرسری انداز میں بتایا تھا۔

مگر صائم کو گویا کرنٹ لگ گیا۔

گلاس ہاتھ سے چھوٹا اور کرچی کرچی ہو گیا۔

''کیا ہو گیا صائم!'' محمود صاحب نے بہت چونک کر اور الجھ کر صائم کو دیکھا۔

نکاح والی بات پر اس کا یہ ردعمل۔

''ہاتھ سے پھسل گیا۔'' صائم خود کو سنبھالنے کی کوشش میں بار بار ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

''لگ تو نہیں گیا۔'' سیماب نے تشویش سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''نہیں۔'' اس نے محمود صاحب سے نظریں چراتے ہاتھ چھڑایا۔

''لیکن حد تو یہ ہے کہ اس نے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔ پھر اس نے اپنی کولیگ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔''

سیماب اب بھی وہیں اٹکی تھی۔

''چھوڑو اس کے قصے کو۔'' محمود صاحب نے بات بدلنا چاہی۔ ''شام گہری ہو رہی ہے، اب تم گھر جاؤ۔''

''آپ بچپن سے ہی اتنے بے مروت تھے یا بوڑھے ہو کر ہو گئے ہیں۔'' وہ ناراض ہو کر اٹھی۔

''شاید بوڑھا ہو گیا ہوں۔'' وہ پہلی بار ناراض نہیں ہوئے تھے۔
''میں یہ برتن وغیرہ سمیٹ لوں۔''
''نہیں، ہم کرلیں گے۔'' صائم چاہتا تھا وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔
سیماب خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ محمود صاحب نے رخ صائم کی طرف کیا۔ وہ نیچے بیٹھ کر کرچیاں سمیٹنے لگا۔
''تمہیں کیا لگتا ہے، زوباریہ نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہوگا۔''
''اپنی کولیگ سے جان چھڑانے کے لیے۔''
''یہ بھی تو ممکن ہے، ان تین دنوں میں تم دونوں نے نکاح کرلیا ہو۔''
انگلی میں چبھنے والے کانچ سے کہیں گہری چبھن محمود صاحب کے لہجے میں تھی۔
قطرہ قطرہ خون ٹوٹے کانچ پر جمع ہونے لگا..... اور خون بہنا، تکلیف سہنا اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔
''تم نے مجھے کیوں نہ بتایا۔'' انہوں نے بیٹھے بیٹھے چھڑی کی نوک صائم کی گردن پر چبھوئی۔ لہجے میں بے تحاشا غم و غصہ تھا۔
''تم نے مجھے رتی رتی ہر بات بتائی تھی تو اتنی بڑی کیوں چھپائی۔''
''اس نکاح نامے کی اہمیت ہی کیا؟'' وہ زخمی انگلی کو مٹھی میں دبا کر کھڑا ہوا۔
''جو پرزے پرزے ہو گیا ہو اور جس پر زوباریہ کے آئی ڈی کا اندراج بھی نہ ہو۔''
''گواہان اور مولوی کے سامنے ایجاب و قبول ہوا تھا یا نہیں۔'' وہ دھاڑے۔
''ہوا تھا۔''
''میری نظروں سے دور ہو جاؤ لڑکے۔ میں تمہاری منحوس صورت دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔''
وہ اپنی منحوس صورت سمیت اندر غائب ہو گیا تھا۔ جلتے کڑھتے بڑبڑاتے محمود صاحب کی نظر کانچ پر جمے خون پر گئی۔
''آہ۔ انسان صرف اپنی ہی کی گئی غلطیوں کے ہاتھوں زخم کھاتا ہے۔''

☆☆☆

ثمینہ، ستارہ خالہ سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ ساجدہ عبدالہادی کی مالش میں مصروف تھیں بلکہ عبدالہادی کی کوئی بھی ذمہ داری روشانے کے سر نہیں تھی، سب مل جل کر سنبھال لیتے۔ روشانے مزے سے اپنی نیندیں پوری کرتی تھی۔
''تائی امی اور کیا منگوانا ہے۔'' زوباریہ لسٹ بنا رہی تھی۔ ''بادام، پستہ، کاجو۔''
''پھل، مکھانے، گوند، کمر کس.....'' ساجدہ نے اگلی چیزیں گنوائیں۔
''اب یہ کیا بلائیں ہیں۔'' زوباریہ لکھتے لکھتے ہی اٹک گئی کہ کمر کس ''ک'' سے ہے یا ''ق'' سے۔ ''ان کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔''
''اب ہر بات تمہاری میڈیکل سائنس تو نہیں بتا سکتی۔ بزرگوں کا تجربہ بھی کوئی معنی رکھتا ہے، کچھ ٹوٹکے سینہ بہ سینہ بھی منتقل ہوتے ہیں۔ تم آج کی لڑکیاں یہ ساری چیزیں کھاتی نہیں ہو۔ پھر ساری زندگی کمر درد تو کبھی پنڈلیوں میں درد..... پھر شروع کروا دینا۔ کیلشیم پیو، وٹامن ڈی لو۔''
ان کی تقریر سنتے سنتے زوباریہ کو ہنسی آنے لگی۔
بوا جی شدت سے یاد آئی تھیں۔
''یہ ان چیزوں کے حصول کا قدرتی ذریعہ ہیں۔'' وہ مزید بھی اس کی معلومات میں اضافہ کرتیں، مگر ثمینہ

نے پکار لیا۔
''زیبی! تمہاری خالہ بات کرنا چاہ رہی ہیں۔''
زیبی نے کاغذ پین رکھا اور آ کر ریسیور تھام کر سلام کیا۔
ابتدائی سلام دعا کے بعد ستارہ فوراً ہی اصل مدعے پر آ گئیں۔
''زیبی! تمہاری صائم سے کوئی بات ہوئی ہے۔''
''نہیں خالہ! کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' زوباریہ لاشعوری طور پر ثمینہ سے دور ہٹی۔
''سیماب بتا رہی تھی، تم جانے سے پہلے محمود صاحب سے ملنے گئی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا۔'' ان کے لہجے میں مایوسی چھا گئی۔
''آپ بتائیں، سیماب کی منگنی ہو گئی۔ اس نے تو مجھے اپنی تصویریں بھی نہیں بھیجیں۔'' زوباریہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔
''نہیں بیٹا! یہی تو پریشانی ہے۔ ان لوگوں نے بالکل ہی چپ سادھ لی ہے۔ ہم تو بیٹی والے ہیں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ سیماب ظاہر تو نہیں کرتی، مگر میں جانتی ہوں، اندر سے وہ بھی ڈسٹرب ہے۔''
زوباریہ خاموش ہی رہی۔ اب کہتی بھی تو کیا؟
مگر ذہن ٹھٹک سا گیا تھا۔ آخر صائم کے ذہن میں کیا چل رہا تھا؟
''بس میں جلد از جلد سیماب کی شادی کرنا چاہتی ہوں زوباریہ!''
''آپ فکر نہ کریں خالہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
اس نے تسلی دے کر ریسیور رکھا۔
''کیا ہوا؟'' ثمینہ نے اس کے چہرے پر در آئی الجھن کو محسوس کر لیا تھا۔
''کچھ نہیں۔'' زوباریہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ ساجدہ اس سے سامان کی لسٹ بنوا رہی تھیں۔
صائم کیا کر رہا ہے؟ کیا اب بھی میری طرف سے کسی آس میں ہے؟
سیماب کیا سوچتی ہو گی؟ بلکہ وہ تو یہی سمجھتی ہو گی کہ صائم میرے کہنے پر.....
نہیں..... مجھے ہر صورت صائم کی آس توڑنی ہے۔
''زوباریہ! یہ تمہارے نام ہے۔'' ثمینہ نے آ کر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔
کسی پرائیوٹ ہاسپٹل کی طرف سے انٹرویو کی کال تھی۔
''چلو شکر ہے، تمہارے ابو کو بہت تشویش تھی۔ بیٹی اتنا پڑھ لکھ کر گھر بیٹھی ہے۔'' ثمینہ مسکرائیں۔
''جی امی! مجھے امید ہے، یہاں بات بن جائے گی۔''
''اچھی بات ہے۔ میں تو چاہتی ہوں اب تم شادی کے بارے میں بھی سوچ لیتیں۔'' وہ مدھم لہجے میں دل کی بات زبان پر لے آئیں۔
''وہ جو رشتہ آیا تھا اس کو آپ نے کیا کہا؟''
''کچھ بھی نہیں۔ وہ تو منتظر ہیں۔''
''ابو سے پوچھ لیں اگر وہ بھی مطمئن ہیں تو ہاں کہہ دیں۔'' زوباریہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔
یہی وہ چیز تھی جو صائم کو کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے پر مجبور کرتی۔ ثمینہ کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا انہوں نے فوراً لڑکے والوں کو چائے پر بلا لیا۔

☆☆☆

''کنفیوز ہو۔'' روشانے نے بہت پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ہلکے پھلکے میک اپ، بہترین تراش خراش کے لباس میں ملبوس وہ کتنی پیاری معصوم اور ڈیسنٹ لگ رہی تھی۔ آج زوباریہ شعوری طور پر ہر چیز کا خیال رکھ رہی تھی۔ نارمل حالات ہوتے تو شاید یوں ہی اٹھ کر لڑکے والوں کے سامنے آجاتی۔

''نہیں، نارمل ہوں۔''

''لپ اسٹک لگالو۔''

''نہیں۔ سیماب کہتی ہے لپ اسٹک لگانے سے پتا چل جاتا ہے کہ میک اپ کیا ہے؟'' زوباریہ ہنسی۔

اس کی ہنسی کی آواز نے ثمینہ کا دل اطمینان سے بھر دیا۔

''اب سیماب کی بھی شادی ہو جانی چاہیے۔'' روشانے خود لپ اسٹک لگانے لگی تھی۔

''اسی کے لیے تو سارے جتن کر رہی ہوں۔'' زوباریہ بڑبڑائی۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔'' زوباریہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ گئی تھی۔

''مہمان آگئے ہیں بیٹا۔ لڑکا بھی ساتھ ہے۔'' ثمینہ نے بتایا۔

''لڑکا کیوں آیا ہے؟'' روشانے نے اعتراض کیا۔

''تمہارے ابو کا خیال ہے، دونوں پڑھے لکھے میچورڈ ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو اچھا ہے۔'' ثمینہ نے مدھم لہجے میں بتایا۔

گویا سارے اختیار ہاتھ میں آجاتے ہیں، جب آپ کا وقت آتا ہے۔

زوباریہ نے دل گرفتی سے سوچا۔

''کاش اس وقت کا انتظار کر لیا ہوتا۔''

ڈرائنگ روم میں ڈرائی فروٹ اور جوس کا دور چل رہا تھا۔

خوش گوار ماحول، مدھم گفتگو.....

لڑکا اور دانیال باتوں میں مصروف۔ سب کی نظروں میں لڑکے کے لیے ستائش تھی۔ پڑھا لکھا، ڈیسنٹ.....خوب صورت اور جاذب پرسنالٹی۔

''چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔'' ساجدہ نے دل ہی دل میں یہ رشتہ قائم ہو جانے کی دعا کی تھی۔

تب ہی زوباریہ سرمد نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔

ساتھ ہی لڑکے نے گردن موڑ کر دیکھا۔

جہاں زوباریہ کے قدم رنجیر ہوئے۔

وہیں شہیر بے اختیار کھڑا ہوا۔

''تم.....''

زوباریہ نے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس کیا۔

''ارے.....تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو۔'' شہیر کی امی نے حیرت سے دریافت کیا۔

''مما.....یہ صائم کی گرل فرینڈ ہے۔ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ چکی ہے۔''

☆☆

(ان شاء اللہ آخری قسط آئندہ ماہ)

ناولٹ

حمیرا شفیع

کنگن

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی ۔ وہ تشویش بھری نظروں سے سامنے چارپائی پر بے سدھ لیٹے اپنے بیمار اور نڈھال شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ اگرچہ اسے دوا پلائے ہوئے بھی کافی دیر ہو چکی تھی مگر نہ اس کے بخار میں کمی آئی تھی اور نہ ہی اس کی سانسیں ہموار ہوئی تھیں۔

سرخ و سفید چہرہ کملا کر زردی مائل ہو چکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کی گلابی رنگت سیاہی مائل جامنی ہو چکی تھی۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا تھا اور وقفے وقفے سے کراہ رہا تھا۔ جیسے کہ اس کا پورا بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا مگر وہ سوائے بے بسی سے اپنے ہاتھ ملنے کے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے اپنے ململ کے دوپٹے کو اتار کر ہاتھ پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ پھر اس کا گولا سا بنا کر ہولے ہولے اس کے دونوں ہاتھوں اور پاؤں کا مساج کرنے لگی۔ یہ اس کی ماں کا آزمودہ ٹوٹکا تھا۔ جب بچپن میں وہ یا اس کے بہن بھائیوں میں سے کوئی بیمار ہوتا تھا تو اس کی ماں یونہی ان کا مساج کیا کرتی تھیں جس سے بہت جلد درد کم ہو جاتا تھا اور بے چینی بھی ختم ہو جاتی تھی۔

وہ بھی نہایت نرمی سے اس کے ہاتھ پاؤں سہلا رہی تھی۔ وہ لگی رہی یہاں تک کہ اس کے اپنے بازو بھی تھکن سے شل ہونے لگے۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لے ہی آئی۔ مریض کے منہ سے نکلنے والی کراہیں کم ہوتے ہوئے بالکل معدوم ہو گئیں۔

''پانی!'' پھر ایک لفظ سسکاری کی صورت اس کے لبوں سے نکلا ہوا۔

اس نے جلدی سے پاس پڑے واٹر کولر سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کا سر اونچا کر کے احتیاط سے پلانے لگی۔ پانی پی کر وہ مزید پرسکون ہو گیا۔ اس نے اس کا تکیہ درست کیا اور خود تھوڑی دیر کے لیے اپنی کمر سیدھی کرنے کی خاطر ساتھ پڑی چارپائی پر لیٹنے ہی والی تھی کہ دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ماحول کی خاموشی کو یکدم چیر کر رکھ دیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔

مرکزی عمارت سے بہت دور گھر کا یہ پچھلا اجاڑ اور ویران سا احاطہ جہاں وہ کئی دن سے اپنے بیمار شوہر کے ساتھ مقیم تھی۔ چھوٹی چھوٹی سی چار دیواری۔ لکڑی کا خستہ حال دروازہ اور گھور تاریکی، بجلی بند تھی اور منڈیر سے جھانکتا ہوا چاند بھی کب کا غائب ہو چکا تھا۔

وہ سہم کر دوبارہ اپنے شوہر کی چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے پائنتی کو مضبوط سے تھام لیا اور پھر اپنا سر ان پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''پلاسٹک کے برتن لے لو جی..... پلاسٹک کے برتن..... نئے نئے ڈیزائن والے برتن لے لو جی! پلاسٹک کے برتن لے لو جی..... پلیٹیں، پیالیاں، ڈونگے اور چمچ لے لو جی.....

پلاسٹک کے برتن والا آ گیا جی پلاسٹک کے برتن لے لو جی.....''

وہ پلاسٹک کے برتنوں اور دیگر ساز و سامان سے لدی پھندی ریڑھی کو نہایت احتیاط سے دھکیلتا ہوا ایک لمبی پتلی سی گلی میں سے گزرتا ہوا جا رہا تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا مگر حالیہ ہونے والی بارشوں نے نا صرف دھوپ کی تمازت کو کم کر دیا تھا بلکہ وقفے وقفے سے آنے والے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا موڈ بھی آج بہت خوش گوار تھا کیونکہ صبح سے اس کے کافی زیادہ برتن بک چکے تھے۔

اس علاقے میں زیادہ تر کم آمدنی رکھنے والے لوگ رہائش پذیر تھے جو پلاسٹک اور شیشے کے مہنگے برتن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اس

لیے یہاں اس کے برتنوں کی بڑی مانگ تھی۔ جو اگرچہ کچھ ہلکی کوالٹی کے تھے مگر سستے اور روز مرہ استعمال کے لیے نہایت مناسب تھے۔

برتنوں کے علاوہ اس کی ریڑھی پر عورتوں کے عام استعمال کا سامان مثلاً شیشے، کنگھے، سرمہ دانی، پراندے اور نیل پالش وغیرہ بھی موجود تھیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے بچوں کے سستے سستے سے کھلونے بھی ایک طرف رکھے تھے۔ مگر آواز وہ صرف برتنوں کی ہی لگاتا تھا کیونکہ اس کے گاہکوں کی اکثریت از خود پہچانتی تھی کہ اس کے پاس نیاری کا دوسرا سامان بھی موجود ہے۔ اس لیے وہ عورتوں، بچوں اور لڑکیوں میں یکساں مقبول تھا۔

جب وہ سنبھل سنبھل کر ریڑھی کو آگے بڑھاتا ہوا گلی میں داخل ہوا تو کونے والے گھر کے نیلے دروازے سے ایک پختہ عمر کی عورت برآمد ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولی۔

''ارے بھائی! پلاسٹک کی چھوٹی کٹوریاں ہیں..... ذرا دکھانا.....''

''ہاں جی آپا! پلاسٹک کی کٹوریاں ہیں.....''

اس نے بزرگ ٹائپ خاتون کو بھی دانستہ ''آپا'' کہا کیونکہ اس معاملے میں اس کا سابقہ تجربہ بہت تلخ تھا۔ وہ کئی بار اچھی خاصی عمر رسیدہ عورتوں کو اماں کہنے پر جھاڑ کھا چکا تھا۔ اس لیے اب خاصا محتاط رہتا تھا۔

اس نے پھرتی سے مختلف ڈبوں سے پلاسٹک کی کٹوریاں نکال نکال کر دکھانی شروع کیں۔ عورت نے کافی دیر الٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک ہی رنگ وڈیزائن کی چھ کٹوریاں پسند کیں اور بھاؤ تاؤ کروانے لگی۔

اتنے میں اسی گھر سے ایک چار پانچ سال کا بچہ بھاگتا ہوا باہر نکلا اور ریڑھی کے پاس آکر بولا۔

''دادو..... مجھے بھی بیٹ بال لے دو۔''

وہ ریڑھی کے دوسری جانب لٹکتے چھوٹے سے بیٹ بال کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عورت نے کچھ دیر تک پس وپیش کی پھر بچے سے بولی۔

''اچھا گڈو! بھائی یہ بیٹ بال نکالنا۔ اور تم اپنی اماں سے کہو کہ وہ میرا بٹوہ ڈھونڈ کر لادے۔''

وہ بیٹ بال نکالتا ہوا سخت بدمزہ ہوا۔ ایک تو پہلے بھاؤ تاؤ کرنے میں اتنی دیر لگا دی تھی۔ اب بٹوہ آنے میں نجانے کتنا وقت ضائع ہونا تھا۔

بچہ پیغام پہنچا کر الٹے قدموں واپس آیا اور اس کے ہاتھ سے بیٹ بال لے کر وہیں کھیلنے لگا۔ وہ نظریں جھکائے انتظار کر رہا تھا جب اس کے کانوں سے ایک مہین سی نسوانی آواز ٹکرائی۔

''یہ لو اماں اپنا بٹوہ.....''

اس نے غیر ارادی طور پر نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے سے ایک نسوانی ہاتھ کلائی تک باہر تھا جس میں سیاہ رنگ کا بٹوا دبا ہوا تھا۔

صرف ایک دو پل کی بات تھی۔ اس نے دیکھا اور پھر اپنی نظریں ہٹانا ہی بھول گیا۔ بے تحاشا خوب صورت نسوانی ہاتھ..... جلد ایسی صاف شفاف کہ نیلی نیلی سی رگیں صاف نظر آرہی تھیں۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں، ہلکے گلابی مائل تراشیدہ ناخن جو نجانے کسی نیل پالش سے رنگے تھے یا پھر ان کا قدرتی رنگ ہی اتنا خوب صورت تھا۔

سب سے بڑھ کر بے تحاشہ گوری، سڈول کلائی میں اٹکا ہوا ایک کنگن جو ننھے ننھے سرخ اور سبز رنگوں سے مزین تھا۔ ایک عجب بہار دکھا رہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کمال اس کنگن کا نہ تھا بلکہ اس ہاتھ اور کلائی کا تھا جس میں وہ اس قدر رچ رہا تھا۔

عورت نے وہ بٹوہ تھاما..... ہاتھ غڑاپ سے اندر غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ماحول کا سارا فسوں ٹوٹ گیا۔ اس نے چور نظروں سے اس عورت کے چہرے کی جانب دیکھا کہ کہیں اس نے اس کی محویت کو نوٹ نہ کر لیا ہو مگر اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ تھا۔

اس نے پیسے اسے گن کر پکڑائے تو اس نے عجلت میں پیسے جیب میں ٹھونسے۔ اپنے رومال سے

ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا اور تیزی سے ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

یہ جو لاشعوری طور پر اس سے حرکت سرزد ہوئی تھی تو وہ دل ہی دل میں اس پر سخت خجالت محسوس کر رہا تھا۔ وہ کوئی نظر باز قسم کا چھچھورا مرد نہیں تھا جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تاڑتے ہیں۔

اگرچہ اس کے گاہکوں کی اکثریت عورتوں پر ہی مشتمل ـــــ تھی وہ اپنی نظریں قابو میں ہی رکھتا تھا۔ نجانے آج کیسے چوک ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر خود کو لتاڑ رہا تھا۔ ڈپٹ رہا تھا مگر نجانے کیا بات تھی کہ وہ ہاتھ وہ منظر ذہن سے محو ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

تھک ہار کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اس گلی میں جائے گا ہی نہیں۔

☆☆☆

اس کا نام شادی خان تھا۔ اس عجیب و غریب نام کا پس منظر بھی کچھ عجیب و غریب سا تھا۔ دراصل جب وہ پیدا ہونے والا تھا تو اچانک ایک دن اس کے دادا دوسری دادی بیاہ لائے۔ پہلی دادی کو فوت ہوئے ابھی صرف تین ہی ماہ ہوئے تھے۔ اس کے خاندان میں یہ ہرگز بھی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ دادا کی تو مجبوری تھی کیونکہ پہلی دادی مر چکی تھیں جبکہ خاندان کے اکثر مرد تو زندہ بیوی کے موجود ہوتے ہوئے بھی بڑے دھڑلے سے دوسری اور تیسری شادی تک رچا لیتے تھے۔ اس کے باپ اور چچاؤں نے برا مانے بغیر خوش دلی سے نئی ماں کا استقبال کیا۔

وسیع و عریض صحن میں خاندان بھر کے تمام افراد جمع تھے۔ اس کا زندہ دل باپ اور چچا خاندانی روایت کے مطابق نئے نویلے جوڑے (دادا اور دادی) پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔

اس کی ماں پورے دنوں سے تھی مگر وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی حالت کو یکسر بھلائے دوسری عورتوں کے ساتھ پیسے لوٹنے لگی۔ لال رنگ کا ایک نوٹ اچکتے اچکتے اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے گر پڑی۔

تھوڑی دیر بعد خاندانی دائی کے ہاتھوں اس کی پیدائش ہوئی۔ وہ چونکہ عین اپنے دادا کی شادی کے موقع پر پیدا ہوا تھا۔ اس حوالے سے اس کا نام ''شادی خان'' تجویز کیا گیا۔

ویسے بھی اس کے خاندان میں بچوں کے نام کسی بھی واقعہ سے متاثر ہو کر رکھ دیے جاتے تھے۔ پھر چاہے وہ نام لوگوں کی تفریح طبع کا باعث بنے یا بچے کو ساری عمر کے لیے جگ ہنسائی کا سامنا کرنا پڑے والدین کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھی بہت چھوٹا سا تھا جب بچے اسے چھیڑتے۔

''شادی خان! بتا تیری شادی کب ہوگی.....؟''

وہ بھاگا بھاگا اپنی ماں کے پاس آتا۔

''اماں! میری شادی کب ہوگی.....؟''

ماں خود سے لپٹا کر اس کا سر منہ چوم لیتی۔

''میرے چاند! تو تھوڑا بڑا تو ہو جا پھر میں تیرے لیے چاند سی دلہن لاؤں گی۔''

یوں چاند سی دلہن کی خواہش عام لڑکوں کی نسبت بہت چھوٹی سی عمر میں ہی اس کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔

☆☆☆

اس کا باپ ایک موٹر مکینک تھا۔ پانچ بھائیوں اور تین بہنوں سمیت ان کا ایک بھرا پُرا خاندان تھا۔ اس کا نمبر آخری تھا۔ اس لیے وہ گھر بھر کا لاڈلا بچہ تھا۔

اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ دو چار جماعتیں پڑھ لے۔ اس لیے جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو ایک دن اس کی ماں نے اسے اچھی طرح سے نہلایا دھلایا۔ صاف کپڑے پہنائے۔ آنکھوں میں بھر بھر کر سلائیاں سرمہ ڈالا نظر بد سے بچانے کے لیے ماتھے پر بڑا سا ٹیکا لگایا اور پھر ابا گود میں اٹھا کر گھر کے پاس پرائمری اسکول میں داخل کروا آئے۔

پہلے ایک دو دن تو وہ ڈرا سہما سا بیٹھا رہا۔ اسکول کے دو دروازے تھے اور چوکیدار جیسے

کسی بھی شخص کا وجود ندارد تھا۔ ڈھیر سارے بچوں کے لیے صرف تین استاد تھے جن میں سے ایک تو ہمیشہ غائب رہا کرتا تھا۔

چند دن تو ابا نے اسے اسکول چھوڑا پھر انہوں نے صبح سویرے کام پر جانا ہوتا تھا تو اماں کی ڈیوٹی لگادی۔ اماں بے چاری ایک دروازے سے اسے اسکول کے اندر داخل کرکے آتی تو وہ دوسرے دروازے سے نکل کر اس کے گھر آنے سے پہلے گھر میں موجود ہوتا۔ وہ پھر چھوڑ کر آتیں یہ پھر آجاتا۔ یا پھر بستہ ادھر ادھر پھینک کر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگ جاتا۔ کئی دفعہ اماں ابا نے خوب پٹائی کی مگر وہ اسکول میں ٹک کر نہ بیٹھا۔ پھر اپنے بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ چوتھی کلاس کے بعد بالکل ہی بھاگ گیا۔

پڑھائی سے مایوس ہونے کے بعد ابا نے اسے کوئی کام دھندا سکھانے کی کوشش شروع کردی۔ پہلے اسے ایک بھائی کے سپرد کیا جو دہی بڑوں کی ریڑھی لگاتا تھا۔ چند دن بعد اس نے بھی ابا کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ دیے کہ اس کو مزید ساتھ رکھنا اس کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا تھا کیونکہ وہ آدھے سے زیادہ کھانے پینے کا سامان چٹ کر جاتا تھا۔

پھر ابا نے اسے ایک ہوٹل والے کے پاس رکھوا دیا۔ وہاں بھی اس نے ان کے اتنے برتن توڑے کہ انہوں نے بھی جواب دے دیا۔ تھک ہار کر ابا اسے اپنے ساتھ ورکشاپ لے جانے لگے۔ یہاں بھی اتنی مغز ماری کے باوجود وہ ایک سائیکل کو پنکچر تک نہ لگانا سیکھ سکا۔ الٹا منہ سر کالا کرکے جوں کا توں گھر واپس آجاتا۔

ابا اپنا سر پکڑے اس کی طرف سے بالکل مایوس بیٹھے تھے جب اس کے ایک چچا نے پیشکش کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کام پر لے جایا کرے گا۔ اس کا وہ چچا ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن بیچا کرتا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ جانے لگا۔ اس کام میں اسے مزہ آنے لگا کیونکہ کام تو کوئی خاص تھا ہی نہیں۔ صرف گلی گلی گھوم کر چچا کے ساتھ آواز لگانی تھی۔ کیونکہ باقی سب کچھ تو چچا خود سنبھالتا تھا۔ ویسے بھی اس کا وہ چچا بہت نرم خو تھا اور اس سے بہت پیار کرتا تھا۔

اس لیے یہاں وہ ٹک گیا تو اماں ابا نے بھی سکون کا سانس لیا۔ آہستہ آہستہ شوق اور دلچسپی پیدا ہوتی گئی تو وہ کام بھی سیکھتا گیا۔ برتن رکھنا، سنبھالنا، پیک کرنا اور عورتوں سے بھاؤ تاؤ کرنا وغیرہ۔

کام بڑھ گیا تو چچا نے اپنی چھوٹی سی پلاسٹک کے برتنوں کی دکان کھول لی اور ابا نے وہ ریڑھی چچا سے خرید کر اسے دے دی۔ یوں وہ پچھلے چند سالوں سے ریڑھی پر پلاسٹک کے برتن بیچ رہا تھا اور خاصا کامیاب بھی تھا۔

☆☆☆

ایک شام وہ تھکا ہارا گھر لوٹا تو گھر میں عجیب چہل پہل کا سماں تھا۔ اس کی بہن گل جاناں شرمائی شرمائی دوپٹے کا ایک کونہ دانتوں تلے دبائے پھرتی سے کام نمٹاتی پھر رہی تھی۔ گھر بھی معمول سے کہیں زیادہ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ اس کے استفسار پر اماں نے بتایا کہ کل اس کے خالہ اور خالو اپنے بیٹے کے لیے گل جاناں کا رشتہ مانگنے آرہے تھے۔ اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔

میکے کے نام پر اس کی ماں کی صرف ایک ہی بہن تھی جو لاہور کے پاس ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔ کراچی سے لاہور تک کے طویل سفر کی وجہ سے آنا جانا بہت محدود تھا۔ خالہ اپنی گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے بہت کم آپاتی تھی۔ دوسری طرف اس کی ماں اپنے گھٹنوں کے درد کی وجہ سے طویل سفر نہیں کرسکتی تھیں۔ شادی خان کو دھندلا دھندلا سا یاد تھا کہ وہ آخری مرتبہ اپنی اماں کے ہمراہ خالہ کے سسر کی وفات پر ہی ان کے ہاں گیا تھا۔ ہاں البتہ ٹیلی فون پر رابطہ بحال رہتا تھا۔

اب اتنے عرصے بعد وہ آرہی تھیں تو اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے تمام بھائیوں کو علیحدہ بلا کر خصوصی ہدایت دیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ

مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ خالو کچھ اکھڑ مزاج کے حامل تھے دوسری طرف ان کے ابا بھی ٹیڑھی کھیر واقع ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بھائی کوشش کریں کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوجائے جو دونوں کی طبع نازک پر گراں گزرے۔ اگلے دن وہ کام سے جلدی لوٹ آیا۔ شام کو خالہ خالو پہنچ گئے۔ خالہ بہت خوش مزاج اور ملنسار تھیں۔ ایک ایک سے گلے ملیں؛ خالو بھی بس ٹھیک ٹھاک ہی تھے۔

طویل سفر کی وجہ سے تھکن زیادہ تھی اس لیے ایک دن تو انہوں نے آرام میں گزارا۔ پھر باہمی صلاح مشورہ سے طے پایا کہ اس جمعہ کو گل جاناں اور ان کے بیٹے کی باقاعدہ منگنی کی چھوٹی سی تقریب منعقد کرلی جائے۔ طویل سفر کی وجہ سے دونوں خاندانوں کے لیے بار بار آنا جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ اب وہ لوگ رسم کرجائیں اور چند دن بعد یہ لوگ جاکر رسم کرآئیں۔

اس کی ماں اور خالہ دونوں خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں کیونکہ ان کا رشتہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہونے جارہا تھا۔ دونوں کے لیے ایک طرح سے یہ ان کے میکے کا دوبارہ زندہ ہونا تھا۔

اماں نے نہایت پُرتکلف کھانا تیار کیا۔ بکرے کے گوشت کا آلو شوربہ۔ زردہ چاول اور میوے والی کھیر۔ وہ سب بڑے کمرے میں موجود تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔

اماں اور خالہ اپنے قصے کہانیوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ سب بھائی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ابا اور خالو نہایت انہماک سے ٹی وی پر نشر ہونے والا ایک سیاسی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ دونوں کو ملکی سیاست کی کوئی خاص سمجھ بوجھ نہ تھی مگر دلچسپی حد سے بڑھ کر تھی۔ شومئی قسمت سے دونوں دو مختلف سیاسی پارٹیوں کے حامی تھے اور اس وقت پروگرام میں دونوں پارٹیوں کے نمائندہ حضرات کو اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس لیے دونوں بھرپور توجہ سے ہونے والی گفتگو ملاحظہ فرمارہے تھے۔ گفتگو کیا تھی۔ ایک دوسرے پر طنز کے تیر برسائے جارہے تھے۔ الزامات کی بوچھاڑ ہورہی تھی۔ ایک دوسرے کے کردار پر کیچڑ اچھالی جارہی تھی۔ میزبان دونوں فریقین کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہورہا تھا۔ اچانک پروگرام میں شامل ایک حضرت نے مخالف پارٹی لیڈر کے بارے میں ایک نازیبا بات کہہ دی۔ پھر کیا تھا مخالف پارٹی سے تعلق رکھنے والے حضرات کا تو جو ردعمل ہونا ـــــ تھا۔ پروگرام دیکھتے ان کے ابا کے تن بدن میں آگ لگ گئی بے ساختہ ان کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔

خالو تو ابا کا یہ روپ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ تو ان کے منہ پر ہی ان کے پارٹی لیڈر کو گالیاں بک رہے تھے۔ انہوں نے بھی تنک آکر ان کے پارٹی لیڈر کی شان میں دوچار گستاخانہ جملے بول دیے۔ پہل حالانکہ ابا کی جانب سے ہوئی تھی مگر وہ تو بالکل ہی آؤٹ ہوگئے۔ اب ایک لڑائی ٹی وی میں ہورہی تھی تو دوسری ان کے گھر میں شروع ہونے جارہی تھی۔

سب سے پہلے شادی خان کو ہی حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے فوراً ٹی وی بند کردیا مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ابا اور خالو بری طرح سے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ سب دم بخود تھے۔ ابا نے تو گھر آئے مہمان کی عزت کا پاس بھی نہ کیا۔ خالو کون سا کم تھے۔ انہوں نے بھی بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔ بات بحث ومباحثے سے نکل کر گالی گلوچ اور پھر ہاتھا پائی تک جارہی تھی کہ سب بھائیوں نے پکڑ ـــ کر ابا کو بیٹھک میں لے جاکر بٹھادیا۔ خالو تو ایک منٹ وہاں رکنے کو تیار نہ تھے فوراً خالہ کو واپسی کا آرڈر دے دیا۔ خالہ اور اماں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں جوڑے۔ ان سب بھائیوں نے ابا کی طرف سے معافی مانگی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اپنا بکسہ اٹھایا اور خالہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ اب کہاں کی منگنی اور کہاں کی تقریب۔ وہ تو جاتے جاتے مرنا جینا ہر قسم کا تعلق ختم کرگئے۔ اماں تو

روتی پیٹتی رہ گئیں مگر آناً فاناً سب ختم ہوگیا۔

ہمارے معاشرے کا یہی المیہ ہے کہ لوگ اپنی اپنی سیاسی پارٹی اور لیڈروں سے اس قدر جذباتی طور پر وابستہ ہوجاتے ہیں کہ اپنے خونی رشتوں تک کو ان پر قربان کردیتے ہیں۔ بلاوجہ آپس میں رنجشیں پال لیتے ہیں۔ اور وہی لیڈر اقتدار میں آکر ان کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔ اور یہ ان کے کھوکھلے وعدوں سے دل بہلاتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

خالہ سے تعلق ٹوٹنے کا غم سب سے زیادہ اماں اور گل جاناں نے منایا۔ کئی دن تک متورم آنکھوں کے ساتھ مرجھائی مرجھائی پھرتی رہیں۔ پھر رفتہ رفتہ دلوں کو قرار آگیا۔ اب اس کے تمام بھائی برسرروزگار تھے، گھر میں خوشحالی تھی۔ ابا نے ایک ایک کرکے سب کی شادیاں کرنا شروع کردیں۔ ایک اچھی جگہ دیکھ کر گل جاناں کی بھی بات طے کردی۔

اب فقط وہی بچا تھا۔ اماں جب اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑتیں تو بے ساختہ اس کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اچانک تصور میں ایک بے تحاشا خوب صورت نسوانی ہاتھ لہرا جاتا اور وہ خوابوں خیالوں کی وادی میں دور کہیں نکل جاتا جہاں ایسی ہی شہابی رنگ وروپ والی کوئی پری وش اس کی منتظر ہوتی۔ اور وہ اس کا نازک سا ہاتھ تھامے امنگوں اور خواہشات سے بھری شاہراہ پر دھیرے دھیرے اس کے سنگ قدم بدقدم بڑھے چلا جاتا۔ پھر وہ دونوں ایک ایسی وادی میں جا بستے جہاں ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی۔ اماں اس کی کھوئی کھوئی کیفیت کو بھانپ کر مسکراتیں اور پھر اس کا کان مروڑتے ہوئے کہتیں۔

''تو فکر نہ کر، میں تیرے لیے ان شاء اللہ چاند سی دلہن ہی لاؤں گی۔''

وہ شرما کر سر جھکا لیتا۔ کبھی کبھی عجیب وسوسے اسے تنگ کرتے۔ وہ سوچتا نجانے آنے والے وقت کی جھولی میں اس کے لیے پھول ہیں یا کانٹے۔

یہ کہاں لکھا ہے کہ خواب صرف لڑکیاں ہی دیکھتی ہیں۔ اپنے جیون ساتھی کے بارے میں لڑکے بھی ہزار سپنے بنتے ہیں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے خواب ان کی آنکھوں سے چھلکتے ہیں اور لڑکے ان کو سیپ میں بند موتی کی طرح قید کرکے رکھتے ہیں۔

انہی بوجھل بوجھل سے دنوں میں پیغام ملا کہ خالو بے چارے گزر گئے۔ اماں کے تو مانو زخم پھر سے ہرے ہوگئے۔ ابا کے مزاج میں بھی اب پہلے سا دم خم نہ رہا تھا۔ اماں کو روتا پیٹتا دیکھ کر ان کا مزید دل بیٹھ گیا اور وہ فوراً چلنے کے لیے تیار ہوگئے۔

اماں ابا وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ خالہ بے چاری کے حالات کس قدر دگرگوں ہوچکے تھے۔ خالو فالج کا شکار ہوکر کئی سالوں سے بستر پر پڑے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے شادی کے بعد علیحدہ ہوچکے تھے اور ماں باپ کو بالکل بھی نہ پوچھتے تھے۔ خالہ اپنی بیٹی اور بیمار شوہر کے ساتھ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

بہن کے حالات جان کر اور پھر اس کے بارے میں اپنی بے خبری پر اماں دکھی اور ابا شرمندہ تھے۔

خالہ کو سب سے زیادہ فکر اپنی بیٹی شربت خانم کی تھی جو باپ کی وفات کے بعد دو جوان بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی بے آسرا ہوچکی تھی۔ اماں کو بھی معصوم صورت اور اداس اداس سی شربت خانم پر بیک وقت پیار اور ترس آیا۔ خالو کے سوئم کے بعد اماں نے علیحدگی میں ابا سے ڈرتے ڈرتے تذکرہ کیا کہ کیوں نہ وہ لوگ شادی خان کے لیے خالہ کی بیٹی شربت خانم کا سوچ لیں۔ ابا بھی پشیمان سے تلافی کی کوئی صورت سوچ رہے تھے۔ فوراً رضامند ہوگئے۔ ویسے بھی جن سے انہیں اختلاف تھا وہ تو منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔

ہفتہ بھر بعد جب وہ واپس لوٹنے لگے تو خالہ کی رضامندی کے بعد شربت خانم کی مٹھی میں ڈھیر سارے روپے تھما کر ایک طرح سے بات پکی کردی۔

خالہ بھی نم آنکھوں سے مسکراتی رہیں۔
سینے پر دھرا ایک بڑا بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

گھر آکر جب اماں نے شادی خان سے تذکرہ کیا تو وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنی شادی کے تمام اختیارات اپنی ماں کو سونپ رکھے تھے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اس سے رسمی طور پر پوچھا بھی نہ جاتا۔ اس نے تو شربت خانم کو دیکھا تک نہ تھا۔ بہت زیادہ یاد کرنے پر بھی کئی سالوں پہلے دیکھی ہوئی چار پانچ سال کی ایک گول مٹول سی بہتی ناک والی بچی ہی اس کے ذہن میں آسکی۔ اب تو خیر وہ بہت بڑی ہو چکی ہوگی۔ بہت سوچنے کے بعد فقط ایک ہی جملہ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ''اماں! شربت خانم پیاری تو ہے نا۔'' (لفظ پیاری کی جگہ وہ گوری کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر اس میں نقص امن کا خطرہ پوشیدہ تھا اس لیے اس نے پیاری کا لفظ استعمال کیا۔ اب ظاہر ہے جو پیاری ہوگی وہ گوری بھی ہوگی۔ اب اماں کسی کالی کلوٹی کو تو پیاری کہنے سے رہیں)

''ہاں! میرے چاند! ماشاء اللہ اتنی من موہنی سی صورت ہے اس کی اور سیرت تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپا کا سارا گھر نہایت سلیقے سے سنبھال رکھا ہے اس نے۔'' اماں اپنی طرف سے اس کی تسلی کرواتیں مگر وہ پھر بھی بے چین ہو اٹھتا۔ سیرت سے تو اسے کوئی غرض نہ تھی اس نے کون سا سیرت کا اچار ڈالنا تھا۔ اس لیے بول پڑا۔

''اماں! اس کی کوئی تصویر ہی لے آتیں۔''

پھر اماں کا چپل کی جانب ہاتھ جاتا دیکھ کر جلدی سے بات بدل کر پوچھا۔ ''اماں! میرا مطلب ہے وہ نجانے ہمارے ماحول میں سیٹ ہو بھی پائے گی یا نہیں۔''

''کیوں نہیں سیٹ ہوگی۔ اتنی سمجھدار بچی ہے۔ تم فضول باتیں نہ کرو۔'' وہ بری طرح سے اسے جھاڑ دیتیں تو وہ فقط اپنا سر کھجا کر رہ جاتا۔

☆☆☆

خالو کے چالیسیوں کے بعد ابا نے اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ خالہ کی مالی حالت کے پیش اماں ابا نے طے کیا کہ فقط گھر کے چار بندے ہی بارات کی صورت میں جائیں گے اور سادگی کے ساتھ نکاح پڑھوا کر شربت خانم کو لے آئیں گے۔ البتہ ولیمہ گھر آکر دھوم دھام سے کر لیا جائے گا۔

اماں اور بہنوں نے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اماں نے تو برسوں کے ارمان سنبھال کر رکھے تھے جواب پورے ہونے جا رہے تھے۔ وہ بھی جو کچھ کماتا تھا اس میں سے کچھ رقم اپنی ذاتی ضرورت کے لیے نکال کر باقی سب اماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا وہ جو اس کی شادی کے اخراجات کی مد میں جمع کر لیتی تھیں۔ پھر ایک دن اماں نے اس کی مٹھی میں کافی ساری رقم تھمائی تاکہ وہ بھی اپنی پسند سے اپنے کپڑے جوتے وغیرہ خرید لے۔ وہ جانے لگا تو گل جاناں نے چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''بھیا.....! دلہن کے واسطے بھی کوئی تحفہ خرید لینا.....!!''

''ہیں.....وہ کیوں.....؟؟ تم لوگ جو اس کے لیے اتنے کپڑے اور جوتے وغیرہ خرید رہی ہو.....وہ تحفے نہیں ہیں کیا.....؟؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''میرے بھولے بھائی! دولہا بھی دلہن کے لیے علیحدہ سے کوئی تحفہ لیتا ہے جسے منہ دکھائی کہتے ہیں۔ ہم جو کچھ لے رہے ہیں وہ تو بری ہے۔'' وہ شرارت سے اس کے سر پر چپت لگا کر بولی۔

''تو پھر میں کیا خریدوں اس کے لیے.....؟؟'' وہ ہونق پن سے پوچھنے لگا۔

''جو پسند آئے خرید لینا۔'' وہ کہہ کر چلتی بنی اور وہ سوچنے لگا تو اچانک اسے اپنا دوست تاجا یاد آیا جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس سلسلے میں تاجا اس کو بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔

اس نے شرماتے ہوئے تاجے سے ذکر کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہمارے معاشرے میں تو سونا ہی عورت کی کمزوری ہے۔ کوئی زیور خرید لو۔ میں نے بھی اپنی بیوی کے لیے سونے کا لاکٹ سیٹ لیا تھا۔''

پھر وہ تاجے کے ہمراہ بازار روانہ ہوا۔ دونوں نے پہلے کپڑے جوتے خریدے پھر جیولر کی دکان میں داخل ہوئے۔ دکان میں ہر طرف مختلف زیورات جگمگ جگمگ کررہے تھے۔ شادی خان کی تو آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ دکان دار اسے مختلف زیورات نکال نکال کر دکھا رہا تھا اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ تاجا بھی بیچ بیچ میں لقمے دے رہا تھا۔

''یار..... یہ چین کتنی خوب صورت ہے۔'' وہ نظریں گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک شوکیس میں رکھے جڑاؤ کنگن پر اس کی نظر پڑی۔ ان میں سے ایک تو بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے ایک دن اسی نسوانی خوب صورت کلائی میں پہنا ہوا دیکھا تھا۔ ننھے ننھے سرخ اور سفید نگوں سے مزین خوب صورت کنگن ایک بار پھر اسے اس حسین ہاتھ کی یاد دلا گیا جس نے کئی سالوں سے اسے مسحور کررکھا تھا۔ اس نے قیمت پوچھی تو وہ اس کی توقع سے بہت زیادہ تھی۔ مگر شوق کا بھی کوئی مول نہیں ہوتا۔ اس نے کچھ پیسے تاجے سے ادھار پکڑے اور پھر اپنے والے سارے ملا کر کنگن خرید لیا۔

☆☆☆

پھر آخر کار اس کی شادی کا دن آپہنچا۔ وہ اماں ابا اور دو بڑے بھائیوں پر مشتمل مختصر بارات لے کر لاہور روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر سادگی سے اس کا اور شربت خانم کا نکاح ہوا اور اسی شام وہ لوگ واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ٹرین کی چھ سیٹیں پہلے ہی سے بک کروالی گئی تھیں۔

اماں ابا کے درمیان دلہن صاحبہ چھوٹی موٹی بنی بیٹھی تھیں اور اس کے بالکل سامنے اپنے دو بھائیوں کے درمیان شادی خان براجمان تھا۔ سارے راستے اس نے بہتیری تانکا جھانکی کرنے کی کوشش کی کہ کسی طرح سے دلہن کی ایک جھلک دیکھ سکے مگر ناکام رہا۔ ایک تو وہ بڑی ساری چادر میں ملفوف تھی دوسرے وہ جب بھی سامنے دیکھتا تو اس کے دائیں بائیں بیٹھے اس کے دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک بری طرح سے اپنی کہنی اس کی پسلی میں چبھو دیتا اور کراہ کر فوراً نظریں جھکا لیتا۔

صبح سویرے وہ کراچی پہنچے تو ان کا سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکیاں اور عورتیں دلہن پر ٹوٹ پڑیں اور پھر ایک طرح سے اسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے گئیں۔ صورت حال دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا کہ فوری طور پر دلہن سے ملاقات ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اس پر ستم شام میں ابا نے ولیمہ رکھ کرلیا تھا۔ اس کے تمام بھائی شادی شدہ اور بال بچوں والے تھے۔ اس لیے ابا نے انتظامات کی تمام ذمہ داری اسی کے سر ڈال دی تھی۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود اس نے بہانے بہانے سے گھر کے کئی چکر لگائے۔ اس کا کمرہ ہنوز عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مایوس ہوکر پلٹ آیا۔ نجانے لوگ اس نازک موقع پر دولہا کے نئے نویلے جذبات واحساسات کا پاس کیوں نہیں کرتے۔

خدا خدا کر کے ولیمے کی تقریب اختتام پذیر ہوئی تو رات گئے اسے اپنے کمرے میں جانے کا موقع ملا۔

☆☆☆

اس نے اپنے سر پر دھری ارمانوں کی گٹھڑی کو سنبھالا، جیب کو تھپتھپا کر کنگن کی موجودگی کا یقین کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر حجلۂ عروسی میں داخل ہوگیا۔ سامنے بیڈ پر زرتار آنچل کا لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے دلہن سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھی۔

اس نے شکر کیا کہ آج وہ تمبو نما چادر غائب تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا بیڈ کے قریب آیا اور گلا کھنکھار کر سلام کیا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر دلہن کا گھونگٹ الٹ دیا۔

دولہن کا کیا ہوا میک اپ اب مدھم پڑ چکا تھا۔

سنگھار کے مٹے مٹے نشانات میں سے اس کا سانولا سلونا روپ اپنی چھب دکھا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی پاتال میں جا گرا۔ دلہن نے غیر ارادی طور پر اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی تو اس کی چوڑیاں بج اٹھیں۔ چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کی نظریں اس کے باہم پیوست ہاتھوں پر جا رکیں۔ چہرے سے بھی کچھ زیادہ سانولے ہاتھ سرخ مہندی سے سجے تھے۔ اس کا دل ایک بار پھر ڈوب گیا۔ وہ شہابی رنگت..... سڈول گوری کلائیاں..... خوب صورت مرمریں ہاتھ..... سب خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے اور ان کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں یوں چبھنے لگیں جیسے کسی نے مٹھی بھر مرچیں آنکھوں میں ڈال دی ہوں۔ زرتار آنچل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ شکست خوردہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا دلہن بے چاری دولہا کے اس عجیب غریب ردعمل پر ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

اس نے کمرے سے نکل کر سلگتی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ تمام لوگ سونے کے لیے جا چکے تھے۔ صرف کچن کی بتی جل رہی تھی۔ گل جاناں اور اماں بچا کھچا کھانا سمیٹ رہی تھیں۔ سب سے پہلے گل جاناں کی ہی نظر اس پر پڑی۔ اس کو اتنی جلدی یوں لٹا پٹا سا آتا دیکھ کر وہ حیران و پریشان رہ گئی۔ اماں کا بھی چاول نکالتا ہاتھ رک گیا۔

''کیا بات ہے بھائی..... !! خیریت تو ہے.....؟'' گل جاناں نے تشویش سے پوچھا مگر وہ اس کو یکسر نظر انداز کر کے کچھ دیر تک ماں کو زخمی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر سرگوشی نما آواز میں بولا۔

''اماں! یہ ہے وہ چاند سی دلہن جو آپ نے میرے لیے پسند کی تھی.....؟؟''

اماں کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا وہ جھنجلا کر بولیں۔

''کیا بات ہے.....؟ کیوں فضول بول رہے ہو.....؟''

''اماں! میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ہے وہ کالی کلوٹی سی دلہن جیسے آپ چاند سا کہا کرتی تھیں.....؟''

اب کی بار وہ زور سے دھاڑا اور پاس پڑی پیڑھی کو ٹھوکر مار کر تن فن کرتا ہوا بیٹھک کی جانب چلا گیا۔

''اماں! بھیا کو دلہن پسند نہیں آئی۔'' گل جاناں کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی اور پھر دونوں ماں بیٹی جہاں کی تہاں ـــــ رہ گئیں۔

☆☆☆

کچن سے ملحق کمرے میں بیٹھی دلہن نے اپنے دولہا کا ایک ایک لفظ سنا جو گرم سیسے کی مانند اس کی سماعتوں میں اترتا چلا گیا۔

ایک لڑکی کراچی سے لاہور کا پندرہ سولہ گھنٹے کا سفر کر کے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہزاروں ارمانوں کے ساتھ بیاہ کر آئی ہے اور اس کا دولہا محض سانولی رنگت پر اسے اتنی بری طرح سے دھتکار دیتا ہے تو پھر اس سے زیادہ اس کی نسوانیت کی توہین اور کیا ہوگی۔ گرم گرم ڈھیر سارا نمکین پانی اس کی آنکھوں سے ایک سیلاب کی مانند ابل پڑا اور وہ اپنا سر گھٹنوں میں دے کر قدرت کی ستم ظریفی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

☆☆☆

پھر وہ کئی دن تک روٹھا روٹھا سا پھرتا رہا۔ اماں نے اس کے باپ اور بھائیوں کے سامنے اس کا پردہ رکھنے کے لیے اس کے نامناسب رویے کو طویل سفر اور شادی کے کاموں کی تھکن کا شاخسانہ قرار دیا۔

پھر ایک دن پیار سے علیحدہ سمجھایا۔

''دیکھو بیٹا! شربت خانم بہت پیاری بچی ہے صرف رنگ ہی کچھ دبتا ہوا ہے۔ بچپن میں تو صاف تھا۔ بخار ہوا تو کسی اناڑی حکیم کی دوا کھانے سے ساری جلد جھلس گئی۔ پھر غربت میں پلی بڑھی ہے۔ ہمارے ہاں اچھا کھائے پیے گی تو رنگ روپ نکھر جائے گا۔''

''ہاں بھیا! شربت بھابھی کے نقوش بہت پیارے ہیں۔ بس رنگ ذرا سانولا ہے اور آج کل کے زمانے میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسی ایسی کریمیں بازار میں دستیاب ہیں کہ اگر کوئی شیش ناگ بھی لگالے تو گورا ہوجائے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں چند دنوں میں ہی بھابھی کو پھول کی طرح نکھار دوں گی۔ گل جاناں نے بھی تسلی آمیز انداز میں کہا۔

دراصل اس نے بیوٹی پارلر کا کورس کیا ہوا تھا اور اس کو اپنے ہنر پر بہت ناز تھا۔ اور پھر واقعی اس نے بہت محنت کی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ شربت خانم کی جلد بہت حساس تھی۔ جوں ہی وہ کوئی رنگ گورا کرنے والی کریم لگاتی تو جلد سرخ سرخ دانوں سے بھر جاتی ہاں البتہ گل جاناں نے بار بار فیشل کر کے اس کی رنگ کو پہلے سے کچھ نکھار ضرور دیا تھا۔

شادی خان کے سرد رویے کے باوجود شربت خانم تمام اہل خانہ کے ساتھ نہایت اچھی طرح سے گھل مل گئی تھی۔ اماں ابا اس سے بہت خوش تھے۔ وہ ان کی تمام بہوؤں سے زیادہ سلیقہ شعار اور پھرتیلی ثابت ہوئی تھی۔ بن کہے ہی اماں کے سر میں تیل ڈال کر نفاست سے چوٹی گوندھ دیتی۔ ابا نماز فجر کے فوراً بعد چائے پینے کے عادی تھے جو پہلے کبھی انہیں وقت پر نصیب نہیں ہوئی تھی مگر شربت خانم منہ اندھیرے ہی جب وہ ابھی جائے نماز پر ہی موجود ہوتے تھے تو بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اور ایک ابلا ہوا انڈا ان کے پاس رکھ جاتی تھی۔

شادی خان کو بھی اپنے کپڑے جوتے اور ناشتہ وقت پر تیار ملتا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ کام پر جانے سے پہلے اپنی ضروری چیزوں کے لیے خوار ہوتا پھرتا تھا۔ بجلی نہ ہونے پر اکثر بغیر استری کیے کپڑے پہن جاتا یا پھر اپنے کسی بھائی کے کپڑے چپکے سے پہن جاتا اور واپسی پر خوب صلواتیں سنتا۔ مگر اب شربت خانم اس سے متعلقہ ہر چیز کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اس کی خدمات کو بڑے دھڑلے کے ساتھ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا تھا مگر اس کی نام نہاد مردانہ انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی وہ بیوی کی حوصلہ افزائی کے لیے شکریہ کے دو لفظ ہی بول دے۔ اندر ہی اندر اس کی خوبیوں کے معترف ہونے کے باوجود اسے سراہنا اسے اپنی شان کے خلاف نظر آتا تھا۔

گل جاناں اکثر اسے چھیڑتی ''بھائی بیوی تو تمہیں پسند نہیں آئی تھی مگر اب اس کی خدمات سے کیوں لطف اندوز ہو رہے ہو.....؟'' تو وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہتا۔

☆☆☆

شام کا ملگجا اندھیرا رات کی تاریکی میں بدل رہا تھا۔ وہ تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو رات کا کھانا کھایا جانے والا تھا۔ اس کے گھر میں مغرب کے فوراً بعد رات کا کھانا کھالیا جاتا تھا۔ دسترخوان بچھ چکا تھا اور شربت خانم برتن رکھ رہی تھی۔ ہلکے پیازی رنگ کا کامدار سوٹ میں اس کا سانولا سلونا سا روپ دمک رہا تھا۔ اماں اور گل جاناں نے بھی سراہا مگر جہاں سے اسے خود سراہے جانے کی چاہ تھی وہاں ہنوز لاتعلقی اور سرد مہری کے بادل چھائے تھے۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے کھوج لے اور اگر نہ چاہیے تو یونہی اندھا بنا پھیرتا رہے۔ اس نے بھی ایک اڑتی پڑتی سی لاتعلق نظر اس پر ڈالی اور ہاتھ منہ دھو کر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ ابا جان کھانا شروع کر چکے تھے۔ تڑکا لگے چاول اور کڑھی، وہ کھاتے جا رہے تھے اور سر دھنستے جا رہے تھے باقی اہل خانہ بھی شربت خانم کے ہاتھوں سے بنائے گئے کھانے کی لذت کو سراہ رہے تھے۔ وہ جل کر خاک ہوگیا۔ وہ سارا دن کتنی محنت کرتا تھا مگر آج تک کسی نے اس کی تو کوئی تعریف نہیں کی تھی۔ اور اس جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے آئی لڑکی کو وہ سب سر چڑھا رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

جب شربت خانم نے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھی تو اس نے حقارت سے پرے دھکیل دی۔

''میں نہیں یہ کھاتا۔''

''گل جاناں! بھائی کو میرا پرہیزی شوربہ گرم کردو!''

اماں نے ابا کی موجودگی کی وجہ سے مصالحانہ راہ اختیار کی۔ گل جاناں نے شوربے کا پیالا اس کے سامنے رکھا تو وہ خاموشی سے کھانا لگا۔ پھیکا بے رنگ شوربہ، نوالے اس کے حلق میں پھنسنے لگے اس نے دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سبھی لذیذ کڑھی چاول سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر وہ اپنی خود ساختہ انا کے ہاتھوں مجبور شوربے کے تالاب میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ تھوڑا بہت زہر مار کرنے کے بعد وہ اٹھ گیا۔ سونے لیٹا تو کافی دیر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند نہ آئی۔ کھانا برائے نام کھایا تھا۔ اس لیے اب بھوک پھر جاگ اٹھی تھی۔ ناچار کچن میں جا کر کچھ کھانے کے ارادے سے اٹھا پاؤں میں چپلیں اڑسیں۔ جاتے جاتے ایک چور نظر سوئی ہوئی شربت خانم پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

کچن میں ابھی تک کڑھی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہو کر پتیلے کا ڈھکن اٹھایا پھر پلیٹ بھر کر چاول نکالے اور کڑھی ڈال کر جلدی جلدی کھانے لگا۔

☆☆☆

اس کا کام پہلے سے بہت بڑھ گیا تھا۔ جتنے برتن اور ساز و سامان وہ لے کر جاتا وہ سب ہاتھوں ہاتھوں بک جاتا اور گاہک مزید کی ڈیمانڈ کرتے چھوٹی سی ریڑھی پر اتنا سامان پورا نہیں آتا تھا اس لیے اس نے باپ اور بھائیوں کے مشورے سے دکان کھولنے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلے میں وہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مناسب جگہ پر دکان کرائے پر لے کر سامان اس میں ڈال دے گا اور ریڑھی بیچ دے گا۔ مگر انسان سوچتا کچھ اور ہے کچھ اور جاتا ہے۔ وہ مہینوں، سالوں کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور تقدیر کہیں دور کھڑی اس کے ارادوں پر مسکرا رہی ہوتی ہے۔

اچانک ملک ایک خوفناک وبا کی لپیٹ میں آ گیا پہلے پہل تو زندگی کی گہما گہمیوں میں مشغول لوگوں نے اسے محض پروپیگنڈا سمجھا مگر جب نادیدہ وائرس نے تباہی مچانی شروع کی تو ہر طرف خوف و ہراس کا عالم طاری ہو گیا۔ کیسز کی تعداد بڑھ گئی۔ لاک ڈاؤن کا نفاذ ہوا تو گلیاں بازار سنسان ہو گئے۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ اس کے باپ اور بھائیوں کا کاروبار بھی ٹھپ ہو گیا۔ سب کے سب سوائے اس کے بے روزگار ہو کر گھر آ بیٹھے۔ صرف وہی تھا جو ابھی تک کام پر جا رہا تھا کیونکہ جس علاقے میں وہ ریڑھی لگاتا تھا وہاں ابھی پوری طرح سے لاک ڈاؤن کا نفاذ نہیں ہو پایا تھا۔ پولیس کی موبائل وین گشت کر کے چلی جاتی تو لوگ دوبارہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

اماں اسے بھی جانے سے روکتیں تو وہ کہتا

''اماں سبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر بیٹھے ہیں۔ اگر میں بھی کام پر نہیں جاؤں گا تو گھر کی دال روٹی کیسے چلے گی.....؟''

''مگر بیٹا احتیاط بھی تو ضروری ہے کوئی ماسک وغیرہ ہی لگا جایا کرو.....!!!اماں کا خدشات سے پر دل دھڑکتا مگر وہ ماں کی تشویش کو چٹکیوں میں اڑا دیتا۔

''کچھ نہیں ہوتا ماں..... میں آپ کا شیر ہوں۔ شیر ..... پھر ایسے حسین مکھڑے پر ماسک کوئی اچھا لگتا ہے.....'' وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے کر شربت خانم کو دیکھتے ہوئے مسخرانہ انداز میں کہتا۔

اس کو کچھ دن سے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا مگر اس نے مصروفیت کی وجہ سے پروانہ کی۔ پھر سانس میں بھی رکاوٹ آنے لگی۔ ایک رات اس کی طبیعت اتنی بگڑ گئی کہ اسے ایمرجنسی لے جایا گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کی حد سے بڑھتی ہوئی خود اعتمادی اور

لاپرائی ہی اسے لے ڈوبی۔ وہ نہ جانے کیسے وائرس کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے باقی تمام گھر والوں کے بھی ٹیسٹ ہوئے، مگر وہ سب محفوظ رہے تھے۔ صرف وہی وبا کی لپیٹ میں آیا۔

پورے دو ہفتے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا پڑا رہا اور آخر بیماری کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اسپتال سے فارغ ہوتے وقت ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ گھر جا کر بھی چند روز تک خود کو مکمل طور پر دوسروں سے علیحدہ رکھے تاکہ وائرس کا خطرہ مکمل طور پر ٹل جائے۔ اس لیے وہ اسپتال سے سیدھا گھر کے پچھلے احاطے میں منتقل ہوگیا۔ وہ حصہ کافی عرصے سے ویران اور اجاڑ پڑا تھا مگر اس کے آنے سے پہلے گھر والوں نے وہاں کی تھوڑی بہت صفائی کروا کر اس کا ضروری سامان رکھ دیا تھا۔

وہ متوحش نظروں سے ادھر اُدھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ دل بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی کوئی وقت آئے گا جب اسے اپنے خونی رشتوں کے بغیر تنہا رہنا ہوگا۔ اس سے پہلے نارمل زندگی گزارتے ہوئے تو اسے ان کی کوئی خاص قدر محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مگر اسپتال کے دو ہفتے کے قیام نے اسے اچھی طرح سے باور کروا دیا تھا کہ گھر کا سکون و آرام اور گھر والوں کا ساتھ کیا ہوتا۔ ابا دل کے مریض تھے اور اماں دمہ کی۔ دونوں کو اس سے ملنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بھائی بھی اسپتال میں اسے شیشے کی دیوار کے اس پار سے دیکھ کر چلے جاتے تھے۔ یار دوست تو بے شمار تھے مگر فون صرف تاجے کا ہی آتا تھا۔ وہ سوچوں میں غلطاں تھا کہ ذرا سی آہٹ پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ شربت خانم ایک شاپر ہاتھوں میں تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ اندر کی بھڑاس کو نکلنے کا راستہ چاہیے تھا۔ وہ بے چاری آسان ہدف تھی اس لیے وہ اسی پر الٹ پڑا۔

''کیوں آئی ہو یہاں.....؟'' وہ اس کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔''

وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں گھگھیائی

''دفعہ ہوجاؤ یہاں سے..... مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔''

اب کی بار وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ وہ وحشت زدہ ہو کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔

☆☆☆

کالی سیاہ حبس زدہ رات تھی۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ نے ماحول میں ارتعاش سا پیدا کر رکھا تھا۔ اسے عجیب بے چینی اور گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پاس پڑے ٹفن سے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ دو گھونٹ پانی کے ساتھ دوا حلق میں اتاری اور چارپائی پر چت لیٹ گیا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

ٹانگوں میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ وہ کروٹ بدلتا تو ہائے کی آواز اس کے منہ سے نکلتی۔ بیماری نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹنی چاہیں تو پاؤں پر نرم گرم سا لمس محسوس ہوا اور ساتھ ہی گرم پانی کے دو قطرے دائیں پنڈلی پر آ گرے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شربت خانم سر جھکائے اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ ششدر رہ گیا۔

غالباً وہ اس وقت گھر واپس نہیں گئی تھی بلکہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ باوجود کوشش کے اسے منع نہ کر سکا۔ اس کے موی ہاتھوں کا لمس اس کے پورے بدن میں سرایت کر کے عجب سکون بخش رہا تھا۔ اس کے درد کو ایک قرار سا آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور وہ بے سدھ سو گیا۔

☆☆☆

آج اس کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ وہ خود کو

ہشاش بشاش سا محسوس کر رہا تھا۔ صبح اس کا آخری ٹیسٹ ہوا تھا جو منفی آیا تھا۔ بس اب یہ قید تنہائی ختم ہو رہی تھی۔ مگر پتا نہیں جتنی جلدی اسے پہلے گھر جانے کی تھی اب اتنی نہیں تھی۔ اس نے طائرانہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ شربت خانم اپنی اور اس کی استعمال شدہ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اس کا لباس شکن آلود سا تھا اور بال بے ترتیب سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ملگجا سا حلیہ دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ پہلے تو اس کی بے اعتنائی کے باوجود وہ بہت بنی سنوری سی رہتی تھی۔ مگر اب چند دنوں میں بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کے سانولے سلونے چہرے پر بیک وقت معصومیت اور سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بنی سنوری اسے کبھی اتنی اچھی نہیں لگی تھی مگر اب بکھری بکھری سی بہت اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ شاید یہ اس خدمت کا اعجاز ہو جو ان چند دنوں میں اس نے اپنا وجود بھلا کر اس کی کی تھی۔ اس نے سوچا مگر خدمت تو وہ پہلے بھی اس کی کرتی تھی۔ اس وقت اسے اس خدمت کی قدر نہیں تھی کیونکہ وہ تندرست تھا اور دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کے آس پاس موجود رہتے تھے۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے کئی اپنوں کو بیگانہ ہوتے بھی دیکھا تھا۔ کئی شناسا چہرے بے نقاب ہو چکے تھے۔ کئی دوستی اور محبت کا دم بھرنے والوں نے فون پر بھی اس کی خیریت معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے اپنے بھائی بھی محض رسمی طور پر دور سے ہی دیکھ کر چلے جاتے تھے۔ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر نے اسے اکیلا رہنے کے لیے کہا تھا مگر اکیلا چھوڑنے کے لیے تو نہیں کہا تھا۔ صرف وہی تھی جس نے ساتھ نبھایا تھا۔

اماں ابا ٹھیک کہتے تھے کہ برا وقت انسان پر آتا ہے اسے کچھ سکھانے کے لیے اس پر بھی آیا تھا اور آ کر گزر گیا تھا مگر اب وہ شاید پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

''شربت خانم! ادھر آؤ.....'' اس نے پکارا۔

کام کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے اس کے نرم لہجے پر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے چلتی ہوئی قریب آئی۔

''ادھر میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے ذرا سا پرے سرک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ جھجکتی ہوئی چارپائی کے کنارے ٹک گئی۔

''شربت خانم! گھر جاؤ اور میری الماری کے سب سے نچلے خانے میں ایک براؤن رنگ کا لفافہ پڑا ہے وہ اٹھا کر لاؤ۔'' وہ اس کے سانولے ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے بولا۔

''مگر ابھی کچھ دیر بعد تو ہم نے گھر چلے ہی جانا ہے۔'' وہ حیران ہوئی۔

''مگر مجھے وہ ابھی چاہیے۔'' وہ بدستور نرمی سے بولا۔ شربت خانم گئی اور کچھ دیر بعد وہ لفافہ لا کر اس نے اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

وہ آہستہ آہستہ لفافہ کھولنے لگا اور وہ سانس روکے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس میں سے ایک جگر جگر کرتا ہوا خوب صورت کنگن نکالا۔ سحر زدہ سی شربت خانم کا ہاتھ تھاما اور ہولے سے اس کی کلائی میں پہنا دیا۔

''شربت خانم! یہ تمہاری منہ دکھائی کا تحفہ ہے۔ میں اس دن تمہیں دینا بھول گیا تھا۔'' وہ شرمسار لہجے میں بولا شربت خانم نے اپنی کلائی میں پڑے اس خوب صورت کنگن کو دیکھا اور بے اختیار اس کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ آ گئی۔

شادی خان نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھاما۔ آج وہ سانولے ہاتھ اسے بہت حسین لگ رہے تھے۔ اس نے نرمی سے ان پر اپنے ہونٹ ثبت کیے تو اس نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا۔ سامنے کھلی کھڑکی میں سے سنہری تھال جتنا بڑا چاند بھی دونوں کو دیکھنے کے لیے جھانکنے لگا۔

☆☆

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہم سائیگی سے ملتا ہے

جگر مرادآبادی

حالِ دل اپنا میں سناؤں کیسے
نقش یادوں کے میں مٹاؤں کیسے

یہ عشق ہے یا کہیے جنوں ہے میرا
بس میں نہیں کہ ہوش میں آؤں کیسے

قلب و ذہن فقط اس کے طالب ہیں
کہہ بھی دو میں اس کو بھلاؤں کیسے

دریچۂ دل ہر دم کھلا سا لگتا ہے
بات صرف یہ ہے میں اندر جاؤں کیسے

مایوس نہیں ہوں عشق سے اپنے
قول یہ اپنا دوست نبھاؤں کیسے

اقرار تو کیا اس نے میری محبت کا
بے رُخی اس کی میں یاد دلاؤں کیسے

تہمت مجھ پہ لگی ہے مے پوشی کی
تشنگی دید کی یار میں بجھاؤں کیسے

فیضان بن گیا ہے عشق میرا جرم
بزم میں اس کی میں آنکھ ملاؤں کیسے

فیضان سروری

کل کہیں ایسا نہ ہو

میرے لفظ اگر تمہیں سُنائی نہیں دیتے
تو مجھ پر ہنستے کیوں ہو
اور مجھے پتھر کیوں مارتے ہو
کل کہیں ایسا نہ ہو
کہ سماعتیں بحال ہو جائیں
اور یہ زخم تمہیں تکلیف پہنچائیں

اسد محمد خان

چشم گریاں میں وہ سیلاب تھے اے یار کہ بس
گرچہ کہتے رہے مجھ سے میرے غم خوار کہ بس

گھر تو کیا گھر کی شباہت بھی نہیں ہے باقی
ایسے ویران ہوئے ہیں در و دیوار کہ بس

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
ایک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فراز
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

احمد فراز

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ظلم کرنے سے بچو، اس لیے کہ ظالم قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا۔ اور شح (بخل و حرص) سے بچو، اس لیے کہ اسی شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس شح نے ہی انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپس میں خون ریزی کریں اور حرام کردہ چیزوں کو انہوں نے حلال سمجھ لیا۔" (مسلم)

فائدہ:۔

انسان جب مال کا بندہ بن جائے اور اسے دنیا کی ہوس لگ جائے تو اس کے دل سے ہمدردی ختم ہو جاتی ہے اور وہ حصول دولت کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے، حتیٰ کہ بخیل نفس کی تسکین کے لیے خون تک بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ اس قدر حیوان بن جاتا ہے کہ اپنی خواہشات کو شرعی جواز دینے کے لیے حرام تک کو حلال سمجھ بیٹھتا ہے۔

مہذب زندگی کے اصول،

- کسی شخص کو مسلسل دو بار سے زیادہ کال مت کریں۔ اگر وہ آپ کی کال نہیں اٹھاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور ضروری کام میں مصروف ہے۔
- کسی سے لی گئی اُدھار رقم اس کے یاد دلانے سے پہلے ادا کر دیں۔ ایک روپیہ ہو یا ایک کروڑ، یہ آپ کے کردار کی پختگی دکھاتا ہے۔
- کسی کی دعوت پر مینو پر مہنگی ڈش کا آرڈر نہ دیں۔ اگر ممکن ہو تو اس سے پوچھیں کہ آپ کے لیے کھانے کی اپنی پسند کا آرڈر دے۔
- مختلف سوالات کسی سے مت پوچھیں جیسا کہ "اوہ تو آپ ابھی تک شادی شدہ نہیں ہیں یا آپ کے بچے نہیں ہیں یا آپ نے گھر کیوں نہیں خریدا؟" خدا کے لیے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔
- ہمیشہ اپنے پیچھے آنے والے شخص کے لیے دروازہ کھولیں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ مرد ہے یا عورت۔ آپ کا قد لوگوں کے سامنے کسی سے اچھی طرح سے پیش آنے سے چھوٹا نہیں ہوتا، بڑھتا ہے۔
- اگر آپ کسی دوست کے ساتھ ٹیکسی لے لیں اور کرایہ وہ ادا کرتا ہے تو اگلی بار آپ ادا کریں۔
- مختلف سیاسی نظریات کا احترام کریں اور اس وجہ سے لوگوں سے نفرت نہ کریں۔
- لوگوں کی بات نہ کاٹیں۔
- اگر آپ کسی سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں اور وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہوتا تو رک جائیں اور دوبارہ کبھی ایسا نہ کریں۔
- جب کوئی آپ کی مدد کرے تو آپ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جزاک اللہ ضرور بولیں۔
- کسی کی تعریف کرنی ہو تو لوگوں کے سامنے کریں اور تنقید صرف تنہائی میں۔

نصیحت،

ایک بادشاہ زادے کے تاج کا لعل اندھیری رات میں پتھریلی جگہ گر پڑا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"پتھروں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھر

کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔"

جواہر پارے

"انتہا پسندی ہمیشہ اندھے شیشے جیسی ہوتی ہے۔ جس میں اپنا تو کیا حقیقت کا چہرہ پورا نظر نہیں آتا۔

"اعتماد عجیب جنس ہوتا ہے۔ نایاب اس قدر کہ ڈھونڈتے رہیں اور عمر گزر جائے۔ ارزاں اتنا کہ ایک محبت بھری نگاہ یقین سے بھر دے۔

ماہا بشیر حسین۔ ڈنگہ

غصہ

شادی کے دن نئی نویلی دلہن نے ایک اٹیچی کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ اس اٹیچی کیس کو کبھی نہیں کھولے گا۔ شوہر نے وعدہ کرلیا۔

شادی کے پچاسویں سال بیوی بستر مرگ پر پڑ گئی تو خاوند نے اسے اٹیچی کیس یاد دلایا۔

بیوی بولی "اب یہ وقت ہے اس اٹیچی کیس کے راز کو افشا کرنے کا۔ اب آپ اس اٹیچی کیس کو کھول لیں۔"

خاوند نے اٹیچی کیس کھولا تو اس سے دو گڑیاں اور ایک لاکھ روپے نکلے۔

خاوند کے پوچھنے پر بیوی بولی "میری ماں نے مجھے کامیاب شادی کا راز بتاتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ غصہ پی جانا بہت اچھا ہے۔ جب بھی اپنے خاوند کی کسی بات پر غصہ آئے تو تم بجائے خاوند پر غصہ نکالنے کے ایک گڑیا سی لیا کرنا۔ تو مجھے جب بھی کسی بات پر غصہ آیا، میں نے گڑیا سی لی۔"

خاوند دو گڑیاں دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اس نے اپنی بیوی کو کتنا خوش رکھا ہوا ہے کیونکہ بیوی نے پچاس سال کی کامیاب ازدواجی زندگی میں صرف دو گڑیاں ہی بنائی تھیں۔

خاوند نے تجسس سے اٹیچی میں موجود ایک لاکھ روپوں کے بارے میں پوچھا تو بیوی بولی۔

"یہ ایک لاکھ روپے میں نے گڑیاں بیچ بیچ کر اکٹھے کیے ہیں۔"

ذرا سوچو...!

جس محاذ پر نہ فتح کا امکان ہو اور نہ شکست کی توقع، وہاں انسان اندر سے تھک جاتا ہے۔ اپنے آپ سے ہار جاتا ہے۔

ٹانگوں کی واضح لڑکھڑاہٹ بھی اگر کسی کو دکھائی نہ دے تو جی چاہتا ہے کہ وہیں گر جائیں۔ کیا فائدہ چلتے رہنے کا اور چلتے ہی چلے جانے کا۔

روئے زمین پر بہادری کا سب سے بڑا امتحان شکستہ دل ہوئے بغیر شکست کو برداشت کرنا ہے۔

"معروف" اور "محبوب" ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

ضرورت سے زیادہ احتیاط انسان کے درمیان بدگمانیاں پیدا کرتی ہے

فرزانہ ناز کمبوہ۔ بھلوال

القابات

مختلف گھروں میں کام کرنے والی عورتوں نے نشانی کے طور پر گھر کی مالکنوں کے عجیب عجیب نام رکھے ہوتے ہیں۔ یہ نام کسی کی صفت ظاہر کرتے ہیں اور کسی کی تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

بیگم زاہد اپنے ننگلے کے باغیچے کی صفائی کروا رہی تھیں، وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئیں تو تھوڑی دیر چہل قدمی کے لیے اٹھیں اور دیوار کے ساتھ لگے پیڑ کے نیچے چھاؤں میں کھڑی ہوگئیں۔ ان کے کان میں ان کی نوکرانی کی آواز آئی۔ وہ اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے طوطے والی، کالی بیم اور تپ دق والی کے گھر کا کام کرلیا ہے یا نہیں...؟

بیگم صاحبہ کو غصہ آیا۔ انہوں نے نوکرانی کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

"یہ نام اس نے کن عورتوں کے رکھے ہیں؟"

اس نے ڈرتے ہوئے بتایا "ہم ان پڑھ لوگ

ہیں۔ اپنی نشانی کے لیے ان بیگمات کے نام رکھے ہیں۔ میر بخش کے گھر میں بہت سے کھلونے ہیں، اس لیے وہ کھلونوں والی اور آفتاب صاحب کی بیگم نے طوطا پال رکھا ہے تو وہ طوطے والی ہیں۔ کرچن عورت کا نام کالی مینم اور گلی کے آخر میں جو عورت بیمار پڑی رہتی ہے، اس کا نام تپ دق والی رکھا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ "تو نے میرا تو کوئی نام نہیں رکھا؟"

نوکرانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

بیگم صاحبہ خوش ہوگئیں۔ جب نوکرانی واپس اپنے گھر جانے لگی تو راستے میں اس کا شوہر دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں سے آرہی ہو؟"

وہ کہنے لگی۔ "وہ جو ڈھڈو ہے ناں، اس کے گھر کا کام نمٹا کر آرہی ہوں۔"

نمرہ۔ اقرا۔ کراچی

دوستی ایسا ناتا

ہمارے ایک بنگالی دوست مسٹر بینرجی ہیں، جو بہت کم اردو جانتے ہیں۔ ایک دن ہم ان کے گھر گئے تو بچیاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے بولے۔

"خدا حافظ! کیسے آنا ہوا؟"

ہم نے کہا۔ "یار خدا حافظ اس وقت کہا جاتا ہے جب تم کسی مہمان کو گھر سے رخصت کرنے لگو۔ تم نے یہاں آتے ہی الٹے پاؤں لوٹ جانے کی صورت حال پیدا کردی۔"

بولے۔ "مجھے کیا معلوم کہ یہ لفظ کب بولا جاتا ہے مگر خدا حافظ مجھے اچھا لگتا ہے، اس لیے استعمال کرتا ہوں۔ پھر تم میرے ایسے دوست ہو جسے میں چاہے کچھ بھی کہوں، وہ واپس نہیں جاسکتا۔ اسی بات پر ماندہ آؤ، خدا حافظ۔"

باتوں سے خوشبو آئے

- اچھے انسان کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی بھی عزت کرتا ہے، جن سے اسے کسی قسم کے فائدے یا مفاد کی توقع نہیں ہوتی۔
- کچھ تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں، جن پر رونے والے کو تو معاف تو کیا جاسکتا ہے مگر اس سے تعلق نہیں رکھا جاسکتا۔
- بدلہ لینے والوں سے نہیں، سہہ جانے والوں سے ڈرو کیونکہ ان کا معاملہ رب کے حضور پہنچا دیا جاتا ہے۔
- عقل کی حد ہوتی ہے مگر بے عقلی کی حد نہیں ہوتی۔

دوستی

- مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ، دشمن سے میں خود نمٹ لوں گا۔ (والپیٹر)
- ناقابل اعتماد دوست سے تنہائی بہتر ہے۔ (ہیٹلر)
- دوستی جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی مضبوط اور عمدہ ہوتی ہے۔ (ارسطو)
- اچھا دوست حاصل کرنے کے لیے خود اچھا بنو۔ (دنچل)

گڑیا راجپوت۔ جاتری شریف

پکنک

وہ دونوں اتوار کو سارا دن ساحل سمندر پر پکنک منا کر شام کو واپس آرہے تھے کہ اچانک نوجوان نے پریشان ہو کر لڑکی سے پوچھا۔

"میرے خیال میں تم پکنک کے سارے واقعات اپنی ممی کو تو نہیں بتاؤ گی؟"

"اوہ نہیں۔!" لڑکی نے جواب دیا۔

"یہ میرا شوہر ہی ہے، جسے ہر طرح کے سوال کرنے کی عادت ہے، میری ممی کو تو خدا پر واہ نہیں۔"

آسیہ حفیظ۔ کراچی

امت الصبور

خاتون کی ڈائری

ثوبیہ قطب کی ڈائری سے

لائل پور کاٹن مل میں ملک گیر طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ 1975ء میں جگر مراد آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا، سجدہ گاہ عاشقاں پر نقش پا ہوتا نہیں" مختلف شعراء کے بعد ساغر صدیقی نے اپنی یہ غزل سنائی۔

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں!
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

یہ غزل سن کر جگر جھوم اٹھے اور حاضرین محفل نے خوب داد دی۔

جگر مراد آبادی نے اپنی باری آنے پر کہا۔
"میری غزل کی ضرورت نہیں۔ حاصل مشاعرہ غزل ہو چکی"

اور اپنی غزل کو اسٹیج پر ہی پھاڑ دیا۔

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

جی میں آتا ہے الٹ دیں ان کے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

اب تو مدت سے رہ و رسم نظارہ بند ہے
اب تو ان کا طور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ نا خدا ہوتا نہیں

ہائے یہ بے گانگی اپنی نہیں مجھ کو خبر
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

بارہا دیکھا ہے ساغر رہ گزار عشق میں
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں

جبیہ حسان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ خوبصورت غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

اب تک یہی سنا تھا کہ بازار بک گئے
اس کی گلی گئے تو خریدار بک گئے

لگنے لگی ہیں مجھ سے بھی ناقص کی بولیاں
یعنی جہاں کے سامنے ہی شہکار بک گئے

جس نے ہمیں خریدا، منافع کما لیا
اپنا یہ حال کہ ہر بار بک گئے

انجام یہ نہیں تھا کہانی کا اصل میں
کیا کیجیے کہ بیچ میں کردار بک گئے

جنگل کی دھوپ میں بھی نہ سایہ ہمیں ملا
قیمت لگی تو دیکھیے اشجار بک گئے

اتنا تو فرق ہے چلو اپنوں میں غیر میں
اپنے تھے شرم سار، مگر یار بک گئے

مت پوچھ ان کا بکتے محبت کے مول جو
روئے تمام عمر کہ بے کار بک گئے

کیجیے شکایتیں بھلا اب کس کے روبرو
قاضی بکا یہاں، یہاں دربار بک گئے

نورِ نظر کے ڈائری سے

پتا نہیں یہ کس شاعر کی غزل ہے مگر جب بھی پڑھی یا سُنی، بہت ہی پسند آئی۔ سو اپنی قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

جو یاد ہے کبھی تو پوچھنا اپنی خلوت شام سے
کیسے عشق تھا تیری ذات سے کیسے پیار تھا تیرے نام سے

وہ کون تھا جسے تھا تو عزیز تر
جو مر مٹا تیرے نام پہ، جو جی اٹھا تیرے نام سے

نہ وصل کی کبھی چاہ کی نہ ہجر میں کبھی آہ کی
کہ میرا طریقہ بندگی جدا ہے طریق عام سے

بے وفائی کا نہیں ہے گلہ کہ یہی ہے محبتوں کا صلہ
مگر ہوئی ایسی کیا خطا کہ گئے ہم دعا و سلام سے

نمرہ اقرار کے ڈائری سے

استاد قمر جلالوی کی شاعری نے غزل کو ایک نیا لہجہ دیا ہے۔ ان کی یہ غزل دیکھیے۔

ان کی تجلیوں کا اثر کچھ نہ پوچھیے
وہ میرے سامنے تھے مگر کچھ نہ پوچھیے

بجلی جو شاخِ گل پہ گری، اس کا غم نہیں
لیکن وہ اک غریب کا گھر کچھ نہ پوچھیے

ہو ایک راست تو کوئی ڈھونڈے انہیں
کتنی ہیں ان کی راہگزار، کچھ نہ پوچھیے

تنکے وہ نرم نرم سے پھولوں کی چھاؤں میں
کیسا بنا تھا باغ میں گھر، کچھ نہ پوچھیے

بس آپ دیکھ جائیے صورت مریض کی
نبضوں کا حال، دردِ جگر کچھ نہ پوچھیے

جب چاندنی میں آ کے ہوئے تو وہ مہماں
تاروں بھری وہ رات قمر کچھ نہ پوچھیے

ناہید اسماعیل کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل ایک دوست نے لکھ کر بھیجی۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ سوچا آپ کو بھی سنائی جائے۔

ملال ہے مگر اتنا ملال تھوڑی ہے
یہ آنکھ رونے کی شدت سے لال تھوڑی ہے

بس اپنے واسطے ہی فکر مند ہیں سب لوگ
یہاں کسی کو کسی کا خیال تھوڑی ہے

پروں کو کاٹ دیا ہے اُڑان سے پہلے
یہ خوفِ ہجر ہے خوفِ وصال تھوڑی ہے

مزہ تو تب ہے کہ ہار کے بھی ہنستے رہو
ہمیشہ جیت ہی جانا کمال تھوڑی ہے

لگانی پڑتی ہے ڈبکی اُبھرنے سے پہلے
عروج ہونے کا مطلب زوال تھوڑی ہے

☆☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

اعتدال

آج کل اکثر لوگ سبزی خور ہوتے جارہے ہیں اور گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق سبزی خور افراد کے جسم میں وٹامن B12 کی کمی ہوسکتی ہے جو لوگ گوشت کا استعمال نہیں کرتے ان میں کولیسٹرول کم ہوتا ہے۔ وٹامن B12 گوشت، مچھلی، انڈے اور ڈیری مصنوعات میں ہوتا ہے لیکن پھلوں، سبزیوں اور دیگر اناج میں نہیں ہوتا۔ جسم میں اگر وٹامن B12 کی کمی ہوجائے تو اس سے اعصاب کو نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن اس کی علامتیں ظاہر ہونے میں تین سے چار سال لگ سکتے ہیں۔ ابتداء میں ہاتھوں اور پاؤں میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوتی ہیں۔ سبزی خوروں میں ہڈیوں کے فریکچر اور دماغ کی شریان پھٹنے سے فالج کا خطرہ بھی بڑھ سکتا ہے۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ معتدل غذا استعمال کریں۔

معیار

ایک زمانہ تھا جب فلموں میں اداکاری کے لیے خوش شکل اور خوب رو ہونا کامیابی اور شہرت کی دلیل تھی۔ زمانے بدلے تو صرف اداکاری کو ہی قبول عام کی سند ملی، صورت شکل دوسرے درجے پر چلی گئی بلکہ اس کی اہمیت معدوم ہوتی گئی۔

جولیا رابرٹس جیسی اداکارہ جب ہنستی ہیں تو پوری بتیسی نمایاں ہوجاتی ہے لیکن کیسی کمال کی اداکارہ ہے کہ جو بھی کردار کرلے، من موہ لیتی ہے۔

میرل اسٹریپ نے (جسے اس صدی کی سب سے بڑی اداکارہ قرار دیا جارہا ہے) آسکر نامزدگیوں کا ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ شکل از حد معمولی اور چال بے ڈھنگی ہے۔ لیکن جب اسکرین پر نمودار

ہوتی ہے تو وہ اداکاری کی مہارانی ہوجاتی ہے۔

تاہم پہلے جب صرف خوب صورتی پیمانہ معیار تھی، الزبتھ کا حسین دل فریب اور سحر انگیز تھا تو اداکاری بھی کمال تھی۔ رچرڈ برٹن کے بعد الزبتھ ٹیلر نے دو شادیاں کیں لیکن ان شادیوں کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ ان سے میں نے اس لیے شادی کی تاکہ وہ میرا کوٹ اٹھا کر میرے پیچھے چل سکیں۔

خواب

آسکر ایوارڈ یافتہ پاکستانی ہدایت کارہ شرمین عبید چنائے نے گزشتہ دنوں اپنی میشن فلم ستارہ پیش کی۔ ''ستارہ'' کم عمری کی شادی اور لڑکیوں کو ان کے خواب پورے کرنے سے روکے جانے کے متعلق ہے۔ یہ دو بہنوں پری اور مہر کی کہانی ہے۔ فلم میں 1970ء کی دہائی میں لاہور کے مناظر دکھائے گئے ہیں جہاں یہ دونوں بہنیں اپنے چھوٹے سے گھر میں پڑھتی، کھیلتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ دونوں بہنیں بڑی ہوکر پائلٹ بننا

چاہتی ہیں اور روز اپنی چھت پر کاغذ کے جہاز بنا کر اڑاتی ہیں۔ ایک دن اچانک والد بتاتے ہیں کہ انہوں نے چودہ سالہ پری کا رشتہ طے کر دیا ہے، گھر میں کوئی بھی ان کے فیصلے سے خوش نہیں ہوتا۔

فلم اپنے دیکھنے والوں کے ذہنوں پر سوال چھوڑ جاتی ہے کہ آخر لڑکیوں کو کیوں خواب دیکھنے اور اس کی تکمیل سے روکا جاتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ کئی دہائیوں پہلے کی یہ کہانی آج اکیسویں صدی میں بھی دنیا میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی معاشرے میں دہرائی جا رہی ہے۔

زوال

پاکستان میں جب کرکٹ میں بہتری آنے لگتی ہے، چند کھلاڑی کپتان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسے نجم سیٹھی نے پاکستان کرکٹ کو بہتری کے راستے پر چلاتے ہوئے بہت اچھے فیصلے کیے۔ سرفراز احمد کو کپتان بنایا اور سرفراز احمد نے ثابت کیا کہ وہ ایک اچھے کپتان ہیں۔ چیمپئنز ٹرافی جیت کر لائے اور پاکستان کرکٹ میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا پھر سرفراز احمد کے خلاف چند کھلاڑی اٹھے یا اٹھائے گئے اور اب پاکستان کو جیت کے راستے پر چلانے والا کپتان پانی پلا رہا ہے گراؤنڈ میں کھلاڑیوں کو۔ اب فتوحات کا سلسلہ رک سا گیا ہے ہم جیتے ہوئے میچ ہار رہے ہیں لیکن کپتان تبدیل نہیں ہوں گے کیوں کہ وہ چہیتے ہیں (اب یہ ہم نہیں جانتے کس کے)۔

پاکستان ٹیم کے سابق کپتان محمد یوسف نے یونس خان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنے دور کے بہترین کپتان تھے۔ مصباح الحق اچھے سلیکٹر نہیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے پی سی بی میں میرٹ پر فیصلے نہیں ہوتے (آہم وہ تو کھلاڑیوں کی کارکردگی دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے)۔

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ میں نے حسین عورتوں کو عام طور پر بے ضمیر اور لالچی پایا ہے، کم سے کم مجھے تو کسی باضمیر اور بے غرض حسینہ سے ملنے کا آج تک موقع نہیں ملا۔ میں نے کوئی اور کارنامہ انجام دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر ایک کارنامہ ضرور انجام دیا ہے اور وہ یہ کہ میں نے حسین لڑکیوں کو بری طرح ذلیل کیا ہے۔

(جون ایلیا..... فرنود

☆ آنے والے تین چار سال بہت اہم ہیں جب یہ ڈاکیے وغیرہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ سب کچھ ڈرون کریں گے۔ یہ پیٹرول، ڈیزل وغیرہ پانی سے سستے ہوں گے کیونکہ بجلی توانائی اور دیگر ذرائع سے ہر چیز ملے گی اور 2030ء تک یہ مصنوعی ذہانت ہر طرح سے جدید انسانی عقل کے ہم پلہ ہوگی بلکہ انسانی عقل کو پیچھے چھوڑ دے گی۔ لیکن اطوار بتاتے ہیں کہ ہم اس وقت بھی شاید ارطغرل دیکھ رہے ہوں گے۔

(وجاہت علی خان..... ہائیڈ پارک

☆ ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی اختلاف ضرور کریں لیکن اختلاف کو انتقام نہ بنائیں کیونکہ جب انتقام کی آگ ہر طرف پھیل جائے تو پھر دشمن نہیں دوست بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور جب سارے ہی آگ میں جل جائیں تو پھر کوئی کسی سے ملاقات کے قابل نہیں رہتا، پھر صرف بچھتاووں سے ملاقات ہوتی ہے۔

(حامد میر..... قلم کمان)

☆ میں مانتا ہوں، ہر شعبے میں کالی بھیڑیں ہو سکتی ہیں مگر مجھے اس وقت بہت افسوس ہوتا ہے جب ہم بطور قوم نہیں سوچتے بلکہ اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتے ہوئے ہر اس شخص کو مافیا قرار دیتے ہیں جس سے ہمیں شکایت یا اختلاف ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو حقیقی مافیا ہوتے ہیں، ہم ان کا نام تک نہیں لے سکتے۔ ان کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتے۔

(عطاء الحق قاسمی..... روزن دیوار سے)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- هانیه

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

سلمیٰ مسرت.....راولپنڈی

ہم چار بہنیں ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں چھوٹی بہنوں کی شادی ہوچکی ہے۔ والدین کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں بہت خوب صورت وقت گزرا۔ اب شادی کے بعد عمل کا وقت ہے ان کی دی ہوئی بہترین تربیت اور تعلیم ہمارے کام آرہی ہے۔ اللہ کرے ہماری اولاد بھی ہمارے لیے صدقہ جاریہ بنے آمین۔

(1) پڑھنے لکھنے کا شوق نمبرون ہے اردو زبان سے بہت پیار ہے۔ کراچی کالج سے اردو ایڈوانس سے بی اے کیا۔ میرے بنائے ہوئے نوٹس پورے کالج میں مشہور تھے۔ پاکستان کے واحد جزیرے منوڑہ میں بارہ سال میری زندگی کے یادگار سنہری دن ہیں وہ چار دوستوں شبانہ، حمیدہ، فریدہ اور میں ہمارا یہ گروپ شرارتوں میں اور نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش تھا شادی کے بعد میں مستقل پنڈی آگئی اور ابو کی بھی پنجاب سائیڈ پر ٹرانسفر ہوگئی۔ یوں یہ گروپ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ میں نے پڑھائی کے دوران آرمی الشفاء کی لائبریری، رنگون والا ہال کی اور کراچی کالج کی لائبریری سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اگر شادی تھوڑی لیٹ ہوجاتی تو شاید ایک چھوٹی موٹی رائیٹر آپ کو مل جاتی لیکن کوئی بات نہیں یہ کمی آگے چل کر الہدیٰ جوائن کرکے پوری ہوگئی۔ چھوٹے بیٹے کو نرسری میں ڈال کر میں نے قریبی برانچ میں ایڈمیشن لیا اور پندرہ سال الحمدللہ قرآن کو پڑھا اور پڑھایا اب کورونا کی وجہ سے کوئی ایک دوسرے کے گھر نہیں آتا۔ اس لیے میں نے آپ کی (شعاع اور خواتین) محفل کو جوائن کیا ہے تاکہ جو خیر جو اچھے جملے مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا کیے وہ آپ سے شیئر کروں۔

(2) میرے اندر دو تین خامیاں ایسی ہیں جن کو دور کرنے کی کوشش تو بہت کی لیکن لگتا ہے کامیاب نہیں ہوئی، ایک تو میں بولتی بہت زیادہ ہوں حالانکہ کوشش ہوتی ہے کہ اچھی باتیں آگے پہنچاؤں لیکن بے شمار لوگوں کو یہ عادت بری لگتی ہے دوسرے حساس بہت ہوں، مایوسی اور دکھ بہت تیزی سے حملہ کرتے ہیں لیکن سب سے زیادہ قرآن کا کلام ترجمہ تفسیر اور سمیرا حمید، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، رخسانہ نگار اور بے شمار رائیٹرز کی کہانیوں کے اقتباسات مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔

میں شجر ہوں شہر ملال کا میری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی تو بھیج اپنی نوازشیں کسی ابر رحمت میں ڈھال کر

یہ حوصلہ مجھے آپ کے ادارے سے رائیٹرز سے اور قاری بہنوں کے خطوط سے ملا، کیسے کیسے لوگ صبر کے ساتھ بلندیوں پر پہنچتے ہیں اور میرے اللہ کا وعدہ بھی ہے کہ درجے صرف ان کو ملیں گے اور ملے ہیں جنہوں نے صبر کیا۔

تو الحمدللہ میں نے لکھنے کا شوق الھدیٰ میں پورا کیا۔ آن لائن تفسیر تین سیٹ قرآن پاک کے لکھے ہیں۔ تفسیر کے تمام سوالات مع جوابات کے میرے پاس موجود ہیں اور میری ڈائریاں ڈھیروں خوب صورت اقتباسات اشعار سے بھری ہوئی ہیں اگر اللہ نے توفیق دی تو ان شاء اللہ شیئر کرتی رہوں گی۔

(3) سالگرہ برسی وغیرہ منانے کی ہمارے دین میں کوئی روایت نہیں ہے۔ مجھے اپنی سالگرہ منانا بھی پسند نہیں ہے لیکن ہماری زندگیوں میں خوشی اور مل بیٹھنے کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں اس لیے چھوٹے بچے کی پہلی اور چار پانچ سالگرہ اگر گھر والوں کے

ساتھ مل کر منالیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے ابو میری ہر سالگرہ شادی سے پہلے اور بعد میں بھی اس طرح مناتے رہے چاہے چائے کے ساتھ ایک سموسہ اور چھوٹا سا کیک ہی کیوں نہ ہو، ان کی دعائیں ہر سال میرے ہمراہ ہوتی تھیں پھر کالج میں ایک سرپرائزنگ کینٹین اور جمنازیم میں میری دوستوں نے اہتمام کیا اور اب میری بیٹی ہر سال مجھے زبردست طریقے سے وش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب پیاروں کو جزائے خیر دے آمین۔

(4) پسندیدہ اقتباسات سارے خواتین شعاع کے شاہکار ناولوں سے لیے ہیں اور سب کے پاس محفوظ بھی ہوں گے۔ میں آج آپ کو اپنے چند پسندیدہ شعر بتاؤں گی۔

میرے رنج و غم کی حکایتیں ہیں تیرے حضور ہی اے خدا
کبھی آہ میں کبھی اشک میں کبھی چھپ کے اور کبھی برملا

میرے رب کی محبت کا بھی ہے انداز نرالا
سب کچھ دے کر بھی کہتا ہے کوئی مانگنے والا

یہ میرا رنگ و روپ یونہی بے سبب نہیں ہے دوستو
میرے خوشبوؤں سے ہیں سلسلے میری نسبتیں ہیں گلاب سے

پری وہش مری بلوچ..... ضلع کوہلو

1۔ میرا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں (ہائے ہائے) لیکن میں خود ہوں۔ میں بلوچستان کے ایک خوب صورت سے ضلع کوہلو میں رہتی ہوں جو ماشاء اللہ برق رفتاری سے ترقی کی طرف گامزن ہے اور میں چھ بہنوں اور چار بھائیوں کی چھوٹی سی بہن ہوں اس لیے ''منی'' کہلاتی ہوں اور ماشاء اللہ سے پینتیس بھانجوں اور بھتیجوں کی ''آنی'' ہوں۔ تعلیمی قابلیت بی اے ہے۔ ویسے ٹیچنگ بھی کررہی ہوں اور بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتی ہوں۔

فارغ وقت میں ڈائجسٹ پڑھنا اور مطالعہ کرنا، ہاں ٹی وی دیکھنا اور انٹرنیٹ پر مختلف پروگرامز دیکھنا بھی مشاغل میں شامل ہیں۔

2۔ خامیوں کی لسٹ تھوڑی لمبی ہے (معذرت کے ساتھ بقول مہروہش ''سب سے بڑی خامی مجھ سمیت دنیا کی ہر چیز سے تمہیں کام ہے یعنی یہ کرو نہ کرو ساتھ جھگڑنا بھی۔ بقول چھوٹی بھابھی ''غصہ زیادہ کرتی ہوں۔'' بقول اماں جی ''یہ میرے بچوں میں خود غرض ہے۔'' لیکن اماں پہلے یہ کہا کرتی تھیں اب ایسے نہیں کہتیں۔ شاید میں بدل گئی ہوں۔ میری نظر میں میری سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ میں زبان کی بہت کڑوی ہوں۔

خوبیاں: بقول مہر ''دل کی بہت اچھی ہوں اور کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ ہمیشہ اپنے اندر اچھی عادت پیدا کرنے کی کوشش میں رہتی ہوں۔ امی کہتی ہیں، میری لاڈو بہت بہادر ہے اور میری نظر میں خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی کام کرنا ہو کرلوں گی (ان شاء اللہ)

اور بھابھی جی کہتی ہیں ''حقیقت پسند ہو۔''

3۔ خواتین اور شعاع کو باقاعدہ 2013ء سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلی سلسلے وار کہانی سائرہ رضا کی ''اب کر میری رفو گری'' پڑھی اور اس کے بعد شعاع اور خواتین کی تقریباً ساری تحاریر پڑھتی رہی ہوں۔ بدقسمتی سے مکمل اور حالم کے علاوہ (کیوں تو مجھے خود بھی وجہ معلوم نہیں) ہاں ''مصحف'' بھائی نے ڈاؤن لوڈ کرکے دی تو ہم نے پڑھ لی۔ میں کسی بھی کہانی کو نہیں بھولی جو میں نے پڑھی لیکن جس تحریر نے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑا وہ کنیز نبوی کی ''ضمم سے صمد تک'' ہے (کنیز آپی! آپ کا نام میں ہر شمارے میں بے صبری سے تلاشتی ہوں مگر ہنوز نداوارد) موجودہ مصنفات میں جو لمبی قسط بھیجتی ہیں، ان پر بہت زیادہ پیار آتا ہے۔

4۔ میری سالگرہ یوم تکبیر کو آتی ہے یعنی 28 مئی ہے میری یوم پیدائش، سالگرہ منانا تو دور کی بات، مجھے تو یاد تب آتا ہے جب میں ٹی وی پر یوم تکبیر کے حوالے سے دیکھتی ہوں۔

5۔ پسندیدہ شاعر علامہ اقبال، مولانا الطاف حسین حالی اور مفتی تقی عثمانی ہیں۔

سخاوت جیلانی

نمرہ، اقرأ _____ کراچی

میں ہوں حیراں یہ سلسلہ کیا ہے
آئینہ مجھ میں ڈھونڈتا کیا ہے
خود سے بے تاب ہوں نکلنے کو
کوئی بتلائے راستہ کیا ہے

فاکہہ سہیل _____ کراچی

تصور میں بھی جس کی جستجو کرتا ہے دل میرا
اسی سے ہجر میں بھی گفتگو کرتا ہے دل میرا
ندامت سے گنہ گار ہوں پر جو روتی ہیں بھی آنکھیں
انہی پاکیزہ اشکوں سے وضو کرتا ہے دل میرا

نوال افضل گھمن _____ گجرات

گلہ بھی تجھ سے بہت ہے مگر محبت بھی
وہ بات اپنی جگہ ہے یہ بات اپنی جگہ

آسیہ جاوید _____ علی پور چٹھہ

میں منقش ہوں تری روح کی دیواروں پر
تو مٹا سکتا نہیں بھولنے والے مجھ کو

نادیہ یاسر _____ گوجرخان

تماشی اچھی نہیں انکار ہونا چاہیے
یہ تماشا اب سر بازار ہونا چاہیے
خواب کی تعبیر پر اصرار ہے جن کو ابھی
پہلے ان کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

اقصیٰ ناصر _____ گلستان جوہر

ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سارا رات بھر جلتا رہا ہے
عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

ارم کمال _____ فیصل آباد

تیری مجبوریاں درست مگر
تو نے وعدہ کیا تھا یاد تو کر

سیدہ نسبت زہرا _____ کہروڑ پکا

تمہارے لگائے ہوئے زخم کیوں نہیں بھرتے
میرے لگائے ہوئے پیڑ تک سوکھ جاتے ہیں
کوئی تمہارا سفر پر گیا تو پوچھیں گے
کہ ریل گزرے تو ہم ہاتھ کیوں ہلاتے ہیں

گڑیا شاہ _____ کہروڑ پکا

میں سمجھا میری گھٹن مٹانے آیا تھا
وہ پھونکا تو دیا بجھانے آیا تھا

عائشہ _____ گوجرہ

تیز دھوپ میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

فضہ ہلال _____ ڈیفنس گارڈن

زخم دے کر نہ تم درد کی شدت پوچھو
درد تو درد ہے کم کیسا زیادہ کیسا

صدف عمران _____ کے ڈی اے سوسائٹی

تلاش کر میری کمی کو اپنے دل میں
درد ہو تو سمجھ لینا رشتہ اب بھی باقی ہے

سندس مصطفیٰ بخاری _____ خیرپور

چند لمحوں کا ہوا کرتا ہے خوابوں کا سفر
آنکھ کھلتی ہے تو صدیوں کی تھکن ہوتی ہے

عائشہ چوہدری _____ جھڈو

ایک مدت کی ریاضت سے کمائے ہوئے لوگ
کیسے بچھڑے ہیں میرے دل میں سمائے ہوئے لوگ
تجھ کو لے شخص کبھی زیست کی تنہائی میں
یاد آئیں گے ہم، عجلت میں گنوائے ہوئے لوگ

گڑیا راجپوت _____ کراچی

خط کے چھوٹے سے تراشے میں نہیں آئیں گے
غم زیادہ ہیں لفافے میں نہیں آئیں گے
جس طرح آپ نے بیمار سے رخصت لی ہے
صاف لگتا ہے جنازے میں نہیں آئیں گے

بقیہ خط آپ کے

مریم خان.....پھلروان، سرگودھا

سب سے پہلے ''کہنی سنی'' کی طرف چلتے ہیں۔ واقعی ہمیں کسی قائداعظم کی اشد ضرورت ہے۔

آگے پڑھیے ''کرن کرن روشنی'' سے دل کو منور کرتے ذہن میں یہی تھا اگر ہمارے ملکی قوانین اور سزائیں (حدود وتغیرات) قرآن وسنت کے مطابق ہو جائیں تو سارا انظام ٹھیک ہو جائے ملک کا۔

خواتین رائٹرز کی کہانی میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا اس سے بالکل متفق ہیں۔ ''خرم سہیل'' کی کہی گئی آخری لائنوں میں یہ بات ''بس زندگی میں وہ ضرور کریں جو آپ کا دل چاہتا ہے۔'' واقعی دل کو لگی۔ کیونکہ ہمیں بھی لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے کا شوق بچپن سے ہے۔ مگر شادی سے پہلے نصابی اور غیر نصابی کتابوں سے فرصت نہ تھی اور شادی کے بعد کے بکھیڑوں میں سے ٹائم جتنا ملتا ہے، وہ آپ کے رسالوں کے لیے ہے۔ کہانیاں تواتر سے ذہن میں جگہ بناتی ہیں۔ اس وقت شوہر کے ڈر کی وجہ سے لکھ نہیں پاتی۔ (ویسے میرے شوہر ہیں بہت اچھے) اپنے پاس لکھ لکھ کر رکھی ہوئی ہیں کئی کہانیاں بار بار پڑھنے پر بھی کوئی کمی بیشی نظر نہیں آتی۔ (بھئی اپنی لکھی ہوئی ہیں نا) کوثر خالد کی باتیں دل کو لگیں ''ہمارے نام'' میں۔ میری امی بھی ان کی طرح کی ساس ہیں۔

ج: پیاری مریم! کہانیاں شائع کرانے کے لیے ہم سے جان پہچان ضروری نہیں آپ کہانیاں بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ خط شائع نہ ہونے پر دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی وجہ خطوط کا تاخیر سے موصول ہونا ہے۔ صفحات کی مجبوری بھی ہوتی ہے۔

فرزانہ انصاری (گڑیا).....کراچی

اس مرتبہ ماڈل کا نام نہیں تھا۔ پچھلے ماہ بھی ماڈل کا نام ہانیہ لکھا ہوا تھا جبکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں وہ حرا مانی ہے۔ کہنے کا مطلب ہم کتنی باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ حسب معمول سب سے پہلے ''ہمارے نام'' میں پہنچے۔ خطوط سارے بے حد دلچسپ تھے اور آپ جوابات اس سے بھی زبردست، کوثر خالد کو پیار بھرا ان کی دعاؤں کا بے حد شکریہ (نادرہ آپی آپس کی با ہے ان کا جملہ ''فرزانہ تم بھی کمال کی ہو'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا، یہ طنز تھا یا پیار بھرا جملہ، میں سمجھ نہیں پائی ناقص عقل) پتا نہیں کیوں مجھے لگا ''آپ کا باور خانہ'' کوثر خالد کا لکھا ہوا ہے۔ مگر اس پر نام عطیہ بتول لکھا ہے۔ انداز تحریر کوثر خالد کا لگا۔

(میں صرف آپ کو ایک بتانا چاہوں گی جب میں اثرات کے زیر اثر تھی تب بھی میرے لبوں پر درود ابراہیمی، یا اللہ مدد اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ جاری تھا۔ میری بہنوں اور نندوں نے بتایا تھا)

''کہنی سنی'' میں آپ سے سو فیصد متفق ہیں۔ ''رنگ ریز میرے'' کے لیے کوئی اعتذار قبول نہیں۔ نا بھئی آپ سے ناراضی۔ (پیار بھری)

مکمل ناول ''من کا پپیہا'' (گل ارباب) اول تا آخر دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔

''عذاب، سراب گلاب'' بھی اچھا ناول ہے۔ یہ پڑھ کر میں نے سیکھا صبر رائیگاں نہیں جاتا۔ حنا بشری کا ''انوکھا لاڈلا'' واقعی انوکھا ہے۔

ہمارے نام میں سب کے خط بہت محبت اور توجہ سے پڑھتی ہوں۔ اس مرتبہ گوشی جمال کا خط بیسٹ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد اپنے گھر کا کرے اور ان کے نصیب اچھے کرے۔ (آمین)

نادرہ آپی کافی دن سے ثمینہ اکرم صاحبہ کا خط نہیں آیا۔ ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ فاخرہ جبیں اور فائزہ بھٹی کے افسانے اچھے تھے مگر کچھ اداس اداس سا کر گئے۔ ہماری فشین نعیم کہاں ہیں؟ فشین کوئی ہنستا مسکراتا ناول لکھنا۔ آپ سے کہنا چاہوں گی تھوڑے ہلکے پھلکے ہنستے مسکراتے ناول شامل کریں۔ اتنی ٹینشن ہے زندگی میں۔ ڈائجسٹ میں افسردہ کہانیاں پڑھ کر اور دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ راحت جبیں تو تتلی، پھولوں، موسم، بارش کی باتیں کرتی تھیں وہ کہاں گئیں۔

اس مرتبہ میرے دونوں بچوں نے بہت مشکل سے مجھے ڈائجسٹ مکمل کرنے دیا ہے۔ اسکولوں کی چھٹی کی وجہ سے حسن کو تو ایک بجے تک سونا ہے (جب تک وہ سو نہ جائے اس کے سوال ختم نہیں ہوتے) حذیفہ نے پچھلے ایک ماہ سے رات ڈھائی سے تین بج تک سونے کی روٹین بنالی (وہ شام میں سوجاتا ہے نا) میں ترستی رہتی ہوں سونے کے لیے۔ چار بجے ان کے پاپا آتے ہیں شاپ پر سے، سوتے سوتے چھ بج جاتے ہیں۔ صبح وہی دس، گیارہ بجے اٹھ جاتی ہوں۔ اللہ کرے جلد سے جلد اسکول کھلیں اور ہماری روٹین ٹھیک ہو۔

ج: پیاری فرزانہ! اللہ آپ کو خوش وخرم رکھے۔ آپ نے وقت نکال کر اتنا طویل خط لکھا۔ بہت خوشی ہوئی کہ اب آپ صحت مند ہیں۔ کوثر خالد بہت سادہ اور میٹھی طبیعت کی مالک ہیں۔ انہوں نے پیار میں ہی لکھا تھا۔ طنز تو وہ کر ہی نہیں سکتیں۔

سمارا انعم بھٹی.....ڈیرہ غازی خان

''کرن کرن روشنی'' کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔ ''ہمارے نام'' میں گوشی جمال کی آمد بہترین لگی۔ کسی کرکٹر کی فرمائش کی تھی انٹرویو کی آپ نے جسے درخواست نہ جانا اور میں بیچاری محض آہ بھر کر رہ جاتی ہوں۔ آہ سے یاد آیا، آنٹی میری تحریریں آپ کے پاس ہیں۔ پلیز پلیز پلیز اس کے بارے میں بتادیں بہرحال اب واپس شمارے کی سمت آتی ہوں۔

''خواتین رائٹرز کی کہانی'' عمار مسعود صاحب کا تبصرہ بہترین لگا۔

''تتلی جیسا پیار'' بہترین جارہی ہے لیکن مجھے اس کی اقساط کچھ زیادہ نظر نہیں آئیں ''ہارے بھی تو بازی'' شازیہ جمال کی تحریر میں خواتین کا پرانا رنگ نظر آیا۔

جہاں تلک معیار کی بات ہے تو میری رائے میں خواتین کا معیار پہلے سے کافی بڑھ چکا ہے۔ پرانے شماروں کی تحریریں بھی پڑھی ہیں۔ لیکن آج کل کی رائٹر بہت آگے کی چیز ہیں۔ جن میں سرفہرست نمرہ احمد، عمیرہ احمد، سمیرا حمید، سائرہ رضا ہیں۔

اس مرتبہ افسانے نئی نویلی مصنفات کے لکھے ہوئے تھے جن میں سب سے زیادہ پسند ''بیٹی کے نام'' فائزہ بھٹی کا پسند آیا۔

''قصہ ایک ساون کا'' کیا یہ فاخرہ جی کا پرانا افسانہ تھا ''خواب سفر'' شازیہ الطاف ہاشمی تو افسانے لکھنے کی ماہر ہیں۔ مستقل سلسلوں میں ''نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'' عدنان بھائی کو سلام، بہترین راہنمائی کرتے ہیں۔

ج: پیاری سمارا! آپ اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کے افسانے زیر غور کی فہرست میں تھے۔ آپ لکھنا جاری رکھیں بلکہ ایسا کریں کہ اگر آپ اپنے ان ہی افسانوں کو دوبارہ لکھ کر بھجوائیں تو یہ مزید بہتر ہوجائیں گے۔ جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔

رابعہ علی.....پتوکی

ماڈل پر نظر ڈالی۔ ارادہ تو سرسری نظر کا تھا لیکن ماڈل کے مسکرانے کا انداز اتنا خوب صورت تھا کہ دوبارہ غور سے دیکھنا پڑا۔ سب سے پہلے ''کرن کرن روشنی'' سے دل کو منور کیا پھر آگئے اپنے پسندیدہ سلسلے ''ہمارے نام'' پر۔ پہلا خط ہاجرہ عمران کا تھا۔ پڑھ کے افسوس ہونے لگا کہ اگست کا شمارہ کیوں نہ ملا ہمیں۔ ہم فرزانہ کھرل کی اسٹوری پڑھنے سے محروم رہ گئے۔ زینب نور آپ کا باورچی خانہ بھی نہ پڑھ سکے۔ لیکن آپ کا خط پڑھ کے وہ کمی پوری ہوگئی۔ آپ بہت اپنی اپنی سی لگتی ہیں۔ فرزانہ انصاری اللہ پاک آپ کی مشکلات دور فرمائے، آمین۔ ماہا اور تبسم کہاں ہو تم دونوں؟

اب باری آتی ہے کہانیوں کی تو سب سے پہلے فائزہ بھٹی کا افسانہ ''بیٹی کے نام'' پڑھا۔ پڑھ کے حالت غیر ہوگئی۔ اتنا حساس ٹاپک اور کیسے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ فائزہ! اتنی اچھی اسٹوری پر بہت بہت مبارک باد۔ میری موسٹ فیورٹ رائٹرز شازیہ جمال طارق لیکن یہ کیا، یہ تو ایک گھریلو سیاست کی اسٹوری ہے۔ آپ اپنے ہلکے پھلکے رومانس میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ''عذاب، سراب، گلاب'' سحر قریشی اسٹوری اچھی تھی لیکن عطو میں تو عزت نفس نام کو بھی نہیں تھی۔

گوشی جمال! میں آپ کا درد اچھے سے سمجھ سکتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو قدر کرنے والا جیون ساتھی عطا

فرمائے، آمین۔

☆ پیاری رابعہ! آپ ہماری محفل میں تشریف لائیں، بہت خوشی ہوئی۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ ہمارا پرچا باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہیں۔ آپ کو اگست کا شمارہ نہیں مل سکا تو آپ ہمارے واٹس ایپ نمبر پر میسج کریں۔ آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل جائے گا، واٹس ایپ نمبر یہ ہے۔ 0317-2266944۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنا ایڈریس بھجوادیں۔ ہم آپ کو پرچا وی پی کردیں گے۔ آپ ڈاکیہ کو سو روپے دیتا ہوں گے۔

فائزہ امین مصطفیٰ آباد، ضلع قصور

''خواب نگر'' پڑھا اچھا لگا رہا۔ ''تلافی'' بس ٹھیک ہی تھا۔ ''ہار بھی بازی لو مات نہیں'' زبردست۔ ابا نے صاحب زادے کی اماں کے خلاف جا کر تیر نشانے پر لگایا اور ارمان کی مراد پوری کی۔ ''عذاب، سراب، گلاب'' ہم پہلے پڑھ چکے تھے۔ شعاع میں اس لیے آگے چھلانگ لگائی، اب یہ بھی سن لیں کہ ہم نے شعاع میں کیسے پڑھ لی تو جناب ہوا یہ کہ ہم نے بک شاپ سے پرچا خریدا۔ پھر آ کر ہم نے جو پڑھنا شروع کیا تو یہ کیا کسی کا اینڈ نہیں تو کسی کا شروع ہی نہیں۔ ہائے بہن دکھ ہوا، ایک گھنٹہ کی مسافت پر بازار ہے، دوسرے دن بھابھی کو ساتھ لیا۔ گھنٹے کی مسافر طے کی، شاپ والوں سے کہا کہ آپ نے ہمیں شعاع غلط دیا ہے۔ انہوں نے آگے سے ارشاد فرمایا، جیسا ہمارے پاس آیا ہے ویسے آپ کو دیا ہے۔ ہم نے بک شاپ پر سارے شعاع چیک کیے کہ شاید یہ ہی غلط ہو باقی ٹھیک ہوں لیکن سب ہی ایک جیسے تھے۔ اور پھر گرمی بہت محسوس ہوئی اور تھکاوٹ بھی۔ اوپر سے بھابھی کہنے لگیں، کوئی پوچھے بازار لینے کیا گئی تھیں تو کیا جواب دو گی۔ پہلے ہی صبر کر کے ایسے ہی پڑھ لیتیں، ہاہاہا۔ لو جی میرے پیسے لگ گئے اور شعاع بھی ٹھیک نہیں۔ آج کل تو مجھ پر ویسے بھی بہت غربت مہربان ہے اور پھر سے نازنین کا نام فہرست میں دیکھا لیکن کہانی ہے ہی نہیں تو آپ اندازہ لگائیں میرے دکھ کا (ہو ہو ہو)۔ تو اس طرح ہم نے یہ کہانی پڑھ رکھی تھی۔ پھر پڑھا ''من کا پپیہا'' بھی کچھ ہم نے شعاع میں پڑھ لی تھی، اس لیے شروع سے چھوڑ کر آگے پڑھی۔ گل ارباب زبردست اسٹوری اس کے بعد پڑھی ''بیٹی کے نام'' آہ فائزہ بھئی کہاں بیٹھ کر یہ اسٹوری لکھی اور مجھے خط لکھنے پر مجبور بھی بیٹی کے نام اور اک ساون کے قصے نے کیا۔ میں نے بھابیوں کو بھی پڑھنے کو دی، وہ ڈائجسٹ نہیں پڑھتیں۔ انہوں نے خود بھی پڑھی اور پھر اپنے شوہروں کو بھی پڑھ کر سنائی۔ ہمارے تو بڑے بھیا بھی رو پڑے تھے، اب یہ نہ سمجھیں کہ میرے بھائیوں کو پڑھنا نہیں آتا۔ فائزہ آپ کی فین تو پہلے ہی تھی اب تو آپ نے مجھے اپنا پکا مرید بنالیا ہے۔ سچ بتاؤں تو میں ہمارے نام میں پہلے تو آپ، تبسم بشیر حسین ڈنگہ، آنٹی کوثر اور فریال کے نام دیکھ کر پھر پہلے آپ کے خط پڑھتی ہوں اور بخاری سسٹرز کے۔ اس کے بعد دوسروں کے۔ دیکھیے ہماری محبت اور آپ ہمیں صاحب مصنف ہونے پر مٹھائی تو کھلائیں۔

فائزہ! ہمیں آپ سے بھی ملنے کا بہت شوق ہے لیکن پتو کی اتنی دور اور دور کا سفر سوچ کے ہی ہمیں پتا نہیں کیا کیا ہوتا ہے، ہمارے لیے پتو کی سے ایک پروپوزل آیا تھا اور ہم نے اسی وجہ سے انکار کردیا کہ بہت دور ہے اور سسٹر کا کہنا ہے کہ وہاں بہت بڑی نرسری ہے پھولوں کی اور میں پھولوں کی دیوانی تو میں نے کہا، ان صاحب کی تو ہے اور انہوں نے ہمیں منہ دکھائی میں وہ ہی تو دینی ہے ہاہاہا۔ نہ بابا نہ، ہمیں نہیں منظور۔

☆ پیاری فائزہ! آپ کی محبت اور معصومیت پہ بے ساختہ پیار آیا اور افسوس بھی ہوا کہ آپ نے اتنے پیسے خرچ کیے، دھوپ، گرمی برداشت کی پھر بھی شعاع حاصل نہ کرسکیں۔

بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔ آپ ہمارے واٹس ایپ نمبر پر میسج کریں، وہ آپ کو درست پرچا بھجوادیں گے، نمبر یہ ہے۔

0317-2266944

اور بھئی پتو کی اتنا دور تو نہیں کہ آپ نے پھولوں کی نرسری والے شہر جانے سے انکار کردیا۔ منہ دکھائی میں پوری نرسری نہ سہی، کچھ پھول تو مل ہی جاتے۔

رضوانہ شکیل راؤ.....لودھراں

ٹائٹل پر غالباً ڈولی تھی۔ اچھی لگ رہی تھی۔ خوب صورت جیولری اور میک اپ کے ساتھ۔ ''کرن کرن روشنی'' پڑھ کر واقعی ہم خود کو اندر سے روشن محسوس کرتے ہیں۔ انشاء جی کی ''خاموش رہو'' سن کر ہم دھیرے سے آگے بڑھے۔ احمد طہٰ غنی کی باتیں اچھی تھیں۔ ہمارے نام میں کوثر خالد کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ کی مخلوق ہر رنگ میں ہیں، کہیں ساس بہت اچھی تو کہیں بہو۔ اگر دونوں میں اتفاق ہو تو کیا ہی کہنے۔ زینب نور بھئی ہمیں تو آپ کا کچن بہت اچھا لگا سب جوابات بھی۔ کسی کو کچھ بھی لگا ہو، آپ کی معصومیت آپ کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ ریحانہ جی آپ کے مولی والے پراٹھے چھا گئے بھئی۔ مولیاں آنے دیں، ہم ضرور ٹرائی کریں گے۔ گوشی جمال واقعی آپ کا خط تو پورا ایک افسانہ تھا۔ ٹرائی کریں رائٹر بننے کے جراثیم آپ میں ہیں۔ ''خواب سفر'' شازیہ الطاف کا افسانہ اچھا تھا۔ عطیہ بتول کا باورچی خانہ بہت سمپل تھا لیکن مجھے اچھا لگا۔ صبا قمر کا تفصیلی انٹرویو لیں۔

☆ پیاری رضوانہ! آپ کا باورچی خانہ کوثر خالد نے لکھا تھا۔ سہو اس پر عطیہ بتول کا نام لکھا گیا۔ اس سہو کے لیے ہم کوثر خالد سے معذرت خواہ ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

گوشی جمال.....منڈی بزمان

اس دفعہ ٹائٹل کی کلر اسکیم پھیکی پھیکی تھی لیکن ماڈل دلہن کے روپ میں پیاری لگ رہی تھی۔ بیگ گراؤنڈ کلر اسکیم ایک ہی کلر میں ہوتا تو زیادہ بہتر لگتا۔ ''کرن کرن روشنی'' کے لیے شاید میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، اللہ کرے ہمیشہ یہ سلسلہ جاری ہے۔ احمد طہٰ غنی، تازہ ہوا کا جھونکا باتیں بھی عمدہ۔ کبھی کبھی اس طرح کے تازہ جھونکے طبیعت کو معطر کر جاتے ہیں۔ اس دفعہ ''خواتین رائٹر کی کہانی'' عمار مسعود زندہ باد۔ کیا آگاہی دی آپ نے، پڑھ کر آنکھیں کھل گئیں بہت سے لوگوں کی۔ ڈاکٹر کرن نذیر کا مقالہ واقعی حقیقت پر مبنی تھا۔ حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ۔ افسانہ لکھنے کے بارے میں سوچ بچار جاری ہے۔ میں اپنے شہر کے نام کی درستگی کر دوں منڈی یزمان ہے۔ آپ نے منڈی ماناں لکھ دیا۔

''رنگ ریز میرے'' کی قسط نہ پا کر دل بہت اداس ہو گیا۔ چلو ایک ماہ اور انتظار سہی۔ میرا ٹائم تو ایسے جھٹ پٹ گھر کے کاموں میں گزر جاتا ہے۔ اپنے بارے میں سوچنے کا بھی ٹائم نہیں ملتا۔ گھر کے بکھیڑوں کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ ایم اے بھی جاری ہے کہ اماں فخر سے کسی کو کہہ سکیں گی لڑکی ایم اے پاس ہے۔ ویسے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے شکل وصورت تینوں بہنوں سے اچھی پائی ہے اور رنگ بھی صاف ہے ورنہ جتنا چولہے میں منہ جھونکے رکھتی ہوں، رات بھی شرما جاتی۔

استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ ''موسم کے پکوان'' صرف میں نے پڑھنا ہوتا ہے، کوشش ہوتی ہے گھر میں چھوٹا بھائی یا آپا نہ پڑھ لیں ورنہ جو سب سے مشکل اور زیادہ ٹائم والی ریسپیز ہوتی ہیں وہ میرے گلے فٹ۔ پھر اماں کا فرمان ہوتا ہے لکڑی والے چولہے پر بناؤ، ذائقہ زیادہ آتا ہے۔ ان کے ذائقوں میں میرا کباڑ ہو جاتا ہے۔ ''نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'' پڑھا۔ عدنان بھائی اللہ آپ کو بھی اجر دے۔

''بیوٹی بکس'' کے بغیر تو ہمارا جریدہ نامکمل ہے۔ زندہ باد امت الصبور۔ میں نے اس دفعہ کا آپ کا بنایا ہوا اسکرب بنا کر لگایا، میری اسکن لشکارے مار رہی ہے۔

☆ پیاری گوشی! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ افسانہ لکھنے کے بارے میں آپ سوچ بچار کر رہی ہیں۔ ہماری مانیں تو سوچ بچار کو چھوڑیں اور جو آپ کے اردگرد کردار ہیں، اماں، آپا اور بھابھیاں وغیرہ ان ہی پہ لکھ دیں۔ یقین جانیں، بہت پسند کیا جائے گا۔

یہ اچھی بات ہے کہ آپ اب خود پہ توجہ دے رہی ہیں۔ بیوٹی باکس کے نسخے بہت سادہ ہوتے ہیں آپ ان پر آسانی سے عمل کر سکتی ہیں۔

گل.....مردان

ستمبر کا شمارہ بہت لیٹ ملا۔ اسلام آباد کا چکر لگا تو

وہاں سے لے آئی۔ 12 تاریخ تک مردان میں خواتین عدم دستیاب تھا۔ برائے مہربانی خواتین کی جلد دستیابی کو یقینی بنائیں۔

☆ گل! ان شاء اللہ آپ کی شکایت دور ہو جائے گی، ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری قارئین تک پرچا وقت پر پہنچ جائے۔ آپ کا باورچی خانہ موصول ہو گیا ہے۔ اس ماہ شامل ہے۔

ظلم ہما.....لاہور

خواتین اور شعاع ہمیشہ کی طرح ٹاپ آف لسٹ رہے۔ آج کل اداریے میں آپ کی پیاری پیاری باتیں پڑھنے کے بعد سب سے زیادہ خواہش ''وہ نازنین'' اور ''تتلی جیسا پیار'' پڑھنے کی ہوتی ہے۔ فرح بخاری اور راحت جبیں کو میری طرف سے بہت مبارک باد اور ڈھیر سارا پیار۔

نئی رائٹرز میں گل ارباب یقیناً ایک اعلا اضافہ ثابت ہونے والی ہیں۔ کچھ ماہ پہلے انہوں نے ایک لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بننے والے لڑکے کی جو کہانی لکھی تھی 'زبردست تھی۔

ناول، تین افسانے اور سب سے بڑی بات اپنی پندرہ سالہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں گزاری گئی زندگی کا نچوڑ آپ کو نیم مزاحیہ انداز میں لکھ کر بھیجا۔ چوہدری ہاؤس کی شکل میں لیکن جناب آپ کی طرف سے مکمل خاموشی۔

☆ پیاری ظلم ہما! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی، اس کے لیے شکریہ۔ آپ کی پچھلی کہانیاں شائع نہ ہو سکیں۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن یہ بات ضرور ہے کہ آپ میں صلاحیت ہے۔ تھوڑی محنت کی ضرورت ہے۔ حالیہ کہانی پڑھی نہیں۔

زرتاشیہ نعمان.....ملتان

ستمبر کا شمارہ چودہ تاریخ کو ملا اور یقین مانیں دوسرے دن ہی پڑھ کے کاغذ، قلم سنبھال لیا۔ تبصرہ لکھنے کے لیے..... فاخرہ جبیں ''قصہ ایک ساون کا'' ایک درد بھری تحریر لائیں۔ ''خواب سفر'' اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ باقی تمام افسانے بھی بہت خوب صورتی سے لکھے گئے تھے۔ مکمل ناول ''من کا پپیہا'' بہت اچھا لگا۔ آخر میں آنٹی ر۔ خالد کا ذکر کرنا چاہوں گی جو کسی بھی بہتر افسانے سے کم نہیں تھا۔ اف ان کا یہ لکھنا ''جس نے دینا ہے، گھر بھیجے ورنہ خود کھالے'' پڑھ کے لطف ہی آ گیا اور زینب نور (جہانیاں) کا میرا خط پسند کرنے کا بے شکریہ۔

☆ پیاری زرتاشیہ! پرچا تاخیر سے ملنے کی شکایت ہماری بہت سی قارئین نے کی ہے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ پرچا بروقت آپ تک پہنچا سکیں۔ محفل میں شرکت کے لیے شکریہ۔

عظمیٰ عبدالمجید سیٹھی.....ٹاؤن پشاور

ارادہ اور خیال تو مدت سے آدھی ملاقات کا تھا لیکن ہمارا بھی وہی حال ہے کہ ''جو فارغ ہوتے ہیں دراصل وہیں زیادہ مصروف ہوتے ہیں'' گریجویشن کر کے گھر بیٹھے خیالوں میں ماسٹرز ان اردو ادب کی تیاری کر رہے ہیں جو پتا نہیں کب سستی سے نکل کر حقیقت کا روپ دھارے گی۔

اپنا باقاعدہ تعلق ''یارم'' کے وقت سے جڑا جو کہ کالج دوست سے لیے گئے ڈائجسٹ میں تیسری قسط کچھ یوں اثر پذیر ہوئی کہ اس کے بعد آپ کے تینوں پرچوں کی خریداری ہم سے قضا نہ ہوئی۔ تحریریں ساری مصنفین محنت سے ہی لکھتی ہیں، اس لیے ہم کھلم کھلا کسی پہ تنقید کو اتنا اچھا نہیں گردانتے۔

لکھنے پڑھنے کی طرف دھیان روایتی جملے کے مطابق بچپن سے اس لیے تھا کہ بابا اخبار سے منسلک ہیں تو تقریباً کے پی کے سارے اخبارات اور اکثر و بیشتر اخبار جہاں ہمارے گھر آتا تھا تو ذوق پڑھنے کا بہتر سے بہتر ہوتا گیا۔

☆ پیاری عظمیٰ! آپ کے خط سے لگتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ زبان و بیان بھی ٹھیک ہے۔ اگر کہانی بھی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہو گی۔ اچھے لکھنے والوں کی تو ہمیں بھی تلاش رہتی ہے۔

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

گل مردان

ویلکم، ویلکم، ویلکم گل کے کچن میں ویلکم!

جی جناب! تو یہ ہے میرا پیارا سا کچن جس کی کھڑکی باہر صحن میں کھلتی ہے اور کھڑکی کے اوپر انگور کی بیل نے ایک چھاؤں سی کی ہوئی ہے۔ کھڑکی کے نیچے کچھ آب خورے اور دانے کے برتن بھی رکھے ہیں۔ صبح ناشتہ بناتے وقت میں کھڑکی کھول دیتی ہوں کیونکہ باہر چڑیوں کی چہکار نے سماں سا باندھا ہوتا ہے۔ سو صبح ناشتہ بھی بناتے جاؤ اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے بھی لطف اٹھاؤ۔ سبحان اللہ۔

س ''کھانا پکاتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟''

ج ''کھانا پکاتے وقت تو سب سے پہلے پسند ناپسند کا خیال رکھتی ہوں۔ صحت اور غذائیت کا خیال خود بخود ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم گاؤں کے رہنے والوں کی خوراک سادہ سی ہوتی ہے۔ تازہ سبزیاں جو کہ کم مرچ مسالوں اور ہلکے آئل کے ساتھ پکتی ہیں۔ خالص گندم کی روٹی، گھر کا بنا دہی، لچی لسی، فاسٹ فوڈ اور چائنیز وغیرہ سے نام کی حد تک ہی واقفیت ہے۔''

ہمارے گھر سبزی، گوشت اور چاول سب ترتیب سے بنتے ہیں۔ اگر ایک دن سبزی بناؤں تو اگلے دن گوشت بنے گا اور اگر گوشت کا سالن بچ جائے تو اسی میں چاول بنا لیتی ہوں۔

دال ہمارے ہاں متنازعہ ڈش ہے میاں جی کو چنے کی دال منع ہے جبکہ بے بے کو ماش کی دال نہیں پسند، اس لیے دال کم کم ہی بنتی ہے۔ البتہ چاول پر سب کا اتفاق ہے سوائے طلال کے، جس دن چاول بناؤں اس دن طلال کے لیے الگ سے روٹی بناتی ہوں۔ (اب یہ الگ بات ہے کہ اگر آس پڑوس سے چاول کی پلیٹ آ جائے تو وہ صرف اور صرف طلال نے کھانے ہوتے ہیں۔)

س ''کھانے کا وقت ہے اور مہمان اچانک آ جائیں تو کوئی ایسی ڈش جو فوراً بن جائے؟''

ج ''بقول میری امی کے وہ زمانے گئے کہ جب عین کھانے کے وقت مہمان آ جائے اور سالن کم ہوتا تو جلدی جلدی پیاز ٹماٹر ڈال کر انڈوں کا خاگینہ بنا لیا جاتا۔ ساتھ میں دیسی گھی کو گرم کر کے اس میں شکر ڈال دی اور لسی کو ٹھنڈا کر کے مہمانوں کو کھانا چن دیا اور مہمان بھی خوشی خوشی صبر شکر کر کے کھا لیتے تھے۔''

مگر نہ جی نہ اب تو سب کو پتا ہے کہ اب ہر نکڑ والی دوکان پر چکن دستیاب ہے۔ تو جی ہمارے ہاں تو ہر دو قسم کے مہمان آتے ہیں بتا کر آنے والے بھی اور اچانک آنے والے بھی اور ہر دو قسم کے مہمانوں کے لیے چکن کڑاہی اور چاول لازمی بنتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو بتا کر آتے ہیں تو ان کے لیے ایک دو ڈشز اضافی بنتی ہیں خواہ وہ سبزی ہو یا بیف میں کباب یا کوفتہ کی کوئی ڈش، ہاں سردیوں میں میٹھے میں حلوہ بناتی ہوں۔ جو کہ بے حد آسان سے ترکیب حاضر ہے۔

کھوپرے کا حلوہ

کھوپرا، کش کیا ہوا	دو کپ
سوجی	چوتھائی کپ
انڈے	دو عدد
گھی	ایک کپ
چینی	آدھا کپ
الائچی	چار سے پانچ دانے
بادام، اخروٹ، کشمش	حسب پسند

ایک کھلے برتن میں کش کیا ہوا کھوپرا، سوجی انڈے اور میوہ جات کو اچھی طرح ہاتھ سے مکس کر لیں۔

اب کڑاہی میں گھی گرم کر کے چینی کو براؤن کر لیں ساتھ میں الائچی ڈال کر کڑکڑائیں، کڑاہی کو چولہے سے اتار لیں اور کھوپرے والا مکسچر ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ کڑاہی کو دوبارہ چولہے پر رکھ دیں اور درمیانی آنچ پر دس منٹ تک بھون لیں۔ مزیدار حلوہ تیار ہے۔

ویسے یہ میں زیادہ ترحج وعمرہ پر جانے والے عزیز رشتہ داروں کے لیے بناتی ہوں۔ اس کے بے حد فوائد ہیں۔ ایک تو یہ توانائی بخش ہے بھوک مٹاتا ہے اور خراب بھی نہیں ہوتا۔ اسے چائے کے ساتھ بھی لے سکتے ہیں اور بغیر چائے کے بھی۔

س ''صبح کا ناشتہ کیا بناتی ہیں؟ کوئی خاص چیز؟''

ج ''گرمی ہو یا سردی ہمارے ہاں ایک ہی قسم کا ناشتہ ہوتا ہے چائے پراٹھا۔ اس کے بغیر ناشتے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ پاپے، رسک، ڈبل روٹی، بسکٹ، ان کا ہمارے یہاں ناشتے میں کوئی رواج نہیں۔ اسی طرح نہاری پائے وغیرہ کا ناشتہ بھی کبھی نہیں کیا۔ ہاں البتہ حلوہ پوری اور شیر خورمہ عید کے عید یا پھر سردیوں میں کوئی فرمائش کرے تو پھر بنتا ہے۔''

بے بے دودھ پتی کے ساتھ ہلکے آئل والا خمیری پراٹھا لیتی ہیں۔ میاں جی صبح ناشتے میں سالن اور مکھن شوق سے کھاتے ہیں۔

ہم نے گھر کے اوپر والے پورشن میں مرغیاں رکھی ہیں۔ تو دیسی انڈوں کی سہولت موجود ہے۔ تو بچوں کے لیے کبھی فرائی انڈہ یا پھر آملیٹ بناتی ہوں۔ ویسے میرے ہاتھ کا بنا آملیٹ میرے سسرال میں کافی مشہور ہے۔ خاص کر میری نند کے بچے میرے ہاتھ کے بنے آملیٹ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سنہرا، خستہ پھولا پھولا آملیٹ۔ یہ ماریہ کے الفاظ ہیں اور بقول پنکی کے ٹوٹا نہیں گول اور پتلا۔

س ''کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟''

ج ''کچن کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہوں۔ جیسے ایک ماں اپنے لاڈلے بچے کو نہلا دھلا کر سجا سنوار کر رکھتی ہے بالکل اسی طرح میں اپنے کچن کو دھو دھلا کر صاف ستھرا رکھتی ہوں۔ بقول میری باجی کے تمہارا کچن دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔''

میں اپنے کچن میں غیر ضروری سامان مثلاً ڈبے، جار، برتن وغیرہ نہیں رکھتی کہ کچن کو کچن لگنا چاہیے اسٹور نہیں۔ غیر ضروری اور فالتو سامان سے وسیع کچن بھی تنگ پڑ جاتا ہے جبکہ ترتیب اور صفائی سے چھوٹا کچن بھی کشادہ لگتا ہے۔

اسی طرح جب پتی، نمک، مرچ کے ڈبے خالی ہو جائیں تو انہیں اچھی طرح سے دھو کر خشک کر کے نیا نمک مسالہ ڈالتی ہوں۔ ناشتہ کھانے کے برتن بھی ہاتھ کے ہاتھ دھوئے جاتے ہیں میری عادت ہے کہ توے پر روٹی ڈالی ہے اور ادھر سنک میں گندا کپ یا گلاس وغیرہ دیکھ لیا تو آنچ دھیمی کر کے اسے دھو لیتی ہوں۔ اس لیے میرا سنک بھی ہمیشہ صاف ستھرا ملے گا۔

س ''آپ مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟''

ج ''خاص کھانا کھانے کے لیے تو نہیں جاتے ہاں اگر شاپنگ پر جائیں اور کھانے کا ٹائم ہو تو کھا لیتے ہیں یا پھر آئس کریم، فالودہ جس چیز کا موڈ بن جائے اور جو بچے فرمائش کریں۔ مطلب کچھ نہ کچھ کھا پی کر ہی ہماری شاپنگ مکمل ہوتی ہے اور آپس کی بات ہے میں تو جاتی ہی اسی شرط پر ہوں کہ کھانا باہر کھائیں گے۔ بھئی گھر میں پکا پکا کر کھلا کھلا کر ہم بھی تھک جاتے ہیں تو روٹین سے ہٹ کر تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

س ''کھانا پکاتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟''

ج ''ویسے تو ہمارے ہاں زیادہ تر موسمی سبزیاں ہی بنتی ہیں۔ لیکن گرمیوں میں گوشت کا استعمال کم کر دیتے ہیں اور کچی لسی کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ ہاں نمکین لسی سردی گرمی دونوں میں چلتی ہے۔ نومبر شروع ہوتے ہی بچے سوپ کی فرمائش کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح میاں جی کو مچھلی مرغوب ہے جبکہ بے بے کو گاجر کا حلوہ اور کھیر بھی سردیوں میں بہت مزہ دیتی ہے گرم گرم کبھی ٹرائی کر کے دیکھئے گا۔''

س ''اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟''

ج ''بھئی ہر کام میں محنت درکار ہوتی ہے۔ چاہے وہ کھانا پکانا ہو سلائی کڑھائی ہو یا کوئی اور کام لیکن میرا ذاتی خیال تجربہ اور تجزیہ ہے کہ جو بھی کام کریں اچھے موڈ کے ساتھ کریں تو سب کچھ اچھا ہوگا۔ برے موڈ کے ساتھ بوجھ سمجھ کر کیے جانے والا کام بگڑ جاتا ہے۔''

☆☆

موسم کے پکوان

خالدہ جمیلانی

بیف بالچاؤ

اجزاء:۔

تیل	ایک چوتھائی کپ
گوشت انڈر کٹ	آدھا کلو
پانی	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
ثابت لال مرچ	چھ سے سات عدد
لونگ	چھ سے سات عدد
لہسن	چار سے پانچ جوئے
ادرک	ایک درمیانہ ٹکڑا
دارچینی	ایک درمیانہ ٹکڑا
ثابت کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت زیرہ	آدھا کھانے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔

پہلے ایک فرائی پین میں دار چینی، ثابت لال مرچ، لونگ، زیرہ، ثابت کالی مرچ کو ہلکا سا بھونیں اور ـــ پیس ـــ کر پاؤڈر بنالیں۔ اب الگ کڑاہی میں تیل گرم کرکے کٹی ادرک اور لہسن شامل کرکے اتنا بھونیں کہ کچا پن دور ہوجائے۔ پھر پسے ہوئے مسالے کو اس میں شامل کردیں۔ ساتھ ہی بیف انڈر کٹ کے چھوٹے کٹے ہوئے ٹکڑے اور ہلدی شامل کرکے پانچ سے چھ منٹ تک بھونیں پھر اس میں ایک کپ پانی، ٹماٹر پیسٹ اور پسی لال مرچ ڈال کر ڈھک دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس دوران ایک الگ برتن میں باقی بچے تیل میں ایک عدد پیاز کاٹ کر سنہرا کرلیں۔ پھر اسے نکال کر ہاتھ کی مدد سے چورا کرلیں۔ پندرہ سے بیس منٹ بعد کڑاہی کا ڈھکن ہٹا کر چورا کی ہوئی پیاز، نمک، چینی اور سرکہ شامل کرکے دو سے چار منٹ تک مزید بھون لیں۔ مزے دار بیف بالچاؤ تیار ہے۔

ایرانی چکن وود بٹر رائس

اشیاء:۔

چکن میری نیشن کے لیے:۔

چکن	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن	ایک عدد
نمک	حسب: ذائقہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسی دار چینی	ایک چائے کا چمچہ
زعفران ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
مایونیز	دو کھانے کے چمچے
سرکہ یا لیموں کا رس	تین کھانے کے چمچے

چاول کے لیے:۔

چاول	ایک کپ
مکھن	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

سبزیوں کے لیے:۔

مکھن	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
آلو	ایک عدد

ترکیب:۔

چکن کے لیے:۔ تمام میری نیشن اجزاء کو چکن کے ساتھ ملا کر تیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر چکن کو اسٹکس پر لگا کر باربی کیو یا پین میں تھوڑے سے تیل میں فرائی کرلیں۔

چاول کے لیے:۔ مکھن کو گرم کر کے نمک، کالی مرچ ڈال دیں اور دم پر لگا دیں۔

سبزیوں کے لیے:۔ مکھن گرم کر کے تمام سبزیوں کو نمک اور کالی مرچ کے ساتھ سوتے کرلیں، یہاں تک کہ سبزیاں نرم ہوجائیں۔

سرونگ کے لیے:۔ چکن، چاول اور سبزیوں کو پلیٹ میں نکال کر سرو کریں۔

ملائی کوفتہ ہانڈی

اجزاء:۔

گائے کا قیمہ	آدھا کلو
چنے	دو کھانے کے چمچے
چھوٹی الائچی	چار عدد
خشخاش	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ	چار عدد
لونگ	چار عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ڈبل روٹی کے سلائس	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
فریش کریم	آدھا پیکٹ
تیل	حسب ضرورت
پیاز	تین عدد
دہی	ایک پیالی
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی

ترکیب:۔

پہلے چنے، چھوٹی الائچی، خشخاش، ثابت کالی مرچ، لونگ اور سفید زیرہ ملا کر باریک پیس لیں۔ اب ڈبل روٹی کے سلائس توڑ کر قیمے میں ملائیں۔ ساتھ میں پسا ہوا مسالا ڈال کر چوپر میں پیس لیں۔ پھر اس میں تھوڑا سا نمک ملا لیں۔ اب دو کھانے کے چمچے فریش کریم شامل کر کے چھوٹے چھوٹے کوفتے بنالیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے کوفتے فرائی کریں اور ایک طرف رکھ دیں۔ اب ہانڈی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کر کے نکالیں اور ٹشو پر پھیلا کر خستہ کرلیں۔ پھر پیاز کو ہاتھ سے کچل کر دہی میں ملائیں۔ اس کے بعد لال مرچ، ہلدی، پسا دھنیا، گرم مسالا اور نمک ملا کر ہانڈی میں ڈال دیں۔ اب اسے ہلکا سا بھون کر کوفتے پھیلا کر ڈالیں۔ ساتھ ہی گرم پانی شامل کر کے ہانڈی کو ہلاتے رہیں۔ اس کے بعد باقی بچی ہوئی فریش کریم، پودینہ، ہری مرچ، ہرا دھنیا ڈال کر پانچ منٹ دم پر رکھیں، مزے دار ہانڈی ملائی کوفتہ تیار ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناول
بساطِ دل
اشاں آفریدی
بھی عجیب شے ہے
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

عدسان

نفسیاتی بیماریوں کی گرفت میں

نفسیاتی بیماریوں کے جتنے مریضوں سے میرا واسطہ پڑا، ان میں سے اکثر مریض نہ تھے۔ بس انہیں اصل بیماری یا اصل تکلیف کا علم نہ تھا اور نتیجے کے طور پر انہوں نے خود کو نفسیاتی مریض سمجھنا شروع کر دیا۔ مثلاً ایک لڑکی تین سال سے ذہنی مریضہ تھی۔ وہ بے حد کمزور تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے اور وہ ڈر اور خوف کا شکار تھی۔ ماں باپ نے اس کا علاج کروایا۔ مہنگے سے مہنگے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن آرام نہ آیا۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ دن بھر میں کیا کھاتی ہے تو اس نے کہا کہ کچھ کھایا ہی نہیں جاتا، صرف دوائیاں کھاتی ہوں۔ مزید معلومات کرنے پر پتا چلا کہ اس نے پچھلے تین دن میں دو ٹوسٹ اور تین چار کپ چائے کے علاوہ کچھ نہیں لیا۔

اصل میں لڑکی ذہنی مریضہ نہ تھی بس کسی وجہ سے بھوک لگنی بند ہوگئی۔ اس نے کھانا کم کر دیا یا کئی کئی دنوں تک کچھ نہ کھایا، نتیجے کے طور پر کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ جب کمزوری نے گھیرا تو ذہنی مریضہ بن گئی۔

سب سے پہلے اس کی دوائیاں بند کروائی گئیں اور خوراک ٹھیک کروائی گئی۔ خوراک ٹھیک ہوئی تو اس کی کمزوری دور ہوگئی۔ کمزوری دور ہوئی تو اسے اپنے جسم میں نقاہت کی کمی کا احساس ہوا اور اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ تندرست ہو رہی ہے۔ جسم میں اور طاقت آئی تو وہ ذہنی طور پر بھی ٹھیک ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اگر آپ اپنی زندگی کامیاب گزارنا چاہتے ہیں تو جب صبح سو کر اٹھیں تو اپنے آپ سے کہیں کہ آپ اس دن کو کامیاب بنائیں گے۔

ایک فلسفی کا قول ہے۔

''صبح کو کمانڈ کرو، اس لیے کہ صبح دن کو کمانڈ کرتی ہے۔''

اگر آپ آدھا گھنٹہ کم سوئیں تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ اگر آپ اطمینان سے ناشتا کریں گے تو آپ کا ہاضمہ خراب نہیں ہوگا۔ اگر آپ وقت مقررہ پر کام پر پہنچ جائیں گے تو آپ کو غیر ضروری عجلت نہیں ہوگی اور اپنے کام کو تسلی بخش طریقے سے کر سکیں گے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات صبح کا موڈ ہے یعنی وہ ذہنی اور جذباتی رویہ جس سے آپ دن کا آغاز کرتے ہیں۔

آپ کن خیالات احساسات کے ساتھ دن کا آغاز کرتے ہیں۔

کیا آپ کے مزاج کا پارہ کم ہے، مناسب ہے یا کافی چڑھا ہوا ہے؟

کیا آپ کی مزاجی کیفیت درست نہیں؟

کیا آپ بدمزاج، اداس، کم سخن ہیں؟

کیا آپ اس بات سے ناخوش ہیں کہ اگلے روز بھی آپ کو کام کرنا پڑے گا؟

غیر ضروری ہیجان بہت سی غیر ضروری تھکن کا باعث ہوتا ہے۔

بہت سے سادہ اور آسان طریقے ہیں جن کے ذریعے ہم ہیجان سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک کرسی پر بیٹھ جائیں اور زور زور سے سانس لیں اور ہر مرتبہ سانس کے زور کو کم کرتے جائیں اس سے دل کو تقویت حاصل ہوگی۔ ماکرسی پر بیٹھ کر اپنے اعضاء کو آہستہ آہستہ حرکت دیں۔

اگر ہم کوشش نہیں کریں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے۔
جس کسی نے شک اور خوف پر فتح حاصل کرلی اس نے ناکامی پر فتح حاصل کرلی۔

ص۔م.....پتوکی

س: میرا مسئلہ ذرا عجیب نوعیت کا ہے۔ جب سے میرے بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ میری اپنی بھابھی سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ اس کے کمرے میں ہی رہتی ہوں اور اسی کے ساتھ کھاتی، سوتی، اٹھتی اور بیٹھتی ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی بہت زیادہ عادت ہوگئی ہے۔

میرے بھائی کا کام دوسرے شہر میں ہے، اس لیے وہ جلدی نہیں آتے اور بھابھی کو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بھائی کے دو بچے ہیں لیکن بھابھی ان سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہیں۔ شروع شروع میں جب بھی میرے بھائی کا آنا ہوتا، میں آرام سے دوسرے کمرے میں سو جاتی تھی۔ لیکن اب مجھے پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، جب بھی دونوں کو ساتھ دیکھتی ہوں، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرے باقاعدہ سینے میں درد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر میرا دل کرتا ہے کہ میں یہ دنیا ہی برباد کردوں۔ پلیز میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے جلدی کوئی بھی بڑا مسئلہ ہونے سے پہلے ہی اس کا حل بتادیں۔ میں نماز پڑھ کے اللہ سے دعا بھی کرتی ہوں کہ مجھے شیطان بننے سے روک لے۔ کیوں کہ میاں بیوی میں پھوٹ ڈالنے والے کو شیطان کہا جاتا ہے۔

ج: اچھی بہن! بھابھی سے لگاؤ اور انسیت کوئی بری بات نہیں لیکن کسی بھی چیز کا حد سے بڑھ جانا بری بات ہے۔ آگے چل کر آپ کے یہ جذبات کوئی خطرناک رخ بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ آپ کو اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس ہے۔ آپ خود سمجھ رہی ہیں کہ جو کچھ آپ سوچتی ہیں، جو آپ کے بھابھی کے لیے جذبات ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی سے بھی جذباتی طور پر اتنا لگاؤ درست نہیں ہوتا۔ آپ کے اس رویے سے بھابھی آپ سے بیزار بھی ہوسکتی ہیں۔

آپ نے اپنی عمر کے بارے میں نہیں لکھا، لیکن خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نوعمر ہیں۔ جلد یا بدیر آپ کی شادی ہوجائے گی اور نئی زندگی کے مسائل اور رنگینیوں میں الجھ کر آپ کے جذبات نارمل ہوجائیں گے۔

فی الحال آپ کو یہ کرنا ہے کہ اپنے آپ کو کسی مشغلے میں، کسی کام میں مصروف رکھیں۔ اگر پڑھ رہی ہیں تو اپنی پڑھائی پہ توجہ دیں۔ بھابھی کے کمرے میں جائیں لیکن کچھ دیر کے لیے، رات کو اپنے کمرے میں سوئیں۔ بھابھی اور بھائی کی اپنی زندگی ہے۔ آپ کی مداخلت نہ صرف ان کی زندگی برباد کردے گی بلکہ آپ خود بھی خوش نہیں رہ پائیں گی۔

شرمین علی.....راولپنڈی

س: میری عمر بائیس سال ہے۔ ایم اے فائنل ایر کی طالبہ ہوں۔ ہمارا گھرانہ قدامت پسند نہیں ہے لیکن بہت روشن خیال بھی نہیں ہے۔ امی نے ہم سب کی اس طرح تربیت کی ہے کہ ہمیں ہر اچھی بری بات دلیل سے سمجھائی ہے۔ خصوصاً یہ کہ ایک مسلمان لڑکی کو کن حدود کا خیال رکھنا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ باوجود مخلوط تعلیم کے میں نے کبھی کسی لڑکے سے دوستی نہیں کی۔ کچھ لڑکے میری طرف بڑھے بھی لیکن میں نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ پڑھائی سے متعلق کوئی ضروری بات ہو تو بے شک کرلیتی ہوں۔

سال بھر پہلے ابا اور امی نے پھوپھی کے بیٹے سے میرا رشتہ طے کردیا۔ انہوں نے میری رضامندی بھی لی تھی۔ میرے ذہن میں کوئی اور نہیں تھا۔ اس لیے میں نے معاملہ ان پہ چھوڑ دیا۔ سچ یہ ہے کہ پھوپھی کے بیٹے میں کوئی خرابی بھی نہیں تھی، تعلیم یافتہ تھے۔ جاب بھی اچھی تھی۔

منگنی کے بعد ان کا رویہ بالکل بدل گیا۔ وہ جو پہلے بہت سنجیدہ نظر آتے تھے۔ اب رات گئے مجھے فون کرتے اور اصرار

کرتے کہ میں دیر تک ان سے باتیں کروں۔ ان کی باتیں کافی کھلی ہوتی تھیں جو مجھے سخت ناگوار گزرتیں۔ شروع میں تو میں ہوں، ہاں کرتی رہی پھر پڑھائی کا بہانا بنا کر فون بند کر دیتی۔ کسی دن فون آف ہی رکھتی۔ بہت جلد انہوں نے میری بے رخی محسوس کر لی اور ناراضی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا ''اگر تم مجھے پسند نہیں کرتیں تو میں اس رشتے کو توڑ دیتا ہوں۔ صرف منگنی ہی تو ہے۔ ساری عمر کے رونے سے ابھی رشتہ ختم کر دینا بہتر ہے۔'' میں ڈر گئی، میں نے ان سے کہا ''بہتر یہ ہے کہ ہماری شادی جلد ہو جائے۔ میں امتحان شادی کے بعد بھی دے سکتی ہوں۔'' شادی کی بات پر وہ بدک گئے، کہنے لگے یہ بات امی ابو نے آپ لوگوں کو پہلے ہی بتا دی تھی۔ دراصل ان کی ایک بڑی بہن ہیں جن کا رشتہ ابھی طے نہیں ہوا۔ پھوپھو نے جب ہمارے گھر رشتہ کیا تب ہی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے ساتھ ہماری شادی کریں گی۔

میں خاموش ہو گئی۔ اب وہ اصرار کر رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ لنچ پر جاؤں۔ وہ مجھے یونیورسٹی سے پک کر لیں گے۔ مجھے یہ ٹھیک نہیں لگتا۔

میں نے امی کو بتایا تو وہ بے بسی سے مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ وہ بھی اس طرح ملنے اور گھومنے کو ناپسند کرتی ہیں لیکن رشتہ ٹوٹنے سے ڈرتی بھی ہیں۔ آپ مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ سچ یہ ہے کہ ان کی باتوں کو ناپسند کرنے کے باوجود میں بھی یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتی۔

ج: آپ کے منگیتر کا رویہ غلط ہے لیکن موجودہ دور کو دیکھتے ہوئے عجیب یا غیر معمولی نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں اور گھومنا پھرنا اب عام بات ہو گئی ہے۔ میڈیا، انٹرنیٹ بھی لوگوں کی سوچ پر اثر انداز ہوا ہے۔ معاشرے کی پرانی قدریں تیزی سے ختم ہو رہی ہیں۔ آپ کوئی درمیانی راہ نکالیں۔ اپنی امی سے کہیں کہ وہ پھوپھو سے شادی کی بات کریں۔ اگر ممکن ہو تو جلد شادی کر لیں۔ وہ باہر ملنے کا کہیں تو آپ ان سے کہیں کہ اس کے لیے وہ آپ کے ابو سے اجازت لیں پھر ہی آپ جا سکتی ہیں۔

درحقیقت منگنی کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے۔ اس رشتہ میں ان تمام حدود کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے جو ایک نامحرم کے ساتھ رکھی جاتی ہیں۔

زرینہ بانو.....لاہور

س: عدنان بھائی! ہو سکتا ہے آپ کو میرا مسئلہ بے وقوفی لگے لیکن یقین کریں، اس مسئلہ نے میرا سکون غارت کر دیا ہے۔ میرا سکھ چین چھین لیا ہے اور میں بھٹکتی ہوں کہ یہ صرف میرا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجھ جیسی بہت سی ماؤں کا مسئلہ ہے۔

میری تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹا کوئی نہیں ہے۔ بڑی بیٹی نے ابھی بی ایس سی کر کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے جبکہ دونوں چھوٹی بیٹیاں بالترتیب بی اے اور انٹر میں ہیں۔

میری بیٹیاں بہت سادہ اور معصوم ہیں۔ ان میں آج کل کی لڑکیوں جیسی تیزی اور طراری نہیں ہے۔ میک اپ، فیشن سے دور تینوں حجاب لیتی ہیں۔ لیکن تینوں کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی خوب صورتی سے نوازا ہے۔ جب سے موٹروے والا واقعہ ہوا ہے۔ میں عجیب سی وحشت اور بے چینی کا شکار ہو گئی ہوں۔ جب تک بچیاں گھر نہیں آ جاتیں۔ میں بے چین سی پھرتی رہتی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ دل پہ عجیب سی گھبراہٹ طاری رہتی ہے۔ پلیز مجھے اس کا کوئی حل بتائیے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں خوف سے پاگل ہو جاؤں گی۔

☆ عزیز بہن! آپ کی پریشانی بجا ہے۔ دراصل انصاف کی عدم فراہمی نے ہمارے معاشرتی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ مجرم پکڑے بھی جائیں تو بااثر لوگ آسانی سے چھوٹ جاتے ہیں۔ مجرم اور ظالم اتنے بااثر ہو چکے ہیں کہ لوگ مظلوم کی مدد کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

آپ اس وقت جس خوف اور پریشانی کا شکار ہیں۔ اس سے آپ کے ذہن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی سکون آور دوائی لے لیں۔ اس سے آپ کا ذہن پرسکون ہو جائے گا۔

☆☆

اگہی

خوبصورت بدن

موٹاپا، وزن زیادہ ہونا اس دور کا بڑا مسئلہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے صحت کے بھی بہت سے مسائل پیدا کردیے ہیں۔ شوگر، بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کا ایک بڑا سبب وزن میں زیادتی بھی ہے۔

لیکن وزن کم کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ڈائٹنگ سے نہ صرف کمزوری محسوس ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اس سے چہرہ بھی بے رونق ہوجاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے بہت عرصہ تک ڈائٹنگ کی بھی نہیں جاسکتی۔

ہماری ایک قاری بہن ناظمہ زیدی نے اپنا ڈائٹ پلان ہم سے شیئر کیا ہے جو بہت سادہ اور آسان ہے۔ اور بغیر کسی سخت ڈائٹنگ اور سخت ورزش کے بہنیں آسانی سے اس ڈائٹ پلان پر عمل کریں اور ہمیں بتائیں کہ ایک ماہ میں آپ کا وزن کتنا کم ہوا۔

ڈائٹ پلان

بہت سی بہنوں کو پریشان دیکھا تو سوچا اپنا پرسنل ڈائٹ پلان شیئر کردوں۔ بہت ہی سادہ ہے۔

پیاری بہنو! اگر آپ وزن کم کرنا چاہتی ہیں تو یہ بات ذہن سے بالکل نکال دیں کہ کسی شارٹ کٹ سے یا جادو کی چھڑی گھمائی اور پتلی ہوگئیں۔ یا گولی کھائی اور صبح سب نے کہا، واؤ اتنا وزن کم۔ تو ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔

یہ ڈائٹ پلان بچیاں، مائیں سب کرسکتی ہیں۔

آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں کہ میرے ڈائٹ پلان میں آپ سب کچھ کھاسکتی ہیں (مطلب جو بھی گھر میں پکتا ہو)۔

دیکھیں جی، سیدھی اور صاف بات تو یہ ہے کہ خواتین اپنے لیے علیحدہ سے کچھ نہیں بناسکتیں۔ ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ گھر، بچے، شوہر اور ان سے جڑے کام۔ خیر مدعے پہ آتے ہیں۔

تو سب سے پہلے یہ کہ اپنی روزمرہ روٹین میں سے تلے ہوئے کھانے، چپس، پکوڑے، چکن پیس، تکہ، کوک وغیرہ کو نکال دیں۔ بھلے آپ کو ڈسٹ بن میں ڈالنے پڑیں (بہت سی مائیں صرف اس لیے بچوں کی پلیٹ صاف کردیتی ہیں کہ ہم نے نہ کھایا تو ضائع ہوگا)۔

چائے میں چینی کی مقدار کم کردیں۔ (اس سے زیادہ تکلیف میں آپ کو نہیں دوں گی)۔ بہت سی میٹھی اشیاء بہت زیادہ مقدار میں استعمال نہ کریں۔

واک کریں۔ جی یہ ہے میرا سیکرٹ ہتھیار۔ واک، واک اور صرف واک۔ اب یہ آپ پہ منحصر ہے کہ آپ کا جسم کتنی واک برداشت کرسکتا ہے۔

پانچ منٹ سے شروع کریں اور بڑھاتے ہوئے بیس منٹ تک لے آئیں۔ یعنی پہلا ہفتہ پانچ

پھر سات، پھر دس منٹ۔ ہر انسان کا جسم اور برداشت کا مادہ مختلف ہوتا ہے مگر بیس منٹ کی واک (کم سے کم) ضروری ہے۔ اس سے زیادہ کریں گی تو اور بہتر ہے۔

کوشش کریں کہ گھر کے کام خود کریں۔ چلنے پھرنے اور بھاگنے والے، بیٹھ کے کرنے والے کام ماسی سے کروالیں۔ جیسے برتن کپڑے وغیرہ۔ اس سے بھی مدد ملے گی اور وزن جلدی کم ہوگا۔

اور ہاں، اگر وزن کے ساتھ آپ دیگر بیماریوں کا علاج بھی چاہتی ہیں تو ٹھنڈا پانی (فریج کا) بند کردیں، تھوڑا مشکل ہے۔ روم ٹمپریچر پہ رکھا پانی پئیں۔ اگر شروع میں مشکل لگے تو تھوڑا مکس کرلیں مگر پھر آہستہ آہستہ جسم کو نارمل کی طرف لائیں۔

اللہ پاک نے انسانی جسم میں بہت لچک رکھی ہے۔ آپ آہستہ آہستہ جس روٹین پہ اپنے جسم کو سیٹ کریں گی، ہوجائے گا۔ اپنے لیے وقت نکالیے۔ یہ واک کے بیس منٹ آپ کے اور اللہ کے درمیان اپنے سیکریٹس شیئر کرنے، ذکر کریں، درود پڑھیں۔ ورنہ بیس سال بعد بیماریوں کی پوٹ اور گوشت کا پہاڑ بننے کا انتظار۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

ہلکا پھلکا کم وزن انسان، خود کو بھی اچھا لگتا ہے اور دوسروں کو بھی، اس ڈائٹ پلان کا دورانیہ قدرے طویل ہے مگر وہی بات ناں کہ راتوں رات کچھ نہیں ہوجاتا۔ میرا وزن بچی کی پیدائش کے بعد 78 کلو تھا مگر اب ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ پر اس میں ایک سال لگ گیا لیکن میری بہنو! اگر آہستہ آہستہ وزن کم کروگی تو واپس نہیں آئے گا اور کوئی کمزوری ہوگی نہ بیماری۔

باقی آپ سب کچھ کھائیں، میری طرف سے کھلی چھٹی ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار باہر کی عیاشی بھی کرلیں۔ یہ پلان شروع کرنے سے پہلے اپنا وزن کریں اور ہر چھ ماہ بعد ریکارڈ کریں۔ تبدیلی اپنے اندر لائیں، باہر بھی جلد ہی سب کو نظر آئے گی، ان شاء اللہ۔

عصر کا وقت، صبح کا اور عشاء کے بعد کا وقت واک کے لیے موزوں ہے (مطلب دس منٹ صبح کرلی، پانچ منٹ دوپہر اور پانچ شام)۔

واک تیز قدموں سے کرنی ہے۔ چہل قدمی نہیں اور واک کے دوران سونف چباتی رہیں تو سونے پہ سہاگہ۔ نظام انہضام بہتر ہوگا۔ گیس بھی نہیں ہوگی۔ عمل کریں اور ضرور بتائیں، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆☆

Pakistani Point
www.pakistanipoint.com